فہرست

اداریہ 1

اسلام نام ہی حقوق کی ادائیگی کا ہے : 10

حکمرانوں کا پورا سلسلہ: 11

جیتے جی جنت کا نمونہ بنانے کا نسخہ: 12

عنوان کا خلاصہ: 14

بے توجہی اور غفلت سے منع کیا گیا: 15

مصلحت اور حاجت کا فرق: 16

ایک مثال : 17

موت کی گھڑی میں رعایا کی اصلاح کی فکر: 17

جامع آیت: 18

آیت کا اثر پوری قوم پر: 19

...میرا ایمان پختہ ہو گیا: 20

عدل: 21

احسان : 21

اِیْتَآءِ ذِی الْقُرْبٰی: 22

فحش ،منکر،سرکشی: 22

ہرایک ذمہ دارہے: 23

ماتحتوں کے بدخواہ کی سزا: 26

جن کے رتبے ہیں سوا...: 27

جیسابرتاؤ؛ ویسی دعا: 28

خردکانام جنوں رکھ دیا...: 29

حاکموں سے کئے ہوئے عہدکوپوراکرو: 30

جہاں کہیں فتنے رونماہوتے ہیں : 31

آج کل کی سب سے بڑی گڑبڑ: 32

وہاں دیرتوہے،اندھیرنہیں : 33

بدترین ذمہ دار کی نشانی:.. 34

ایسے حاکم کی طرف اللہ تعالیٰ توجہ نہیں فرمائیں گے:........................ 35

الوالی العادل.. 37

باب کا عنوان: 38

دشمنوں کے معاملہ میں بھی انصاف :.. 39

سایہ دارسات گروہ...پہلا گروہ: 39

دوسرا گروہ:.. 42

تیسرا گروہ:.. 42

چوتھا گروہ:.. 43

پانچواں گروہ:.. 43

چھٹا گروہ:.. 44

ساتواں گروہ:.. 45

نور کے منبروں پرہوں گے: 46

بہترین اور بدترین حکمرانوں کی علامت: 47
نظامِ سلطنت کے بقاء کی اہمیت :.. 49
تین جنتی:.. 50
وُجُوبُ طَاعَةِ وُلَاةِ الْأُمُوْرِ فِيْ غَيْرِ مَعْصِيَةٍ وَتَحْرِيْمُ طَاعَتِهِمْ فِي الْمَعْصِيَةِ.............................. 52
حاکم کے حکم دینے کی وجہ سے جائز کام واجب ہوجاتا ہے:.............................. 53
ماں باپ کے لیے اہم نصیحت: 53
سربراہ کی بات ماننے کے حدود: 54
نافرمانی میں فرمانبرداری نہیں :.. 55
مؤمن کے اللہ تعالیٰ سے تعلق کی مثال: 56
پریشان ہونے کی ضرورت نہیں :.. 57
ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ...:.. 58
...جاہلیت کی موت مرے گا:.. 59
ہر حکمران کی بات سنو اور مانو؛ چاہے ...: 60

ہر حال میں مانو:.. 62

...تو پھر تم میں اور اجنبی میں فرق ہی کیا؟:........................... 63

وُجُوبُ طَاعَةِ وُلَاةِ الْاُمُوْرِ فِیْ غَیْرِ مَعْصِیَةٍ وَ تَحْرِیْمُ طَاعَتِهِمْ فِی الْمَعْصِیَةِ.................. 65

بنیادی اصول:.. 66

اُمتِ محمدیہ کی فتنوں سے سلامتی: 67

فتنہ کسے کہتے ہیں ؟: 71

"فتنہ" کی تشریح بہ زبانِ نبی : 73

امیر کی اطاعت ضروری ہے :.. 73

اُن کا بوجھ اُن پر؛ تمہارا تم پر: 74

شریعت کا اصول:.. 76

اصل علاج یہ نہیں :.. 79

شفا بخش علاج :.. 80

خلاصۂ علاج:.. 81

یہ سودے بازی نہیں ہے: 82
ایسے زمانہ میں کیا کرے؟: 83
وُجُوبُ طَاعَةِ وُلَاةِ الْاُمُوْرِ فِيْ غَيْرِ مَعْصِيَةٍ وَتَحْرِيْمُ طَاعَتِهِمْ فِي الْمَعْصِيَةِ 86
جس نے امیر کی اطاعت کی......: 87
ایک اہم اصول: 90
جاہلیت کی موت: 90
جس نے حاکم کی توہین کی: 92
اَلنَّهْيُ عَنْ سُؤَالِ الْاِمَارَةِ 94
وَاِخْتِيَارُ تَرْكِ الْوَلَايَاتِ اِذَا لَمْ يَتَعَيَّنْ عَلَيْهِ 94
اسلامی اصول: 95
باصلاحیت آدمی کے لیے دو راستے ہیں: 96
اسلام اس نظریہ کا قائل ہی نہیں: 97
آخرت کا گھر کس کے لیے؟: 98

اگر مدد چاہتے ہو تو عہدہ مت مانگو: 99

عمدہ مثال:... 100

بہتر کام کو انجام دینے کے لیے قسم توڑنا: 101

کسی دو آدمیوں کے اوپر بھی امیر مت بننا:.................................. 102

امارت سببِ ندامت: 103

حَثُّ السُّلْطَانِ وَالْقَاضِیْ وَغَیْرِھِمَا مِنْ وُلَاۃِ الْاُمُوْرِ 106

عَلٰی اِتِّخَاذِ وَزِیْرٍصَالِحٍ وَتَحْذِیْرِھِمْ مِنْ قُرَنَاءِ السُّوْءِ 106

صالح آدمی کو مشیر بناؤ: 107

دنیا کی دوستیاں قیامت کی دشمنیاں : 107

قاعدۂ کلیہ: 108

مصاحبین سے بدگمانیاں مت کرو: 110

اللہ تعالیٰ صاحبِ اختیار کے ساتھ جب بھلائی کا ارادہ فرماتے ہیں : 111

النھی عن تولیۃ الامارۃ والقضاء وغیرھا من الولایات لمن سألھا................................ 113

أوحرص علیھافعرّض بھا 113

جوکوئی عہدہ مانگے یااس کی لالچ رکھے اس کوعہدہ نہیں دیتے: 114

حیاء اور شرم کسے کہتے ہیں؟:.. 117

شرم توایمان کاحصہ ہے: 118

ایمان کی ایک شاخ: 120

حقیقی حیاء اور شرم:.. 121

بےحیائی کی منظّم سازش:.. 123

حضوراکرم (ﷺ) کی شرم وحیاء 125

باب حفظ السر.. 127

رازداری کے اصول:.. 128

صریح راز: 129

رازکاانداز: 129

یہ بھی راز ہے:.. 130

حضور (ﷺ) کے رازدار کی رازداری:.. 131

رازامانت ہوتے ہیں :.. 134

عہد کے بارے میں سوال ہو گا:.. 134

اللہ تعالیٰ کی نگاہوں میں بدترین شخص: 135

رازداری کاایک واقعہ: 136

نکاح کا پیغام لڑکے والے بھیجیں یا لڑکی والے؟:.......................... 139

فوائدِ حدیث :.. 141

حضور (ﷺ) کے مرض الوفات کاواقعہ: 142

بعض بھید ہمیشہ کے لیے بھید ہوتے ہیں : 146

الوفاء بالعهد وَاِنجاز الوَعد.. 149

عہد و پیمان کو پورا کرنے کا اہتمام : 150

کامیاب اہلِ ایمان کی نشانیوں میں سے یہ ہے:............................... 151

قرآنی ایک اصول: 152

زندگی کے معاملات عہد وپیمان ہیں : 152

یہ بڑی خطرناک چیز ہے:.. 154

معاشرہ میں ہونے والی کوتاہیاں :.. 155

منافق کی نشانی اور ہمارا معاشرہ:.. 156

باطن کچھ ،اور ظاہر کچھ : 159

منافق کی چار علامتیں :.. 160

وعدہ پورا کرنے کا عجیب وغریب واقعہ: 160

عہد پورا کرنے کا بے مثال نمونہ:.. 163

آج کے حالات کا موازنہ: 166

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے انصاف کی ایک جھلک:.. 166

آج ضرورت ہے اس بات کی...:.. 168

وعدہ پورا کرنے کا ایک اور نمونہ: 169

یہ عملی عہدوپیمان ہے:.. 171

الامر فی المحافظۃ علیٰ ما اعتادہ من الخیر 173

معمولات کی پابندی کیجئے: 174

اللہ تعالیٰ نے بھی ان کو معمول چھوڑنے نہیں دیا:.. 175

اس سے نقصان پہنچتا ہے:.. 177

معمولات کا ایک ادب یہ بھی ہے: 177

اس آیت کے ساتھ ایک ظلم ہوا:.. 178

اس آیت کا صحیح مطلب: 179

نعمتوں کے سلسلے اس وقت تک بند نہیں ہوتے: 180

حضرت مولانا سعید احمد خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک سوال: 181

تم اس پگلی بوڑھیا کی طرح نہ بنو: 182

معمولات چھوڑنے سے دل میں سختی پیدا ہوتی ہے: 183

رہبانیت کیسے شروع ہوئی:.. 184

اسلام میں رہبانیت نہیں ہے: 185

دینداروں کے لیے بھی یہی وقت آزمائش کا ہوتا ہے: 186

اے عبداللہ! فلاں جیسے مت بنیو: 187

مداومت کا نتیجہ: 189

ساری خرابی یہیں سے آتی ہے: 190

ذکر میں دل نہیں لگتا، پریشان کیوں ہوتے ہو؟: 191

خلاصۂ باب: 191

استحباب طیب الکلام وطلاقۃ الوَجہ عند اللقاء 193

ہر کس وناکس کو مسخر کرنے والا نسخہ: 194

یہ آپ (ﷺ) کا طریقہ ہے: 195

آدمی کے لئے بڑی بری چیز ہے: 196

میں اپنے اخلاق کیوں خراب کروں !: 197

یہ ہمارا مزاج ہے: 199

وہ اخلاق کس کام کے!: 200

اپنے بازوؤں کو جھکائے رکھنا:.. 201

اگر آپ بدخُلق اور سخت دل ہوتے :.. 202

کم از کم اسی کی عادت ڈال لی جائے:.. 203

اس پر بھی صدقہ کا ثواب:.. 204

ہنستے چہرے سے ملاقات بھی نیکی ہے:.. 204

استحباب بیان الکلام 207

وایضاحہ للمخاطب.. 207

وتکریرہ لیفھم اِذا لَم یُفھم اِلا بذلک 207

گفتگو کے آداب:.. 208

کلام کا ایک ادب:.. 209

آپ (ﷺ) کا کلام بھی ایسا ہی ہوتا تھا:.. 210

مجلس کے آداب:.. 213

لوگوں کو خاموش کردو:.. 214

باب الوعظ والاقتصادفیہ 216
شریعت کی ایک اہم تعلیم: 217
حکمتِ تربیت یہی ہے: 218
فقاہت کی علامت: 220
وعظِ مختصر، مگر پُراثر: 221
کاہن نہیں تو عامل!: 224
غلط عقیدہ: 224
اگر ایسا کھٹکا پیدا ہوگیا: 225
باب الوقار والسکینۃ 227
زندگی کا اہم ادب: 228
ہر معاملہ میں تواضع : 229
رحمٰن کے بندوں کی صفت: 230
وقار کا ایک پہلو یہ بھی ہے: 232

الندب الٰی اتیان الصلاۃ والعلم ونحوھما من العبادات بالسکینۃ والوقار 234

وقار کو چھوڑنے کی اجازت نہیں : 235

تقویٰ کی علامت: 235

دوڑنا؛وقاراور سنجیدگی کے خلاف ہے:.. 236

حاصل شدہ کے لیے بھاگنالاحاصل:.. 237

جلدبازی نیکی نہیں ہے: 238

باب اکرام الضیف... 240

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا عمل:.. 241

تب مجوسی ایمان لے آیا: 242

آیت سے مستفاداحکام:... 243

حضرت لوط علیہ السلام کامہمانوں کااکرام: 244

مہمان نوازی ؛ایمان کاتقاضہ: 245

مہمان اورمیزبان کے لیے ہدایات: 247

اِستحباب التبشیر والتھنئۃ بالخیر.. 250

مبارک باددینا پسندیدہ ہے: 251

اگراس پر عمل ہوجائے!:.. 251

اسلامی معاشرے کوباہم جوڑنے والی:.. 252

ہمارے آداب اہلِ یوروپ نے اپنالئے:.. 253

اپنابنانے کاگُر:.. 254

قرآنی دلائل: 254

ایک موتی کے مکان کی خوشخبری:.. 257

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہاکے مناقب: 259

حضورِاکرم (ﷺ) نے جنت کی بشارتیں سنائیں :.. 260

میرے پہلے سفرحج کاواقعہ :.. 265

یقین سے کلمہ پڑھنے پرجنت کی بشارت:.. 267

مختصرآپ بیتی ازحضرت عمروبن عاص رضی اللہ عنہ : 270

باب وداع الصاحب ووصیتہ عند فراقہ للسفر وغیرہ 275

والدعاء لَہٗ وطلب الدعاء مِنہُ 275

جدائی کے موقع کے چار آداب:.. 276

دو پیغمبروں کی اپنے بیٹوں کو وصیت:.. 277

بیانِ واقعہ کانرالا انداز:.. 279

خاندانِ نبوت:.. 281

فکر کیا کرے؟: 282

آج کے دَور کی تصویر کشی: 283

نبی کریم (ﷺ) کی وصیت: 286

مناسب ِحال معاملہ اور نصیحت: 287

اپنی دعاؤں میں ہمیں مت بھولیو: 290

کسی کو رخصت کرتے وقت کی دعائیں : 291

الاستخارۃ والمشاورۃ.. 294

مشورہ کی اہمیت: 295

حضورِ اکرم (صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم) کبھی اپنی رائے چھوڑ دیتے تھے: 296

غزوۂ اُحد کے مشورہ کا منظر:.. 296

غزوۂ بدر کا مختصر خاکہ : 297

افسوس کا تدارک:.. 298

غزوۂ اُحد کا مشورہ: 299

اس کو مشورہ کہتے ہیں : 302

اس کا نام مشورہ نہیں : 303

مشورہ کے بعد کیا ہوا فیصلہ نہ بدلے: 303

عورتوں سے مشورہ:.. 304

آمدم بر سرِ مطلب:.. 306

صدیق کی رائے صادق:.. 307

استخارہ کی تعلیم اور اس کی اہمیت: 309

اہتمامِ استخارہ کی وجہ: 311

کہانت:.. 311

زَجر: 312

تَطَیُّراور طِیرہ:.................................. 313

اِسۡتِقۡسَام بِالۡاَزۡلَام:................................ 314

ایک غلط رواج:................................. 316

استخارہ کی لغوی تحقیق:.......................... 316

استخارہ کن کاموں میں کیاجائے؟:................ 317

مسنون استخارہ: 319

دعاکے آداب: 319

یہ سب حمدوثناءہی ہے: 320

دعائے استخارہ کی تشریح:........................ 320

جب جیب کٹی:.................................. 322

دعائے استخارہ کی روح:.. 322

دعاکا عجیب وغریب انداز:.. 324

استخارہ کے بعد پتہ کیسے چلے؟:.. 327

استخارہ کتنے دن ؟: 328

دوسرے سے استخارہ کرایاجاسکتاہے؟.. 328

اِستحباب الذھاب الٰی العید ا لخ 329

باب کاعنوان: 330

قیامت کی کچہری کے گواہ:.. 330

تطبیقِ آیات: 331

زمین وآسمان روتے ہیں : 333

زیادہ گواہ تیار کرلو: 334

عمل چھوٹا سا؛ فضیلت بڑی: 335

یہ اہتمام صرف عیدمیں نہیں : 335

آپ (ﷺ) کی ذات نمونہ ہے: 336
نبیٔ کریم (ﷺ) کاطرزِ عمل: 337
استحباب تقديم اليمين في كل مَاهومن باب التكريم 339
عنوان کی وضاحت: 340
حضورِاکرم (ﷺ) کی پسند: 343
حضورِاکرم (ﷺ) کا عمل: 344
یہی توکمالِ نبی ہے: 345
آج کل کی بدتہذیبی کی بڑی وجہ: 346
تربیت کاموئثرترین طریقہ: 347
شان کے خلاف نہیں: 348
آپ بیتی: 349
تربیت کااصل طریقہ: 350
عورتوں کی تعلیم وتربیت اور ہماری کوتاہیاں: 350

ان چیزوں کی طرف بھی توجہ ہو: 352

کتاب آداب الطعام 356

کھانے سے پہلے بسم اللہ اور کھانے کے بعد الحمدللہ پڑھنا 357

آدابِ زندگی: 357

کھانے سے پہلے بسم اللہ پڑھنے کا فائدہ: 358

کیا ہم نے کبھی سوچا؟: 360

ایک ہی نعمت میں کئی نعمتیں: 362

مضطر کو روزی پہنچانے کا سرکاری انتظام: 364

دوسروں کے نام سے کھلاتے ہیں: 365

چیونٹی کی روزی کا منظر: 366

روزی کا انتظام؛ ہمارے بس کی بات نہیں: 367

حضرت سلیمان علیہ السلام کی دعوت: 368

شروع میں نہیں تو جب یاد آئے: 370

حضرت فقیہ الامت رحمۃ اللہ علیہ کا معمول: 372

حضرت عارفی رحمۃ اللہ علیہ کا عمل: 373

مسنون دعائیں ؛حفاظت کا ذریعہ: 374

شیطانی اثرات کا توڑ:.. 376

خود ہی موقع دیں ؛ پھر پریشان ہوں !.. 379

شیطان کا ہاتھ میرے ہاتھ میں : 381

فوائد حدیث : 382

شروع میں نہیں ؛ تو اخیر میں سہی: 384

بسم اللہ کی برکت: 386

دسترخوان اُٹھانے کی دعا: 387

گناہوں کی معافی کی بشارت: 388

باب لا یعیب الطعام واستحباب مدحہ 390

کچھ بھی بے کار نہیں قدرت کے کارخانہ میں :.. 391

مکھی کی پیدائش کا ایک فائدہ:.. 392

بچھو کے ذریعہ جان بچائی: 394

پاخانہ کے کیڑے سے علاج !: 395

یہ کس مرض کی دوا ہے؟:.. 396

کھانے کی نعمت ،اور ہمارا طرز عمل: 397

نعمت کی قدردانی کا عجیب واقعہ: 398

جنوں کی خوراک کا نظام: 399

ایک گھونٹ پانی کی قدر:.. 400

عبرت انگیز واقعہ :.. 401

اکابر کی کڑھن: 403

پسند وناپسند کے معاملہ میں معتدل تعلیم: 404

سرکہ بہت اچھا سالن ہے:.. 405

سال بھر کا اناج بھر لینا توکل کے خلاف نہیں : 406

کھانے کی اور بنانے والے کی تعریف : 406

حضرت ڈاکٹر عارفی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ: 408

معترض کا حال مکھی جیسا: 408

اس کا احسان اور ہمارا بخل!: 410

بیوی کے مزاج سے واقفیت رکھنا سنت طریقہ ہے: 410

ہم اگر واقف نہیں تو بیوی کے مزاج سے!: 411

باب مَا یقولہ من حضر الطعام وھو صائم اِذَا لَمْ یفطر.. 413

دعوت قبول کرنا سنت ہے: 414

باب مَا یقولہ من دُعِيَ اِلَی طَعَامٍ فَتَبِعَهُ غیرہ.. 416

طفیلی کے احکام :.. 417

جہاں وہ برا ہے؛ وہاں یہ بھی برا ہے:.. 418

گم راہ طفیلی کا قصہ:.. 419

دعاء.. 420

باب الأكل مِمَّا يليه ووعظه وتأديبه من يسيء أكله 422

کھانے کے آداب کی نصیحت: 423

النّهي عن القِرَانِ بين تمرتين ونحوهما إِذَا أكل جماعة إِلاَّ بإِذن رفقته 425

ساتھ بیٹھ کر کھانے کے اہم آداب: 426

مہذب گیر تعلیم: 429

ترقی کا راز: 430

شرعی قانون پر عمل کا ایک کافر کو فائدہ: 432

معاملہ کتنا سنگین ہے: 433

معمولی سی غفلت سے حرام کا ارتکاب: 434

اہلِ یوروپ کے یہاں اصول کی پابندی: 435

علامہ انورشاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ ڈابھیل میں: 436

مشترک کاروبار کی بد نظمی: 437

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا عمل: 438

مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کاوصیت نامہ:............ 438

خلاصۂ روایت:............ 440

کھانے سے سیری نہیں ہوتی؛ کیا کرے؟............ 441

الگ الگ کھانے کی نحوست:............ 441

برتن کے ایک طرف سے کھانے کا حکم............ 443

کھانے کاایک اورادب:............ 443

برکت برتن کے بیچ میں اترتی ہے:............ 444

ٹیک لگاکر کھانے کاناپسندیدہ ہونا............ 446

کھانے کے لیے حضوراکرم (ﷺ) کی پسندیدہ بیٹھک:............ 446

بیٹھک کااصولی طریقہ:............ 449

علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق:............ 451

ٹیبل کرسی پر کھاناکیساہے؟:............ 452

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کاطرز:............ 452

کھانے کاایک ادب / تین انگلیوں سے کھانا:.. 453

چھوٹے چھوٹے لقمے لینا:.. 454

انگلیاں چاٹ لینا: 454

پرانا عیب؛ آج کا فیشن / لطیفہ:.. 455

فیشن کا حال !:... 456

آنکھوں دیکھاواقعہ: 457

یہ دل و دماغ میں نوٹ کرلو:... 458

ایک بزرگ کا عمل: 460

پلیٹ صاف کرنے والے ادب کی تفصیل:.................................. 460

ایک قصہ:.. 461

انگلیاں چاٹنااور چٹوانا:.. 463

حصولِ مقاصد کانام برکت ہے: 464

حصولِ اسباب اصل نہیں : 466

یہ بے برکتی نہیں تو اور کیا ہے؟:.. 468

اگر برکت حاصل کرنا چاہتے ہو تو...:.. 469

لقمہ گر جائے تو اُٹھالو:.. 469

حصولِ برکت کے لیے ان چیزوں کا اہتمام کرو:.. 471

''وُضُوءِ مِمَّا مَسَّتِ النَّار''کامسئلہ:.. 472

تكثير الأيدي عَلَى الطعام 474

دو کا کھانا تین کو، تین کا چار، چار کا آٹھ کو کافی ہو جائے گا:.. 474

ہم کسے مہمان سمجھتے ہیں ؟:.. 476

نہایت عبرت آموز واقعہ:.. 477

یہ بات تو دل میں بٹھا ہی لو:.. 478

خلاصۂ کلام:.. 479

باب آدب الشرب.. 480

پینے کے آداب:.. 481

نہیٔ ارشاد اور نہیٔ تحریم : 483

میٹھے پانی کا عجیب وغریب قدرتی نظام: 484

شکر گزار بندہ کی دعائیں : 486

برتن میں سانس نہ لے: 487

اَلْاَیْمَنَ فَالْاَیْمَنَ: 488

ایک مسئلہ : 491

مشکیزہ اور بڑے برتن سے منہ لگا کر پینے کی ممانعت اور اس کی وجہ: 492

حضور (صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم) نے مشکیزہ سے منہ لگا کر پیا: 494

روایتوں میں تطبیق: 496

پینے کی چیز میں پھونک نہ مارے: 497

کھڑے ہو کر پینے کی تفصیل: 500

چکی کا پاٹ: 502

زمزم کو کھڑے ہو کر پینے کی تفصیل: 504

وضو کا بقیہ بھی کھڑے ہو کر پی سکتے ہیں : 506
کھڑے ہو کر کھانا پینا؟:.. 507
پلانے والا خود اخیر میں پیئے: 510
ایک واقعہ :.. 511
ترجمۃ الباب : 513
یہ غلط فہمی نہ رہے:... 514
پتھر کے برتن کا استعمال:.. 515
پیتل کے برتن کا استعمال: 516
نہر میں منھ ڈال کر پینا: 517
یہ ان کے لیے دنیا میں ؛تمہارے لیے آخرت میں : 518
جہنم کی آگ اُنڈیل رہا ہے: 519

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اداریہ

الحمدللہ پھر ایک مرتبہ آپ حضرات کی خدمت میں "**حدیث کے اصلاحی مضامین جلد: ۹**" کا گلدستہ لے کر حاضر ہیں۔ وہی روحانی نورانی مضامین جو نبوت کی مبارک زبان کے شایانِ شان ہیں۔

عہدہ، حکومت اور اقتدار کو آج ہر قیمت پر حاصل کرنے کی کوششیں کی جاتی ہیں، جھوٹے وعدے، خیانت، غبن، الزام تراشی وغیرہ ہر گناہ انگیز کر لیا جاتا ہے، پھر جب کامیابی حاصل ہو جاتی ہے تو اس کا جو ناجائز استعمال کیا جاتا ہے وہ نہ محتاجِ بیان ہے اور نہ قابلِ بیان۔ جمہوری ملکوں میں اقتدار کے 'misuse' کی اگر تاریخ رقم کی جائے تو دفتروں کے انبار لگ جائیں۔ آج ان ممالک میں بسنے والا ہر شخص پریشان ہے کیوں کہ تختِ حکومت پر انسانیت کا خون چوسنے والے درندے اڈہ جمائے ہوئے ہیں یہ سب کچھ اس وجہ سے ہے کہ اس سلسلہ کی خالق انسانیت کی طرف سے دی گئی تعلیمات سے واقفیت نہیں، یا پھر اللہ تعالیٰ کا ڈر نہیں۔ اگر اس سلسلہ کی تعلیمات کو پڑھا جائے تو معلوم ہو کہ یہ حکومت وعہدہ مانگنے کی نہیں، بھاگنے کی چیز ہے۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اس سے متعلق ایسا نایاب انتخاب پیش فرمایا ہے کہ قابلِ داد ہے، عنوان ہے: ✓ "اصحابِ اقتدار کو نرمی کا حکم":

ہمارے زمانہ میں اربابِ اقتدار تو درکنار؛اُن کے ادنیٰ درادنیٰ ماتحتوں میں سے اگر کوئی ہمارے ساتھ نرم کلامی کرلے ،دل جوئی کا معاملہ کرلے؛تو ہمیں حیرت ہوتی ہے،گویا اس نے کوئی انہونی کرلی ہو۔ترش روئی وبدکلامی کو ایک حصہ ٔ فرض سمجھا جاتاہے۔خیانت ، بدعہدی اور رشوت کا بازار الگ گرم ہے ؛جس سے ہر شہری پریشان ہے۔واقعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دنیوی زندگی کے مختلف الانواع شعبوں کے لیے جتنی ہدایات دی گئی ہیں ان کی مخالفت اور پریشانی لازم ملزوم ہے۔

اسلام عالم گیر مذہب ہے،پوری انسانیت کے لیے ہے ،خود اسلامی تعلیمات پر صد فیصد عمل کرکے دارین کی فلاح وبہبود حاصل کرنا ہماری سعادت ہے،پھر اس کا تعارف اپنوں اور دوسروں سے کرانا بھی ہماری ذمہ داری ہے۔پوری انسانیت کے ہر دکھ درد کا واحد علاج اسلام اوراسلامی تعلیمات میں ہے۔

جامعیت کی بات تو یہ ہے کہ ایک طرف حکام وسلاطین کو اگر رعایا سے حسنِ سلوک اور ہمدردی کا درس دیا، تو دوسری جانب رعایاکے گلے میں ”اطاعتِ حکام“ کا ایسا زبردست طوق ڈالا کہ انتشار وخلفشار اورانار کی انسانی معاشرہ کے قریب بھی نہ پھٹک سکے۔

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اس عنوان کے ماتحت مندرجہ ٔ ذیل ضمنی عناوین قائم کئے ہیں :-

☑ انصاف سے پیش آنے والا حکمران:

☑ حاکموں کی اطاعت کے احکام:

☑ عہدہ طلب کرنے کی ممانعت:

☑ بادشاہ اور قاضی وغیرہ حکمرانوں کو اپنے لئے صالح مشیر رکھنے کی ترغیب اور برے ساتھیوں سے بچنے کی تاکید:

☑ امارت وقضاء وغیرہ عہدے مطالبہ کرنے والوں یا لالچ رکھنے والوں کو دینے کی ممانعت :

اس سے فراغت کے بعد صاحبِ کتاب نے آداب کا وہ سلسلہ شروع فرمایا جن کے اختیار کرنے سے انسان حقیقی انسان بنتاہے اور چھوڑنے سے سرحدِ انسانیت سے نکل جاتا ہے، مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے مختلف عناوین قائم فرماکر آیات وروایات کا حسین گلدستہ حسبِ عادتِ شریفہ پیش فرمایا ہے۔

☑ شرم وحیاء کیاہے ؟اوراس کی فضیلت۔اس کا اسلام میں کیامقام ہے ؟

☑ رازداری کی اہمیت، کسی کے بھید کی حفاظت کرنا:

☑ عہدوپیمان اوروعدہ پورا کرنا:

☑ نیک کاموں کی عادت کوباقی رکھنا:

✅ بوقتِ ملاقات خوش کلامی وبشاشت:

✅ بات چیت واضح اورصاف ستھری کرے۔ اگرایک بار سے مخاطب نہ سمجھے تو دوتین بار دہرائے:

✅ اپنے ہم نشین کی بات کی طرف دھیان دینا:

اسی طرح آدمی کے اندروقاریعنی سنجیدگی اورطبیعت کے اندرجماؤ اور ٹھیراؤ ہوناچاہیے، یہ زندگی کا ایک اہم حصہ ہے جس کی وجہ سے آدمی کا سماج وسوسائٹی میں اثرو رسوخ قائم ہوتا ہے،اس سے متعلق معتدل تعلیم شریعتِ مطہرہ کے اندرموجود ہے جس کا مواد اس عنوان کے ماتحت قاری کویکجامل جائے گا۔

✅ سنجیدگی اوراطمینان کی عادت:

✅ نمازاور علمی مجالس میں سکون و وقارسے آنا:

✅ مہمان کااعزازواکرام کرنا:

✅ کسی کواس کی خوشی کے وقت مبارک بادی دینا

✅اپنے کسی ساتھی اوردوست کو رخصت کرتےوقت نصیحت کرنا،اس کے لیے دعاکرنا اوراس سے دعاکی درخواست کرنا:

✅استخارہ کرنااور مشورہ کرنا:

یہ عنوان انتہائی توجہ سے پڑھنے کاہے۔ایسی نایاب باتیں اس عنوان کے تحت آئی ہیں جو کہیں اوربہت مشکل سے ملے گی،حضرت دامت برکاتہم نے بہت وضاحت سے سمجھایاہے کہ استخارہ کا حکم کس پس منظر اورماحول میں نازل ہوا، عربوں نے اپنی طرف سے کسی اہم معاملہ میں اپنا تذبذب دورکرنے کے لیے کیا طریقے گھڑرکھے تھے،عام طورپریہ سمجھاجاتاہے کہ استخارہ ایک سرسری عمل ہے،لیکن حضرت کے مضمون کو پڑھنےکے بعدمعلوم ہوتا ہے کہ یہ کتناگہرااور نایاب عمل ہےجواللہ رب العزت کی طرف سےبندوں کودیاگیاہے،اسی ضمن میں دعائےاستخارہ کا نہ صرف ترجمہ؛ بلکہ دل نشین تشریح بھی پڑھنے کی چیز ہے۔

✅عید کی نماز کے لیے مختلف راستوں سے آناجانا:

✅ہراچھے کام میں دائیں طرف سے شروع کرنامستحب ہے:

پھر ان سب کے ضمن میں دیگر علمی فوائد ،ارشاداتِ اکابر مختلف مثالوں کے ذریعہ مضمون کی تشریح وغیرہ امورہیں ۔

اس کے بعد کھانے اور پینے کے آداب کا سلسلہ شروع فرمایا جو تقریباً سوا سو صفحات تک پھیلا ہوا ہے۔ ضرور پڑھئے اور دوسروں کو سنایئے، اگر بیوی بچوں کو ساتھ بٹھا کر اس کی تعلیم کی جائے گی تو ان شاء اللہ زندگیوں میں سلیقہ و تمیز پیدا ہو گی، اور ایسی ایسی باتیں سامنے آئیں گی کہ ایمان میں تازگی محسوس ہو گی۔

☜ کھانے کے آداب / کھانے سے پہلے بسم اللہ اور کھانے کے بعد الحمدللہ پڑھنا:

☜ کھانے میں عیب نہ نکالے۔ اس کی خوبی بیان کرنے کا پسندیدہ ہونا:

☜ دعوت میں حاضر ہونے والا اگر روزہ دار ہے؛ تو کیا کہے؟:

☜ کسی کو کھانے کی دعوت دی گئی، اور کوئی دوسرا بھی اس کے ساتھ ہو گیا، تو وہ کیا کہے؟:

☜ اپنے سامنے سے کھانا اور خلافِ ادب کھانے والے کو نصیحت کرنا اور ادب سکھانا:

☜ مجمع کے ساتھ کھاتے وقت کھجور وغیرہ دو، دو نہ لے:

☜ کھانے سے سیری نہیں ہوتی؛ وہ کیا کرے؟:

☜برتن کے ایک طرف سے کھانے کا حکم:

☜ٹیک لگاکر کھانے کاناپسندیدہ ہونا:

☜پینے کے آداب:

☜مشکیزہ اوربڑے برتن سے منھ لگاکرپینے کی ممانعت اوراس کی وجہ:

☜پینے کی چیزمیں پھونک نہ مارے:

☜کھڑے ہوکرپینے کی تفصیل:

☜پلانے والاخوداخیرمیں پیئے:

☜کن برتنوں میں پیناجائز ہے اور کن میں نہیں :

حق تویہ ہے کہ جوں جوں ہم یہ مضامین پڑھتے جائیں گے توں توں ہمارے سامنے دینِ اسلام کے محاسن منکشف ہوں گے،تعلیمات کی قدر ہوگی،اورعمل کریں گے تو زندگی سنورے گی،ایک ایمان والے کے لیے تعلیماتِ نبوی انمول سرمایہ ہے۔حق تعالیٰ شانہ ٗ ہمیں توفیق عطافرمائے۔

اس جلد کے مواد کی فراہمی میں ہمیں مفتی محمد امین صاحب راجستھانی اور مولانا محمد ایوب صاحب مالیگانوی زید مجدہما اوران کے احباب کا تعاون حاصل رہا، ادارہ ان سب کا ممنون ومشکور ہے۔اللہ تعالیٰ ان تمام حضرات کے علم وعمل، صلاح و تقویٰ میں برکت دے اوران سب کو خدمات کا دارین میں بہترین بدلہ عطا فرمائے۔

ابوزاھر

۱۸، جمادیٰ الثانیہ ۱۴۳۴ھ

۳۰، اپریل ۲۰۱۳ء

بَابُ أَمْرِ وُلَاةِ الْأُمُوْرِ بِالرِّفْقِ بِرِعَايَاهُمْ وَنَصِيْحَتِهِمْ، وَالشَّفْقَةِ عَلَيْهِمْ

وَالنَّهْيِ عَنْ غَشِّهِمْ، وَالتَّشْدِيْدِ عَلَيْهِمْ وَإِهْمَالِ مَصَالِحِهِمْ وَالْغَفْلَةِ عَنْهُمْ وَعَنْ حَوَائِجِهِمْ

اصحابِ اقتدار اپنے ماتحتوں کے ساتھ نرمی اختیار کریں، ان کی خیر خواہی اور ان کے ساتھ شفقت و محبت کا معاملہ کریں، ان کو دھوکہ نہ دیں، بے جا سختی نہ کریں، ان کی مصالح سے پہلو تہی نہ کریں

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ نَحۡمَدُہٗ وَنَسۡتَعِیۡنُہٗ وَنَسۡتَغۡفِرُہٗ وَنُؤۡمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیۡہِ وَ نَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنۡ شُرُوۡرِ اَنۡفُسِنَا وَمِنۡ سَیِّئَاتِ اَعۡمَالِنَا مَنۡ یَّھۡدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنۡ یُّضۡلِلۡہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ

وَنَشۡھَدُ اَنۡ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحۡدَہٗ لَا شَرِیۡكَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوۡلَانَا مُحَمَّدًا عَبۡدُہٗ وَرَسُوۡلُہٗ

صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصۡحَابِہٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسۡلِیۡمًا کَثِیۡرًا کَثِیۡرًا۔ أما بعد:-

اسلام نام ہی حقوق کی ادائیگی کا ہے:

اللہ تعالیٰ اور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے تمام لوگوں کے حقوق کو واضح کر کے امت کے سامنے پیش کر دیا ہے، اور اسلام کی تعلیمات کی بنیاد ہی اس بات پر ہے کہ ان تمام حقوق کو ادا کیا جائے، گویا اسلام نام ہی حقوق کی ادائیگی کا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا بندوں پر کیا حق ہے وہ بھی بتلا دیا، اور خود بندوں کے آپس کے حقوق بتلائے کہ ماں باپ کا اولاد کے اوپر کیا حق ہے، اولاد کا ماں باپ کے اوپر کیا حق ہے۔ بیوی کا شوہر کے اوپر اور شوہر کا بیوی کے اوپر کیا حق ہے۔ بھائی کا بھائی پر، بہن کا بہن پر، بھائی بہنوں کے آپس میں ایک دوسرے پر کیا حقوق ہیں، ایک پڑوسی کا دوسرے پڑوسی کے اوپر کیا حق ہے، آقا کا اپنے غلام کے اوپر کیا حق ہے، اور غلام کا آقا پر کیا حق ہے؛ یہ سب حقوق تفصیلی طور پر اسلام نے بتلائے ہیں۔

حکمرانوں کا پورا سلسلہ:

چناں چہ اسی سلسلہ میں ایک چیز آج پیش کی جارہی ہے کہ جب اسلامی حکومت ہوتی ہے تو ان میں ایک حکمران طبقہ ہوتا ہے اوران میں بھی درجات ہوتے ہیں۔ایک توحاکمِ اعلیٰ ہوتا ہے جس کوبادشاہ اورسلطان کہاجاتاہے،پھراس کی ماتحت درجات ہوتےہیں،جیسے ہمارے ملک میں پوراایک نظام ہے کہ صدریاوزیرِاعظم ہوتےہیں ،پھران کے ماتحت گورنروں اور وزرائے اعلیٰ کاسلسلہ ہے،پھروزرائے اعلیٰ کے ماتحت ضلعوں کے کلکٹروغیرہ ہیں ،پھر تحصیل کے پیمانوں پر حاکم ہیں ،پھر دیہات اوربستیوں کے پیمانوں پرحاکم ہیں۔اورہر سطح پر کچھ نہ کچھ ذمہ داریاں ہوتی ہیں ،یہ ساری ذمہ داریاں جن کے حوالہ کی جاتی ہیں ان کو ایک قسم کی حکمرانی حاصل ہوتی ہے، چاہے چھوٹےپیمانے پرہو،یابڑے پیمانے پرہو۔اگروہ حاکمِ اعلیٰ ہے جس کے ہاتھ میں حکومت دی گئی ہے،توپوراملک اور تمام رعیت اس کے ماتحت ہے، اس کےاوپر اپنے ماتحتوں کی،رعایااورپبلک کی کیاذمہ داریاں ہیں ؟ان کے ساتھ کیسا معاملہ کرنا چاہیے؟اورپھرپبلک ورعایا کے اوپراس حکمران کے کیاحقوق ہیں ؟

حکومت نہ ہونے کی صورت میں بھی ہرایک پرکچھ ایسی ذمہ داریاں ہیں جن کی وجہ سے کچھ لوگ اس کےماتحت ہوتے ہیں ،جیسے :گھریا خاندان کابڑاذمہ دار ہوتا ہےتواس کی ماتحتی میں کچھ لوگ ہیں۔گھرکے ذمہ دارکے ماتحتی میں اس کے بیوی بچےاوردوسرے لوگ

جو گھر کے اندر سکونت اور رہائش اختیار کیے ہوئے ہیں جن کا یہ بڑا سمجھا جاتا ہے؛ اس پر ماتحتوں کے حقوق ہوتے ہیں۔

جہاں خاندان مشترکہ طور پر زندگی گزارتے ہیں، تو خاندان کا جو سربراہ اور بڑا ہوتا ہے، وہ سب کا ذمہ دار ہوتا ہے، اس کے اوپر اپنے ماتحتوں کے حقوق ہوتے ہیں، علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ دونوں باب بالترتیب لائیں گے، اس کی تفصیل بیان کریں گے اور اس سلسلہ میں نبیٔ کریم (ﷺ) نے جو ذمہ داریاں بتلائی ہیں ان سے متعلق روایتیں پیش کریں گے۔

جیتے جی جنت کا نمونہ بنانے کا نسخہ:

اس سلسلہ میں ایک چیز ذہن نشین رہے کہ جہاں کہیں معاملہ دو پارٹیوں یا دو فریق کا ہوتا ہے، تو ہر فریق کے اوپر دوسرے فریق کی نسبت سے کچھ حقوق اور ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، ایسی بے شمار مثالیں ہیں، مثلاً: میاں بیوی کا تعلق ہے، اور ہر ہر گھر کے اندر یہ تعلق ہوتا ہے، بلکہ ایک ہی گھر کے اندر کئی میاں بیوی رہتے ہیں؛ تو شوہروں کا ایک گروہ اور جماعت ہے، ان کے مقابلہ میں بیویوں کی ایک جماعت اور پارٹی ہے۔ اسی طریقہ سے سیٹھ اور نوکر کا تعلق ہے، تو سیٹھوں کی پوری ایک جماعت اور طبقہ ہے اور ان کے ماتحت کام کرنے والوں کا پورا ایک گروہ ہے۔ تو جو مالک، آقا اور سیٹھ ہیں ؛ ان کو کیا حقوق حاصل ہیں؟ اور ان کی اپنے ماتحتوں اور نوکروں کی نسبت سے کیا کیا ذمہ داریاں ہیں۔ اسی طرح نوکروں کا جو گروہ ہے ان کے اوپر اپنے آقا کی نسبت سے کیا کیا ذمہ

داریاں عائد ہوتی ہیں ؟اس سلسلہ میں حکومتوں کے بھی قانون ہوتے ہیں۔ اور شریعتِ اسلامیہ میں اللہ تعالیٰ نے بھی یہ سارے حقوق واضح کر دیئے ہیں اور اس سلسلہ میں ایسا انداز اختیار کیا ہے کہ اگر دونوں فریق اپنی اپنی ذمہ داریوں کو پوری دیانت اور امانت داری کے ساتھ ذرّہ برابر بھی کمی کیے بغیر ادا کریں ؛ پھر تو یہ دنیا جیتے جی جنت کا نمونہ ہی بن جائے، اور اگر ایک فریق تو ان حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی کرتا ہے جو اس کے اوپر دوسرے فریق کے واجب ہوئے ہیں، لیکن دوسرا فریق اپنی ذمہ داریاں ادا کرتا ہے، تب بھی کوئی جھگڑا اور نزاع کی نوبت پیش نہیں آئے گی۔

اسلام اس بات کی تاکید کرتا ہے کہ تمہارے اوپر دوسروں کے جو حقوق ہیں اس کو ادا کرو، اور اپنے حقوق کا مطالبہ مت کرو۔ چناں چہ آپ قرآن وحدیث کے اندازِ تخاطب کو دیکھیں گے تو اس میں خاص طور پر جس کا حق ہے اس کو خطاب نہیں کیا ہے، بلکہ جس پر حق ہے اس کو خطاب کیا ہے۔ جیسے: بیوی کا حق ہے تو بیوی کو یہ نہیں کہا کہ شوہر کے اوپر تیرا حق ہے، بلکہ شوہر کو یوں کہا گیا کہ تمہارے اوپر بیوی کا یہ حق ہے۔ یا بیوی کے اوپر شوہر کا حق ہے تو شوہر کو خطاب کر کے یوں نہیں کہا گیا کہ اے شوہروں کی جماعت! تمہاری بیویوں پر تمہارے یہ حقوق ہیں، بلکہ عورتوں کو براہِ راست خطاب کیا گیا ہے کہ تمہارے اوپر شوہروں کے یہ یہ حقوق ہیں، تم ان کو ادا کرو۔ ایسے ہی یہاں پر بھی ہے۔

عنوان کا خلاصہ:

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے پہلا باب قائم کیا، جس کا عنوان ہے: ذمہ داروں کو اپنے ماتحتوں کے ساتھ نرمی اختیار کرنے کا حکم۔ جیسا کہ میں نے بتلایا کہ حکمرانی کے بھی مراتب اور درجات ہیں، ایک تو حاکمِ اعلیٰ ہوتا ہے، پھر اس کے ماتحت ہوتے ہیں، پھر اس کے ماتحت؛ اسی طرح ایک بہت لمبا چوڑا سلسلہ چلتا ہے۔ اس لیے یہ حکم صرف بادشاہِ وقت کے لیے خاص نہیں ہے، بلکہ جو گھر کا ذمہ دار، بڑا اور رئیس ہوتا ہے اس کو بھی یہ سارے احکام لاگو پڑتے ہیں۔ "وَنَصِيْحَتِهِمْ وَالشَّفْقَةِ عَلَيْهِمْ" ان کی خیر خواہی اور پوری پوری بھلائی چاہنے، اور ان کے ساتھ شفقت و محبت کا معاملہ کرنے کا حکم۔ "وَالنَّهْيِ عَنْ غَشِّهِمْ" اور ان کی بدخواہی سے منع کرنے کا حکم۔ بحیثیت حاکم کے تمہاری طرف سے کوئی ایک حرکت بھی ایسی نہیں ہونی چاہیے جس سے تمہارے ماتحتوں کے متعلق بدخواہی معلوم ہوتی ہو۔ "وَالتَّشْدِيْدِ عَلَيْهِمْ" جہاں حکمران کو حکم دیا گیا کہ نرمی کرو، وہیں ان کے ساتھ سختی کرنے سے منع کیا گیا۔ یعنی دونوں باتیں ہونی چاہئیں، صرف نرمی کا حکم نہیں دیا گیا، بلکہ سختی سے بھی منع کیا گیا، جیسے: خیر خواہی کا حکم دیا اور ساتھ ہی بدخواہی سے منع کیا۔

بے توجہی اور غفلت سے منع کیا گیا:

"وَإِهْمَالِ مَصَالِحِهِمْ وَالْغَفْلَةِ عَنْهُمْ" ان کی جو جو مصلحتیں ہوں ان کی طرف سے بے خبری، بے توجہی اور ان کے معاملہ میں غفلت برتنے سے بھی منع کیا گیا۔ اور ان کی بھلائی کی جتنی بھی شکلیں ہوسکتی ہیں وہ سوچی جائیں۔ مثلاً: ایک آدمی پورے گھر کا سربراہ اور رئیس ہے، اب گھر میں کیا ہورہا ہے اس کو اس بات کی کوئی پڑی ہی نہیں ہے، گھر والے کہاں سے کھارہے ہیں، کیا کررہے ہیں، ان کی ضرورتیں کیسے پوری ہورہی ہیں، اس کو اس بات کی کوئی فکر نہیں ہوتی، وہ اپنے میں مست ہے، اور ان کی طرف سے بالکل غفلت برت رہا ہے۔

یا اگر اچھا کھلا پلا تو رہا ہے لیکن ان کی تعلیم و تربیت کی طرف سے غفلت برت رہا ہے کہ ان کے اعمال کیا شکل اختیار کررہے ہیں۔ یا اس کو اس بات کی کوئی پرواہ ہی نہیں ہے کہ میرا بیٹا کس کی صحبت میں پھر رہا ہے، میری بیوی کہاں جارہی ہے، میری بیٹیاں کیا کررہی ہیں۔ یا اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے کہ گھر والے غلط لیٹریچر کا مطالعہ کررہے ہیں جس سے ان کی ذہنیت خراب ہوتی ہے، لیکن ان کی طرف سے بے توجہی اور غفلت برتتا ہے؛ تو شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی۔ اوپر سے لے کر نیچے تک ہر ایک کے لیے یہ حکم یکساں ہے۔

مصلحت اور حاجت کا فرق:

"وَعَنْ حَوَائِجِهِمْ" ان کی ضرورتوں سے غفلت برتنے سے منع کیا گیا ہے۔ مصالح اور حوائج دو چیزیں الگ الگ ہیں، مصالح کا مطلب یہ ہے کہ ہر وہ چیز جس سے اس کی زندگی میں خوبی اور نکھار آتا ہے، زندگی بنتی اور سنورتی ہے، اور اس میں تعلیم و تربیت، اخلاق، اعمال، اٹھنا بیٹھنا، بول چال؛ یہ ساری چیزیں آتی ہیں۔ اور حوائج کا مطلب ہے ضرورتیں؛ جس میں کھانا، پینا، کپڑا مکان؛ یہ ساری چیزیں آتی ہیں۔ اب ایک آدمی اگر اپنے ماتحتوں کے کھانے پینے، رہنے سہنے، اور ان کے کپڑوں کا بہترین انتظام کرتا ہے، اس پر برابر پیسے خرچ کرتا ہے، ذرّہ برابر اس کی طرف سے غفلت نہیں برتتا، لیکن ان کی تعلیم و تربیت کی طرف سے غفلت کا معاملہ کرتا ہے، ان کی عادتوں کی طرف سے غفلت و بے پرواہی برتتا ہے تو پھر یہ گڑبڑ والی بات ہوجائے گی۔ اس لیے کہ وہ ان کی حاجتیں پوری کررہا ہے، لیکن ان کی مصلحتوں اور بھلائیوں کی طرف توجہ نہیں کررہا ہے۔ لہٰذا ہمیں بحیثیت ایک ذمہ دار کے ہر طرف سے چوکنّا رہنا ہے اور ہر ہر چیز کا خیال کرنا ہے۔ گھر کے لیڈر اور ذمہ دار ہونے کی حیثیت سے صرف کھلانا پلانا ہی کافی نہیں ہے۔

آج کل ہم لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ اگر ہم گھر کے ذمہ دار ہیں تو گھر کے لوگوں کے رہنے سہنے، کھانے پینے، کپڑوں وغیرہ دوسری ضرورتوں کا انتظام کردیں گے؛ تو گویا ہم نے اپنی ذمہ داری پوری کرلی۔ حالاں کہ علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "وَإِهْمَالِ مَصَالِحِهِمْ وَالْغَفْلَةِ عَنْهُمْ وَعَنْ

حَوَائِجِهِمْ"۔ ان کی ذات سے بھی غفلت نہ برتے اور ان ضرورتوں سے بھی غفلت نہ برتے، ان کی ہر چیز کا خیال رکھے؛ یہ سب ذمہ داریاں ہیں۔

ایک مثال:

بھائی! آپ گاڑی میں پٹرول تو دیتے ہیں، لیکن اس کے شیشے کی صفائی نہیں کرتے، سروس نہیں کراتے؛ تو کیا کام چل جائے گا؟ نہیں چلے گا! بلکہ ہر ہر چیز کرنی پڑے گی، تب ہی آپ کی گاڑی چلے گی۔ اسی طریقہ سے کھلانے پلانے، رہنے سہنے کا انتظام تو کرتے ہیں؛ لیکن ان کے اخلاق، اعمال، اقوال کے سدھار اور تعلیم و تربیت کی طرف دھیان نہیں دیتے، ان کی عادتیں کیسی ہیں، کہاں اٹھتے بیٹھتے ہیں، گھر میں کیا کرتے ہیں، اس طرف سے غفلت برتتے ہیں اور کوئی توجہ نہیں کرتے؛ تو کام نہیں چلے گا۔ اور جتنے بھی ذمہ دار ہیں ہر ایک کے لیے یہی حکم ہے، بادشاہِ وقت اور حاکمِ اعلیٰ جو پوری سلطنت کا ذمہ دار ہے، اس کی بھی یہ ذمہ داری ہے کہ اپنی رعیت کی ان ساری چیزوں کا خیال رکھے۔

موت کی گھڑی میں رعایا کی اصلاح کی فکر:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی زندگی کا مطالعہ کیجیے تو پتہ چلے گا کہ وہ صرف اتنا ہی نہیں سوچتے تھے کہ نظامِ سلطنت برابر چلے، بلکہ رعیت کی ہر ہر چیز کا پورا خیال رکھتے تھے، لوگوں کا کیا حال ہے،

ان کے اخلاق کیسے ہیں ،ان کے اعمال کیسے ہیں ، وہ کس قسم کا لباس پہنتے ہیں ؛وہ ان سب چیزوں کا خیال رکھتے تھے۔اس بات کا اندازہ اس واقعہ سے لگایئے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر حملہ ہوا،ابولوئوٗ نے خنجر مارا جس سے آپ زخمی ہوئے اور آپ کے جاں بر ہونے کی امید نہیں تھی، سب کا گمان تھا کہ اسی بیماری میں انتقال ہوجائے گا اور اسی بیماری میں آپ کی وفات بھی ہوئی۔ اسی بیماری کے دوران ایک نوجوان آپ کی خیریت دریافت کرنے کے لیے آیا،جب وہ واپس لوٹ رہا تھا تو آپ کی نظر اس کی لنگی یا پائجامہ پر پڑی جو ٹخنوں سے نیچے لٹک رہا تھا، آپ نے اس کو بلایا اور کہا:اے بھائی! "إِرْفَعْ ثَوْبَكَ" اپنا پائجامہ اونچا رکھو "فإِنَّهُ أَنْقىٰ لِثَوْبِكَ" یہ تمہارے کپڑے کی صفائی کا ذریعہ ہے "وَأَتْقىٰ لِرَبِّكَ" اوراپنے رب کے یہاں تقویٰ کا ذریعہ بھی ہے (صحیح بخاری، باب قصة البیعة والاتفاق علی عثمان بن عفانؓ،حدیث نمبر:۳۴۹۷)غور کرو کہ عین موت کی گھڑی میں وہ اس ذمہ داری سے بے خبر اور بے پرواہ نہیں تھے۔

ایک مرتبہ جب آپ شام کے علاقہ میں تشریف لے گئے،تووہاں اسلامی لشکر کے مختلف حصوں کے سپہ سالار ملے،ان کے حالات کو دیکھا توان کے لباس پر ان کو ٹوکا۔

جامع آیت:

پہلی آیت لائے ہیں :﴿إِنَّ اللهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيْتَآءِ ذِي الْقُرْبىٰ﴾ اللہ تعالیٰ عدل کا حکم دیتا ہے۔یہ ایک ایسی جامع آیت ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ

قرآنِ پاک کی ساری تعلیمات پیش کرنے کے لئے یہ ایک آیت ہی کافی ہے۔اسی لیے حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے جمعہ اور عیدین کے دوسرے خطبہ میں اس کو شریک کرلیا، خطیب اپنے خطبہ کو اسی آیت پر ختم کرتا ہے۔یہ ایسی جامع آیت ہے کہ قرآنِ کریم کی تمام تعلیمات کی پوری عکاسی کرتی ہے۔بعض حضرات تو اسی آیت کی وجہ سے ایمان لائے ہیں۔

آیت کا اثر پوری قوم پر:

حضرت اکثم بن صیفی رضی اللہ عنہ ایک صحابی ہیں۔علامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے متعلق لکھاہے کہ وہ اپنے قبیلے کے سردار تھے، ان کو معلوم ہوا کہ نبیِ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ظہور ہوا ہے اور آپ نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے،لوگوں کو اسلام وایمان کی دعوت دیتے ہیں، تو انہوں نے اپنی قوم سے کہا: میں جاکر ان کے حالات کی تحقیق کرکے آتا ہوں۔ قوم نے کہا: آپ ہمارے قبیلے کے سردار ہیں، آپ خود نہ جایئے، بلکہ ان کے حالات کی تحقیق کے لیے دوآدمیوں کو بھیج دیجیے۔ چناں چہ دوآدمی گئے جنہوں جاکر نبیِ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) سے پوچھا: "مَنْ أَنْتَ وَمَا أَنْتَ؟" آپ کون ہیں اور کیا ہیں؟ حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: "أَنَا مُحَمَّدُ بْنِ عَبْدِاللهِ" مَیں محمد بن عبداللہ ہوں "وَأَنَا عَبْدُاللهِ وَرَسُوْلُهُ" اور میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں۔ان کے سوال "کون ہو؟" کے جواب میں اپنا نام بتادیا، پورا نسب بھی تفصیل سے نہیں بتایا۔اور "کیا ہو؟" کے جواب میں بتادیا کہ اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں پھر تعلیم کے طور پر آپ نے قرآنِ پاک کی یہی آیت پڑھ

کر سنائی۔ انہوں نے عرض کیا: اس کو لوٹایئے یہاں تک کہ ان کو یہ آیت یاد ہو گئی۔ آپ نے ایسا نہیں بتلایا کہ میں بڑے خاندان کا ایک فرد ہوں، بلکہ ان لوگوں نے اپنے طور پر نبی کریم (ﷺ) کے نسب شریف سے متعلق لوگوں سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ آپ تو بڑے اونچے خاندان قبیلۂ مضر سے تعلق رکھتے ہیں۔ جب وہ دونوں واپس آئے اور رپورٹ پیش کی کہ ہم نے ان سے پوچھا تو انہوں نے تو مختصر سا جواب دیا، اپنے خاندان کی تفصیل بھی ذکر نہیں کی، لیکن جب ہم نے لوگوں سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ تو بڑے اونچے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور ان پر جو وحی آتی ہے اس میں سے یہ آیت پڑھ کر سنائی ہے، جب حضرت اکثم بن صیفی رضی اللہ عنہ نے یہ آیت سنی تو کہا: وہ تو بڑے اچھے اخلاق کا حکم دیتے ہیں اور برے اخلاق سے روکتے ہیں اور فوراً اسلام قبول کر لیا، پھر اپنی قوم سے کہا: جلدی سے تم لوگ بھی اسلام میں داخل ہو جاؤ، کہیں ایسا نہ ہو کہ ساری دنیا اسلام میں داخل ہو جائے، اس کے بعد تم ضمنی طور پر داخل ہو، پھر تمہاری کوئی حیثیت نہ رہے، ابھی اسلام لانے میں سبقت کرنے کا موقع ہے۔ اس طرح یہ خود بھی مسلمان ہوئے اور پورے قبیلے کو بھی مسلمان بنا لیا۔ (تفسیر ابن کثیر، سورۂ نحل)

...میرا ایمان پختہ ہو گیا:

حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ شروع میں جب میں ایمان لایا تو میرے دل میں ایمان مضبوط نہیں تھا، بس ایمان لے آیا تھا لیکن اس بارے میں ابھی ”ڈانواں ڈول“

اور مذبذب تھا۔ایک مرتبہ نبی کریم (ﷺ) کے اوپر وحی کے نزول کے آثار ظاہر ہوئے، جب وحی نازل ہوچکی، تھوڑی دیر بعد حضورِ اکرم (ﷺ) نے یہی آیت پیش کی،جب مَیں نے یہ آیت سنی تو اس کے مضمون کے نتیجہ میں میرا ایمان پختہ ہوگیا۔(تفسیر قرطبی،سورۂ نحل)

عدل:

خلاصہ یہ ہے کہ یہ عجیب وغریب آیت ہے جس میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ "عدل" کا حکم دیتا ہے۔عدل یعنی انصاف وبرابری۔بعض حضرات فرماتے ہیں کہ ہر ذی حق کا حق ادا کرنا"عدل" ہے۔اورعدل سے اعتدال مراد لیا گیاہے یعنی اللہ تعالیٰ اعتدال ومیانہ روی کا حکم کرتاہے کہ اپنے عقائد،اعمال ، اخلاق،معاشرت اور معاملات کودرست کرواور ہر چیز میں اعتدال مطلوب ہے۔

احسان :

"وَالْاِحْسَانِ"اور اللہ تعالیٰ بھلائی کا حکم دیتاہے۔مفسرین لکھتے ہیں کہ عدل تو واجب ہے کہ ہر ذی حق کا حق پوراپورا اداکیاجائے،اور پھر حق سے زائد بھی کچھ دیا جائے:اسی کو احسان اور بھلائی سے تعبیر کیاگیاہے۔بعض حضرات کہتے ہیں : احسان کا مطلب یہ ہے کہ کسی کام کو خوبی کے ساتھ اچھی طرح انجام دینا، جیسے:اہلِ عرب بولتے ہیں :"طَبَخْتُ. فَأَحْسَنْتُ الطَّبْخَةَ"میں نے پکایا

اور بڑا اچھا پکایا۔ کوئی عمل اچھے اور عمدہ اندازو طریقہ سے پختگی کے ساتھ کیا گیا ہو، تو اس کو احسان سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اپنے تمام اعمال، اخلاق، عبادات، معاملات، معاشرت؛ ہر ہر چیز میں آدمی خوبی پیدا کرنے کا اہتمام کرے۔

اِیۡتَآءِ ذِی الۡقُرۡبٰی:

"وَاِیۡتَآءِ ذِی الۡقُرۡبٰی" اور اللہ تعالیٰ رشتہ داروں کو دینے کا حکم کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ احسان کے عام حکم میں رشتہ دار بھی آگئے تھے، اور واجب حق تو ہر ایک کا ادا کرنا ہی ہے، لیکن جہاں احسان یعنی واجب سے زیادہ دینے کی بات آتی ہے تو اس میں پھر درجات ہوتے ہیں، خاص کر رشتہ داروں کے ساتھ آدمی زیادہ بھلائی کا معاملہ کرے، رشتہ داری کی وجہ سے ان کا حق زیادہ ہے۔

فحش، منکر، سرکشی:

"وَیَنۡہٰی عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَالۡمُنۡکَرِ وَالۡبَغۡیِ" اور اللہ تعالیٰ بے حیائی اور ظاہری و باطنی ہر طرح کی برائی سے منع کرتا ہے "وَالۡمُنۡکَرِ" اور نامعقول حرکتوں اور باتوں سے بھی منع کرتا ہے "وَالۡبَغۡیِ" اور ظلم و سرکشی سے منع کرتا ہے "یَعِظُکُمۡ لَعَلَّکُمۡ تَذَکَّرُوۡنَ" اللہ تعالیٰ تمہیں نصیحت کرتا ہے، شاید تم نصیحت حاصل کرو۔

ہر ایک ذمہ دار ہے:

حدیث ۲۵۳:-

وعن ابن عمر رضی اللہ عنہ **قَالَ سَمِعْتُ رسول اللہ** (ﷺ) **یقول : كُلُّكُمْ رَاعٍ، وَكُلُّكُمْ مَسْؤُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ: الإِمَامُ رَاعٍ وَمَسْؤُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ، وَالرَّجُلُ رَاعٍ فِی أَهْلِهِ وَمَسْؤُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ، وَالمَرْأَةُ رَاعِيَةٌ فِی بَيْتِ زَوْجِهَا وَمَسْؤُولَةٌ عَنْ رَعِيَّتِهَا، وَالخَادِمُ رَاعٍ فِی مَالِ سَيِّدِهِ وَمَسْؤُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ، وَكُلُّكُمْ رَاعٍ وَمَسْؤُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ.**

ترجمہ مع تشریح:- حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: تم میں سے ہر ایک ذمہ دار ہے (یہاں تک کہ جس کے ماتحت کوئی نہ ہو، وہ بھی اپنی ذات کا ذمہ دار ہے۔ اپنی جان اور جسم پر اس کی ذمہ داری ہے کہ اپنے جسم کو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق چلائے) اور ہر ایک کو اپنے ماتحتوں کے متعلق سوال کیا جائے گا (جیسی جیسی ذمہ داری اس کو سونپی گئی ہے اسی کے مناسب اللہ تعالیٰ کے یہاں پوچھ ہوگی اور مطالبہ ہوگا کہ تم نے اپنی اس ذمہ داری کو کتنا پورا کیا۔ جیسے: کوئی) اگر پورے ملک کا سربراہِ اعلیٰ اور حکمران ہے تو پورے ملک کا پوچھا جائے گا (اور اگر کسی علاقہ کا نگران ہے تو اس علاقہ کے متعلق، اور کسی بستی کا نگران ہے تو بستی کے متعلق، اور کسی محلہ کا نگران ہے تو محلہ کے متعلق، اور کسی خاندان کا نگران ہے تو خاندان کے متعلق، اور مکان کا نگران ہے تو مکان کے متعلق سوال کیا جائے گا) اور مرد اپنے گھر والوں کا ذمہ دار ہے، ان کے متعلق سوال کیا جائے گا۔ اور عورت اپنے گھر اور مکان کی ذمہ دار ہے، اس کے متعلق اس سے پوچھا جائے گا۔ نوکر اور غلام اپنے آقا اور سیٹھ کے مال میں ذمہ دار ہے، اس سے اس کے متعلق پوچھا جائے گا۔ تم میں سے ہر ایک ذمہ دار ہے، اور ہر ایک کو اپنے ماتحتوں کے متعلق سوال کیا جائے گا۔

افادات:- "الإِمَامُ رَاعٍ" امام سے مراد حاکمِ اعلیٰ، بادشاہِ وقت ہے، اس کو اپنی ماتحت پوری رعیت، پبلک اور پورے ملک کے متعلق اللہ تعالیٰ کے یہاں سوال کیا جائے گا۔

"والرجُلُ رَاعٍ" مرد اپنے گھر والوں کا ذمہ دار ہے، وہ اپنے گھر کا سربراہ ہوتا ہے، اس کے ماتحت بیوی بچے ہوتے ہیں ان کے متعلق اللہ تعالیٰ کے یہاں سوال کیا جائے گا کہ تم نے اپنی ذمہ داری کو ادا کیا یا نہیں۔ اگر اس میں کوتاہی کی ہے تو پھر اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے پکڑ ہوگی۔

"والمَرْأَةُ رَاعِيَةٌ فِي بَيْتِ زَوجِهَا" عورت اپنے گھر اور مکان کی ذمہ دار ہے۔ بعض روایات میں ہے کہ اولاد کی نگرانی کے سلسلہ میں اور شوہر کے مکان میں جتنی بھی چیزیں ہیں ان سب کی ذمہ دار ہے۔ شوہر تو کاروبار اور کمانے اور دوسری ضرورتوں کے واسطے باہر رہتا ہے، اب گھر میں شوہر کا جو کچھ بھی ہے ان ساری چیزوں کی رکھوالی اور نگرانی کی ذمہ داری بیوی کی ہے۔ اولاد کی نگرانی بھی بیوی کے اوپر ہے۔ اور گھر کے سارے نظام کی ذمہ داری بھی عورت کے اوپر ہے۔ شوہر کی غیر حاضری میں عورت اپنی ذات کی عفت و پاک دامنی کی بھی حفاظت کرے، ساتھ ہی ساتھ بال بچوں کی نگرانی بھی کرے، اگر اس نے اس میں کوتاہی برتی، اور خیانت سے کام لیا، جیسے: بعض عورتیں اپنی ذات کے معاملہ میں بھی بے خبر اور اپنی اولاد کے معاملہ میں بھی غافل رہتی ہیں، حالاں کہ ان کو ہر چیز کو نبھانا اور سنبھالنا ہے، ان کو اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کے متعلق پوچھا جائے

گا۔اس لیے کہ شوہر صبح جب گھر سے نکلتا ہے تو اپنے گھر میں جو کچھ ہے وہ سب بیوی کے حوالہ کر کے جاتا ہے، اگر اس میں کوئی کوتاہی یا خیانت ہوئی تو بیوی سے اللہ تعالیٰ کے یہاں سوال ہو گا۔

”والخادمُ راعٍ فِی مالِ سیِّدِہٖ“ نوکر اور غلام اپنے آقا اور سیٹھ کے مال میں ذمہ دار ہے جو اس کے حوالہ کیا گیا ہو۔کوئی آدمی اگر کسی جگہ ملازم ہے، تو سیٹھ نے جو کام اس کے حوالہ کیا ہے، مثلاً: کوئی مشین حوالہ کی جاتی ہے، تو یہ اس کے آقا کا مال ہے، اس کو صحیح طریقہ سے چلانا، اس کو نقصان سے بچانے کی کوشش کرنا، اس کو چلانے میں پوری امانت ودیانت سے کام لینا؛ یہ نوکر کا کام ہے۔یا سیٹھ نے دوکان حوالہ کی، تجارت کے مال کی حفاظت کی ذمہ داری سونپی اور اسی کی تنخواہ دی جاتی ہے، تو اس کے متعلق قیامت کے روز پوچھا جائے گا۔

”کُلُّکُمْ راعٍ ومسئُوْلٌ عَنْ رَعِیَّتِہٖ“ تم میں سے ہر ایک ذمہ دار ہے اور اس کی رعیت کے متعلق سوال کیا جائے گا۔مطلب یہ ہے کہ جس کے سر جتنی ذمہ داری حوالہ کی گئی ہے، اس کے متعلق اس سے پوچھا جائے گا۔جیسی جیسی جس کی حیثیت اور جیسا جیسا جس کا مقام ہو گا اتنی ہی ذمہ داری اس کی زیادہ اور بڑی ہے، اور اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کے متعلق اس سے سوال ہو گا۔

آج کل تو یہ ہو گیا ہے کہ کوئی اونچا عہدہ یا منصب مل جائے تو ہم خوش ہوتے ہیں، حالاں کہ یہ توڈرنے کی چیز ہے۔جس کا منصب جتنا اونچا ہو گا، اتنے ہی زیادہ لوگ اس کے ماتحت آئیں

گے اوران سب کی ذمہ داری اس کے اوپر عائد ہوگی، اس میں سے کسی ایک کے حق کی ادائیگی میں بھی کوتاہی ہوئی تو قیامت کے روز اس کا جواب دینا پڑے گا۔

ماتحتوں کے بدخواہ کی سزا:

حدیث ۶۵۴:-

وعن أبي يعلى مَعْقِل بن يَسارٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: سَمِعْتُ رسولَ الله (صلی اللہ علیہ وسلم) يقول: مَا مِنْ عَبْدٍ يَسْتَرْعِيهِ اللهُ رَعِيَّةً، يَمُوتُ يَوْمَ يَمُوتُ وَهُوَ غَاشٌّ لِرَعِيَّتِهِ، إلاَّ حَرَّمَ اللهُ عَلَيْهِ الجَنَّة. (متفقٌ عليه)

وفي رواية: ((فَلَمْ يَحُطْهَا بِنُصْحِهِ لَمْ يَجِدْ رَائِحَةَ الجَنَّة))

وفي رواية لمسلم: ((مَا مِنْ أميرٍ يلي أمور المُسْلِمينَ، ثُمَّ لا يَجْهَدُ لَهُمْ وَيَنْصَحُ لَهُمْ إلاَّ لَمْ يَدْخُلْ مَعَهُمُ الْجَنَّة))

ترجمہ:- حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو فرماتے ہوئے سنا: جس بندہ کو اللہ تعالیٰ اپنی رعیت کا نگران مقرر کرے (جیسا کہ اوپر بتلایا کہ جس کے ماتحت جتنے بھی لوگ ہوتے ہیں، اگر کوئی ایک گھر کا سربراہ ہے، کوئی پورے خاندان کا سربراہ ہے، کوئی پوری بستی کا سربراہ ہے، کوئی پورے علاقہ کا سربراہ ہے) اور جس روز وہ مر رہا ہے تو اس کی موت ایسی حالت میں آرہی ہے کہ وہ اپنے ماتحتوں کی بدخواہی کیے ہوئے ہے، یا ان کی بھلائی چاہنے کے بجائے ان کی برائی چاہ رہا ہے، تو اللہ تعالیٰ اس کے اوپر جنت کو حرام کردے گا۔

افادات:- اسلام نے رعایا کے اوپر حکمرانوں کے بڑے حقوق بتائے ہیں، جیسا کہ آئندہ باب آنے والا ہے جس میں آئے گا کہ ان کی پوری فرمانبرداری کرو، اور جب کہ رعیت تو پوری فرماں برداری کررہی ہے ، لیکن حکمران رعیت کی خیر خواہی کرنے کے بجائے بدخواہی کرتا ہے، وہ جانتا ہے کہ یہ چیز ان کے لیے مضر ہے، اس کے باوجود اپنے کسی مفاد کے پیشِ نظر ان کے لیے وہی چیز اختیار کرتا ہے؛ تو ایسے آدمی پر اللہ تعالیٰ جنت کو حرام کردیں گے۔

دوسری روایت میں ہے: "فَلَمْ يَحُطْهَا بِنُصْحِهِ" پوری پوری خیر خواہی نہیں کی، یعنی جو بھلائی ہونی چاہیے تھی وہ نہیں چاہی، اس میں کمی کی۔ مثلاً: کھانا تو کھلایا، کپڑے تو پہنائے، لیکن اچھے آداب نہیں سکھلائے، اچھے اخلاق سے آراستہ نہیں کیا، دینی تعلیم نہیں دی، اس کو دنیا حاصل ہو جائے اس کی ڈگریاں تو دلوادیں، لیکن اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل ہو، ایسی چیز ان کو نہیں سکھلائی، نماز نہیں سکھلائی، تو ظاہر ہے کہ خیر خواہی میں کمی رہ گئی؛ ایسا آدمی جنت کی خوشبو بھی نہیں پائے گا۔

جن کے رتبے ہیں سوا...:

ایک روایت میں ہے کہ جو حکمران مسلمانوں کے معاملات کا ذمہ دار ہوتا ہے، پھر وہ ان کے لیے پوری پوری خیر خواہی نہیں کرتا بلکہ اس میں کمی رکھتا ہے، تو وہ اپنے گناہوں کی وجہ سے اوّلِ وہلہ میں جنت میں نہیں جاسکے گا، بلکہ خیانت اور کوتاہی کی سزا بھگتنے کے بعد جائے گا۔ ہاں ! اگر اپنی مقدور بھر طاقت کے مطابق پوری خیر خواہی کرڈالی، جتنا اس کے بس میں تھا اس

میں اپنی طرف سے کوئی کوتاہی نہیں کی، تو اس کا ذمہ بری ہو جائے گا،اس لیے منصب وعہدہ اوراونچامقام کوئی آسان چیز نہیں ہے:

جن کے رتبے ہیں سوا،ان کی مشکل بھی سوا ہوتی ہے

جس کا جتنااونچامقام ہوتا ہے اس کی ذمہ داری بھی اسی مناسبت سے بڑی ہوا کرتی ہے اگر اس میں اس نے کوتاہی سے کام لیا تو دنیا میں بھی لوگ تھوتھو کریں گے اورآخرت میں اللہ تعالیٰ کے یہاں بھی جواب دینا ہے۔

جیسا برتاؤ؛ ویسی دعا:

حدیث ۶۵۵:-

وعن عائشة رضی اللہ عنہا **قالت:سَمِعْتُ رسولَ اللهِ** (ﷺ) **يقول في بيتي هَذَا:اللّٰهُمَّ مَنْ وَلِيَ مِنْ أَمْرِ أُمَّتِي شَيْئاً، فَشَقَّ عَلَيْهِمْ؛ فاشْقُقْ عَلَيْهِ.وَمَنْ وَلِيَ مِنْ أَمْرِ أُمَّتِي شَيْئاً،فَرَفَقَ بِهِمْ؛ فَارفُقْ بِهِ.** (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے نبی ٔکریم (ﷺ) کو میرے اس مکان اور حجرہ میں فرماتے ہوئے سنا:اے اللہ!جو آدمی میری امت کی کسی کام کا ذمہ دار ہوا (یعنی کوئی حکمرانی اورذمہ داری اس کے سرآئی)اوراس نے (بجائےراحت اور نرمی کرنے کے) ان کے اوپر بلاوجہ سختی کی اوران کو مشقت میں ڈالا؛تواے اللہ!تو بھی اس کو مشقت میں ڈال۔اورجو میری امت کے کسی کام کا ذمہ دار ہوا اور

اس کو حکمرانی کا منصب ملا پھر اس نے ان کے ساتھ نرمی برتی؛تو اے اللہ! تو بھی اس کے ساتھ نرمی کا معاملہ کر۔

افادات:- نرمی کا مطلب یہ ہے کہ جہاں شریعت نے نرمی کا حکم دیا ہے وہاں نرمی اختیار کی جائے۔ورنہ جہاں شریعت کے قانون کو نافذ کرنے کے معاملہ میں سختی اختیار کرنی پڑے ؛تو وہاں تو سختی سے کام لینا ہی ضروری ہے۔یہاں سختی کا مطلب یہ ہے کہ بلاوجہ لوگوں کو مشقت میں ڈالنا، جیسا کہ بعضوں کو عادت ہوتی ہے کہ اس کو مارا اس کو پھٹکارا،اس کو کچھ کر دیا؛ ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ایک تو قانون کو نافذ کرنا ہوتا ہے ، وہاں تو شریعت کا قانون نافذ کیا جائے گا؛اوراس کا نام سختی نہیں ہے۔

خرد کا نام جنوں رکھ دیا...:

آج لوگوں نے سختی اور نرمی کی تعریف اور اصطلاحات بھی بدل ڈالی ہیں، اور سختی و نرمی کے لیے پیمانے بھی بدل دیئے ہیں۔اگر کوئی باپ اپنی اولاد کی صحیح تربیت کے معاملہ میں ذرا سختی کرتا ہے، جیسے: صبح جلدی اٹھتا ہے، بچہ کو اپنے ساتھ نماز پڑھنے کے لیے مسجد لے جاتا ہے،تو لوگ کہتے ہیں کہ یہ بڑا سخت ہے،بچہ تو ابھی بیچارہ دس بارہ سال کا ہے،اس کو سونے نہیں دیتا، صبح جلدی اٹھا کر ظلم کرتا ہے۔حالاں کہ سات سال کی عمر میں تو شریعت نے بھی نماز کے لیے کہنے کا حکم دیا ہے، اور یہ بچہ تو بارہ سال کا ہوا ، اس کو بھی باپ تاکید کرے تو لوگ ایسا کہتے ہیں کہ

باپ بڑا سخت ہے،حالاں کہ اس کا نام سختی نہیں ہے،بلکہ باپ اگر اس کو نہیں کہے گا تو گنہگار ہو گا۔اسی طریقہ سے بیٹا اگر ٹی وی دیکھ رہا ہے اور باپ روک رہا ہے ،تو لوگ کہتے ہیں کہ باپ بڑا سخت ہے،اگر نہ روکے تو اس کا نام نرمی ہے،حالاں کہ یہ نرمی نہیں ہے،بلکہ بدخواہی ہے۔

حاکموں سے کئے ہوئے عہد کو پورا کرو:

حدیث ٦٥٦:-

وعن أبي هريرة رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رسولُ اللهِ (ﷺ) :كَانَتْ بَنُو إِسرَائِيلَ تَسُوسُهُم الأَنبِيَاء، كُلَّمَا هَلَكَ نَبِيٌّ خَلَفَهُ نَبِيٌّ، وَإِنَّهُ لاَ نَبِيَّ بَعْدِي، وَ سَيكُونُ بَعْدِي خُلفَاءُ فَيَكثُرُونَ. قالوا : يَا رسول الله، فَمَا تَأْمُرُنَا ؟ قَالَ : أَوْفُوا بِبَيْعَةِ الأَوَّلِ فَالأَوَّل، ثُمَّ أَعْطُوهُمْ حَقَّهُمْ، وَاسْأَلُوا اللهَ الَّذِي لَكُمْ، فَإِنَّ اللهَ سَائِلُهُمْ عَمَّا اسْتَرْعَاهُمْ

(متفقٌ عليه).

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: بنو اسرائیل کی سرداری ان کے انبیاء کرتے تھے(یعنی ان کے ہاتھ میں حکومت ہوتی تھی) جب ایک نبی کا انتقال ہوتا تھا تو اس کی جگہ پر دوسرا نبی اس کا جانشین بنتا تھا،لیکن میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے، اس لیے میرے بعد خلفاء ہوں گے اور وہ زیادہ ہوں گے(اس لیے کہ جب تک دنیا قائم ہے یہ سلسلہ جاری رہے گا)صحابہ نے عرض کیا:اے اللہ کے رسول!آپ ان کے سلسلہ میں ہمیں کیا حکم دیتے ہیں؟ (یعنی بعد میں جو لوگ آئیں گے اور جن کے ہاتھ میں حکومت کی باگ ڈور ہوگی،ان کے ساتھ ہم کیا معاملہ کریں ؟)

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ نے فرمایا: پہلے جس کے ہاتھ پر بیعت لی گئی اس کے عہد و پیمان کو پورا کرو اور اس کا حق ادا کرو، اور تمہارا جو حق ان کے اوپر ہے وہ اللہ تعالیٰ سے مانگو، اس لئے کہ اگر وہ کچھ کمی کوتاہی کر رہے ہیں، اور حق نہیں دیتے تو اللہ تعالیٰ ان سے پوچھے گا۔

افادات:- بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ کسی کے ہاتھ پر حکمرانی کی بیعت لی گئی اور اس کو حاکم مقرر کیا گیا، پھر دوسرا آدمی اس کے اوپر زبردستی بزورِ قوت چڑھ بیٹھتا ہے اور اس کے پاس سے حکومت چھین کر لوگوں سے بیعت لینا شروع کر دیتا ہے۔ اس لئے فرمایا کہ جس کے ہاتھ پر پہلے بیعت کی گئی تھی اور اس کے ساتھ تم نے جو عہد و پیمان کیا تھا: اس کو پورا کرو، اس لیے کہ اسلام دوسروں کو اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ پہلے حکمران کو ہٹا کر اس کی جگہ پر آ جائیں، اس لیے تم نے پہلے کے ہاتھ پر بیعت کے وقت جو عہد و پیمان کیا تھا اور وفاداری کا وعدہ کیا تھا: اس کو پورا کرو اور اس کا حق ادا کرو۔

جہاں کہیں فتنے رونما ہوتے ہیں:

اور اگر وہ تمہارے حقوق کی ادائیگی میں کچھ کوتاہی کرتے ہیں، تو اس کو لینے کے لیے تلوار مت نکالو اور لڑنے کے لیے میدان میں مت آ جاؤ، اس لیے کہ سارے فتنوں کی جڑ یہی ہے، بلکہ تمہارا جو حق ان کے اوپر ہے وہ اللہ تعالیٰ سے مانگو۔

کتاب الفتن میں بھی محدثین ان روایتوں کو خاص طور پر لاتے ہیں، اس لیے کہ جب بھی کہیں فتنے ہوتے ہیں اسی بنیاد پر ہوتے ہیں۔ ذمہ دار کی طرف سے بلاوجہ سختی ہوئی جس کی وجہ سے رعیت میں اشتعال پیدا ہوا۔ یا ذمہ دار نے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی کی، تو رعیت کی طرف سے مطالبہ ہوا۔ یا رعیت نے ذمہ دار کے حقوق کی ادائیگی اور اطاعت وفرمانبرداری میں کوتاہی کی جس کے نتیجہ میں اس نے سخت نوٹس لیا اور ٹکراؤ پیدا ہوا۔ جہاں کہیں بھی فتنے رونما ہوتے ہیں، چاہے وہ گھر کا فتنہ ہو، میاں بیوی کا مسئلہ ہو، فیکٹری کا فتنہ ہو، سیٹھ نوکر کا مسئلہ ہو، یا علاقہ کا ہو، حکمران اور پبلک کا مسئلہ ہو، جہاں کہیں کوئی بھی جھگڑا ہوتا ہے اگر آپ اس کی بنیاد دیکھیں گے تو یہی ہوگی کہ یا تو اس کے اوپر جو ذمہ داری ہے وہ ادا نہیں کرتا ہے، یا دوسرا مطالبہ کرتا ہے، حالاں کہ شریعت یہ کہتی ہے کہ اگر وہ تمہارے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی کرے تو تم اس سے مت مانگو، بلکہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرو۔ اس لئے کہ اگر وہ کچھ کمی کوتاہی کر رہے ہیں، اور حق نہیں دیتے تو اللہ تعالیٰ ان سے پوچھے گا۔

آج کل کی سب سے بڑی گڑبڑ:

آج کل تو معاملہ یہ ہوگیا ہے کہ ہم لوگوں کے سارے حساب وکتاب دنیا ہی میں کرنا چاہتے ہیں۔ اگر کسی رشتہ دار نے کچھ اچھا سلوک نہیں کیا، تو ہم اس سے یہیں نمٹ لینا چاہتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے یہاں کے لئے باقی چھوڑنا ہی نہیں چاہتے، یوں سمجھتے ہیں گویا میدانِ حشر میں کچھ

ہونے والا ہی نہیں ہے، یہاں ہم ہی سب نمٹا دیں۔ کسی نے گالی دی تو صبر سے کام نہیں لیتے اور کہتے ہیں کہ اب میں تجھے بتاتا ہوں۔ حالاں کہ ہونا یہ چاہیے کہ ہم اپنے کام میں لگے رہیں۔ اگر ہم یوں سوچیں کہ اس نے یہ کیا، فلاں نے وہ کیا، اس سے بدلہ لینا ہے، فلاں سے انتقام لینا ہے، فلاں نے ایسا کیا تو اس کے ساتھ ایسا معاملہ کیا جائے؛ اگر ہم یہی سب کرتے رہیں تو پھر اپنی ذمہ داریاں کہاں ادا کریں گے۔ آج کل ہر جگہ جو گڑبڑیاں ہو رہی ہیں اس کی وجہ یہی ہے۔ ہر ایک کا یہ حال ہو گیا ہے، سب ہی یہ سوچتے ہیں کہ جو ذمہ دارِ اعلیٰ ہے وہ ایسا کرے، استاذ کو یوں کرنا چاہیے، اس نے ایسا کیوں کیا، فلاں نے ایسا کیوں کیا۔ مطلب یہ ہے کہ سب کی پڑی ہوئی ہے، اگر نہیں پڑی ہے تو اپنی نہیں پڑی ہے۔ اپنے اوپر جو ذمہ داریاں ہیں اس کی ادائیگی کا اہتمام نہیں ہے، پھر اگر کسی نے ذرا سا کوئی معاملہ کیا تو فوراً ٹکراؤ کی شکلیں پیدا ہو جاتی ہیں۔

وہاں دیر تو ہے، اندھیر نہیں:

بیوی کا حق اگر شوہر نے ادا نہیں کیا تو بیوی کو چاہیے کہ وہ اس کا حق ادا کرتی رہے، اور اپنے حق کے متعلق اللہ تعالیٰ سے دعا کرتی رہے کہ: اے اللہ! میرے شوہر کو توفیق دے کہ وہ میرا حق ادا کرے۔ اگر وہ کوتاہی کر رہا ہے تو اللہ تعالیٰ کے یہاں سوال ہونے والا ہے، وہاں دیر تو ہے، اندھیر نہیں۔ اس کے عدل وانصاف کا تقاضہ یہی ہے کہ ہر ایک سے پوچھا جائے اور اس کا ظہور قیامت کے روز اس طرح ہوگا کہ اگر سینگ والی بکری نے بغیر سینگ والی بکری کو مارا ہے،

تو اللہ تعالیٰ سینگ والی کا سینگ چھین کر بغیر سینگ والی بکری کو سینگ دیں گے اور کہیں گے کہ اس کو مارلو،حالاں کہ بکری جانور ہے اور جانوروں کے لیے شریعت نہیں آئی ہے ،شریعت کے احکام تو ہم انسانوں کے لیے ہیں ،لیکن پھر بھی وہاں عدل وانصاف اس طرح ہو گا۔ اسی لیے ہمیں خاص طور پر یہ تعلیم دی گئی ہے۔

آج کل عام طور پر جو فتنے ہو رہے ہیں اس کی بڑی وجہ یہی ہے،لہٰذا اس بات کا اہتمام ہو کہ ہم پر جو حقوق عائد ہوتے ہیں ان کو ادا کریں ، اور ہمارے حقوق کی ادائیگی میں سامنے والے کی طرف سے اگر کوتاہی ہو رہی ہے تو اگر عافیت کے ساتھ بغیر لڑائی جھگڑے کے مل جاتے ہیں؛ تب تو ٹھیک ہے؛ ورنہ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں۔

بدترین ذمہ دار کی نشانی:

حدیث ۶۵۷:-

وعن عائِذِ بن عمرو رضی اللہ عنہ أَنَّهُ دَخَلَ عَلَى عُبَيْدِ اللهِ بن زيادٍ، فَقَالَ لَهُ: أَيْ بُنَيَّ! إِنِّي سَمِعْتُ رسولَ اللهِ صلی اللہ علیہ يقول: إِنَّ شَرَّ الرِّعَاءِ الحُطَمَةُ. فإِيَّاكَ أَن تَكُونَ مِنْهُمْ. (متفقٌ عَلَيْهِ.)

ترجمہ:- حضرت عائذ بن عمرو رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ عبید اللہ بن زیاد کے یہاں تشریف لے گئے اور (عبید اللہ بن زیاد؛ خلافتِ بنوامیہ کے زمانہ میں کوفہ کا گورنر تھا)اس سے کہا: اے میرے بیٹے!

میں نے نبیؐ کریم (ﷺ) کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ بدترین ذمہ داروہ ہے جو سخت دل اور سخت مزاج ہو، اس لئے تو ایسا بدترین حکمران مت بنیو۔

ایسے حاکم کی طرف اللہ تعالیٰ توجہ نہیں فرمائیں گے:

حدیث ٦٥٨:-

وعن أبي مريم الأزدِيِّ رضی اللہ عنہ **أنّه قَالَ لِمعاوية** رضی اللہ عنہ **: سَمِعْتُ رسول الله** (ﷺ) **يقول: مَنْ وَلاَّهُ اللهُ شَيْئاً مِنْ أُمُورِ المُسْلِمِينَ، فَاحْتَجَبَ دُونَ حَاجَتِهِمْ وَخَلَّتِهِمْ وَفَقْرِهِمْ، احْتَجَبَ اللهُ دُونَ حَاجَتِهِ وَخَلَّتِهِ وَفَقْرِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ. فجعل معاوية رجلاً عَلَى حوائج النَّاسِ.** (رواه أبو داود والترمذي.)

ترجمہ مع تشریح:- حضرت ابومریم أزدی رضی اللہ عنہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے کہا- چوں کہ وہ امیرالمؤمنین تھے- کہ میں نے نبیؐ کریم (ﷺ) کو فرماتے ہوئے سنا ہے: جس آدمی کو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے معاملات کا ذمہ دار بنایا (یعنی کسی بھی طرح کی حکمرانی عطا فرمائی) پھر اس نے رکاوٹ اختیار کی اور لوگوں کی حاجت سے اپنے آپ کو چھپائے رکھا، ان کی حاجتیں پوری کرنے کے لیے باہر نہیں آیا، اور نہ کسی کو اپنے تک آنے دیا (یعنی باہر پہرے دار بٹھا رکھے، لوگ تو چاہتے ہیں کہ اپنی حاجتیں لے کر اس کے پاس جائیں لیکن وہاں اجازت ہی نہیں ملتی، اور وہ ان کی ضرورتوں اور ان کے فقر کی طرف توجہ نہیں کرتا) تو قیامت کے روز اللہ تبارک وتعالیٰ اس کی حاجت کے درمیان رکاوٹ بنیں گے اور اس کی طرف توجہ نہیں فرمائیں گے (جیسا گناہ کیا تھا قیامت کے روز اللہ تبارک و تعالیٰ کی

طرف سے ویسی ہی سزا دی جائے گی)چناں چہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے جب یہ حدیث سنی تو اس بات کا اہتمام کیا کہ لوگوں کی حاجتوں کے لیے باقاعدہ ایک آدمی مقرر کیا(جو لوگوں کی حاجتوں کی تحقیق کرتا رہے اور ان تک پہنچائے۔یعنی لوگوں کو خود بھی آنے کی ضرورت نہیں ،ان کا آدمی خود ہی جا کر تحقیق کرے اور آ کر بتلائے،تا کہ وہ ان کی ضرورتیں پوری کر سکیں)

الوالی العادل

انصاف سے پیش آنے والا حکمران

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وَأَقْسِطُوا إِنَّ اللهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ

باب کا عنوان:

پچھلی مجلس میں بتلایا تھا کہ جو لوگ حکمران اور صاحبِ اختیار ہیں، جن کے پاس پاور س ہیں، وہ اپنی رعایا کے ساتھ کس طرح کا معاملہ کریں، اس کی تفصیل آچکی تھی۔ آج باب قائم کیا ہے: "اَلْوَالِي الْعَادِلُ" وہ حکمران جو اپنی رعایا کے ساتھ انصاف سے پیش آتا ہو، اس کو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے کیسا اجر و ثواب ملے گا، اور اس کا اللہ تعالیٰ کے یہاں کیا مقام ہے۔

میں پہلے بھی بتلا چکا ہوں کہ ہر وہ معاملہ جس کا تعلق دو گروہ اور دو جماعتوں سے ہوتا ہے تو شریعت کی طرف سے دونوں میں سے ہر ایک جماعت کو اس کے مناسب ہدایتیں دی جاتی ہیں، اگر دونوں جماعتیں شریعت کی طرف سے دی گئی ہدایتوں پر عمل کا اہتمام کرتی ہیں؛ تب تو پھر چین ہی چین اور اطمینان ہی اطمینان رہتا ہے۔ اور اگر کوئی ایک جماعت بھی شریعت کی طرف سے بتلائی گئی ان ہدایتوں پر عمل کرتی ہے، تب بھی کوئی فتنہ اور فساد نہیں ہوتا۔ ہاں! اگر دونوں ہی اللہ تعالیٰ کے احکام توڑنے پر تل جائیں اور دونوں میں سے کوئی بھی کسی کا حق ادا کرنے کے لیے تیار نہ ہو؛ تو پھر لڑائی ہوتی ہے۔

یہاں ایسے حکمران کا بیان کیا جارہاہے جو عدل وانصاف سے پیش آتا ہو۔پہلی آیت پیش کی ہے:﴿إِنَّ اللهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ﴾ اللہ تعالیٰ انصاف اور بھلائی کرنے کا حکم دیتاہے کہ ہر ایک کا حق پوراپوراادا کیاجائے۔اس آیت کی تفصیل گزشتہ مجلس میں عرض کرچکاہوں۔

دشمنوں کے معاملہ میں بھی انصاف:

﴿وَأَقْسِطُوا إِنَّ اللهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ﴾ انصاف کرو؛بیشک اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتاہے۔بلکہ قرآنِ کریم میں تو یہاں تک تاکید کی گئی ہے: ﴿وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَى أَنْ لَّا تَعْدِلُوا، إِعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَى﴾ کسی جماعت کی شناعت اوربرائی تم کواس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم انصاف کے تقاضوں کو چھوڑدو۔یعنی اگر کوئی آدمی آپ کے ساتھ ناانصافی سے پیش آتا ہے تب بھی شریعت آپ کو یہ حکم دیتی ہے کہ آپ اس کے ساتھ انصاف کامعاملہ کریں ؛یہی چیز تقویٰ سے زیادہ قریب ہے۔دشمنوں کے معاملہ میں بھی شریعت نے انصاف کے تقاضوں کو پکڑے رہنے کاحکم دیاہے۔

سایہ دارسات گروہ...پہلا گروہ:

حدیث ۶۵۹ :-

وعن أبي هريرة رضی اللہ عنہ عن النبی (ﷺ) قال: سَبْعَةٌ يُظِلُّهُمُ اللهُ فِی ظِلِّهِ يَوْمَ لاَ ظِلَّ إِلاَّ ظِلُّهُ: إِمَامٌ عادِلٌ. وَشَابٌّ نَشَأَ فِی عِبادةِ اللهِ تَعَالَی. وَرَجُلٌ قَلْبُهُ مُعَلَّقٌ فِی الْمَسَاجِدِ. وَرَجُلاَنِ تَحَابَّا فِی اللهِ، اجْتَمَعَا عَلَيْهِ، وَتَفَرَّقَا عَلَيْهِ. وَرَجُلٌ دَعَتْهُ امْرَأَةٌ ذَاتُ مَنْصِبٍ وجَمالٍ، فَقَالَ: إِنِّی أَخافُ اللهَ. وَرَجُلٌ تَصَدَّقَ بِصَدَقَةٍ فَأَخْفَاهَا حَتَّى لاَ تَعْلَمَ شِمَالُهُ مَا تُنْفِقُ يَمِينُهُ. وَرَجُلٌ ذَكَرَ اللهَ خَالِياً فَفَاضَتْ عَيْنَاهُ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نبیِ کریم (ﷺ) کا ارشاد نقل فرماتے ہیں: سات آدمی ایسے ہیں جن کو اللہ تبارک وتعالیٰ قیامت کے روز میدانِ حشر میں اپنے سائے میں جگہ دیں گے جبکہ اللہ کے سائے کے علاوہ کوئی سایہ نہیں ہوگا:-

۱: انصاف کرنے والا حاکم۔

۲: وہ نوجوان جس نے اللہ تعالیٰ کی عبادت میں پرورش پائی۔

۳: وہ آدمی جس کا دل مسجد میں اٹکا ہوا ہو۔

۴: ایسے دو آدمی جنہوں نے آپس میں اللہ کے واسطے اور اللہ کی نسبت پر محبت کی ہو۔ اللہ کی نسبت پر ہی آپس میں ملے، اور اسی نسبت پر جدا ہوئے۔

۵: وہ آدمی جسے اونچے منصب وخاندان والی خوبصورت عورت زناکاری و بدکاری کے لیے دعوت دے، لیکن وہ جواب میں کہے: میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہوں۔

۶ : وہ آدمی جس نے کوئی صدقہ ایساچھپا کر کیا کہ اس کے بائیں ہاتھ کو بھی پتہ نہیں چلا کہ اس کے دائیں ہاتھ نے کیا خرچ کیا۔

۷ : وہ آدمی جو تنہائی میں اللہ تعالیٰ کو یاد کرے اور اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔

افادات:-سات آدمیوں سے مراد مخصوص شخصیتیں نہیں ہیں ،بلکہ پوری جنس مراد ہے، جیسے: "إِمَامٌ عادِلٌ" انصاف کرنے والے حاکم کا تذکرہ ہے، تو یہ کسی ایک شخصیت کا نام نہیں ہے،بلکہ جب سے شریعتِ مطہرہ جاری ہوئی ہے تب سے قیامت تک جو بھی آدمی عدل وانصاف کے ساتھ حکمرانی کرے گا،وہ سب اس میں آجائیں گے۔

اس باب میں یہ روایت اسی مناسبت سے لائے ہیں کہ وہ حکمران جس کے ہاتھ میں اختیارات ہیں ،اورپہلے بتلاچکاہوں کہ اختیارات کی نوعیتیں مختلف ہوتی ہیں ، ایک توحاکمِ اعلیٰ اور بادشاہِ وقت ہوتاہے جوسب سے اوپرہوتاہے اور اس کی ماتحتی میں مختلف علاقوں اورصوبوں کے حاکم ہوتے ہیں ،پھران صوبوں کے جو حصے ہیں ، مثلاً: ضلع اورضلعوں میں تحصیلیں، یہاں تک کہ گھر کاجو سربراہ ہوتاہے وہ بھی اس گھر کاحاکم کہلاتا ہے،وہ بھی شریعت کی طرف سے اس بات کاپابندہے کہ اپنے ماتحتوں کے معاملہ میں عدل وانصاف سے کام لے،ناانصافی کا برتاؤنہ کرے۔توپہلا گروہ ہوا "إِمَامٌ عادِلٌ" انصاف کرنے والا حکمران۔

دوسرا گروہ:

"وَشَابٌ نَشَأَ فِيْ عِبَادَةِ اللهِ تَعَالَى" وہ نوجوان جس نے اللہ تعالیٰ کی عبادت میں پرورش پائی، یعنی اس کی جوانی اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری میں گزری ہو۔ کیوں کہ عام طور پر جوانی میں نفس کے تقاضے اور خواہشات عروج و شباب پر ہوتی ہیں، وہی آدمی کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی طرف لے جاتی ہیں ،اس لیے جو نوجوان ایسے حالات میں بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری اوراس کی عبادت میں اپنے اوقات کو گزارتا ہو، تو اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کی بڑی قدروقیمت ہے۔

تیسرا گروہ:

"وَرَجُلٌ قَلْبُهُ مُعَلَّقٌ فِى الْمَسَاجِدِ" وہ آدمی جس کا دل مسجد میں اٹکا ہوا ہو۔ مطلب یہ ہے کہ ایک نماز کی ادائیگی سے فارغ ہوکر گھر، کاروبار، دوکان یا فیکٹری پر آیا اوراپنے کام میں تو لگا، لیکن اس کا دل مسجد میں اٹکا ہوا ہے کہ دوسری نماز کا وقت آنے والا ہے، مَیں بروقت کیسے مسجد پہنچوں اوراس نماز کو شریعت کے بتلائے ہوئے صحیح طریقہ سے ادا کروں۔ تو اگرچہ وہ اپنے کاروبار کو بھی انجام دیتا ہے، اپنی دوسری ذمہ داریاں بھی پوری کرتا ہے لیکن اس کا دل اللہ تعالیٰ کے ساتھ مسجد میں لگا ہوا ہے، اللہ تعالیٰ کے فریضہ کی ادائیگی کی طرف متوجہ ہے۔

چوتھا گروہ:

"وَرَجُلانِ تَحَابَّا فِی اللہِ اجتَمَعَا عَلَیْہِ، وَتَفَرَّقَا عَلَیْہِ"، ایسے دو آدمی جنھوں نے آپس میں اللہ کے واسطے اور اللہ کی نسبت پر محبت کی ہو۔ آپس میں ملے تو اللہ ہی کی نسبت پر، اور جدا ہوئے تب بھی اسی نسبت پر۔ اس لیے کہ کچھ ملاقاتیں اور تعلقات وہ ہوتے ہیں جو آدمی اپنی ذاتی اغراض کے پیشِ نظر قائم کرتا ہے۔ اور کچھ تعلقات وہ ہوتے ہیں جو اللہ کی نسبت پر ہوتے ہیں، اس میں کوئی اپنی ذاتی غرض شامل نہیں ہوتی، وہ ملاقات دین کی اور اللہ کی نسبت سے ہوتی ہے۔ اپنی ذاتی غرض کے لیے تو سب ہی تعلق و محبت کرتے ہیں، لیکن اللہ کی خاطر ایک دوسرے سے محبت اور تعلق رکھنا، اسی بنیاد پر ملنا اور اسی بنیاد پر جدا بھی ہونا؛ ایسے دو آدمیوں کی اللہ تعالیٰ کے یہاں بڑی قدر و قیمت ہے، اور قیامت کے روز اللہ تبارک و تعالیٰ ایسوں کو اپنے سائے میں جگہ دیں گے۔

پانچواں گروہ:

"وَرَجُلٌ دَعَتْہُ امْرَأَۃٌ ذاتُ مَنْصِبٍ وجَمالٍ، فَقَالَ: إنِّی أخافُ اللہَ"، وہ آدمی جس نے اپنی خواہشات پر ایسا کنٹرول کیا ہے کہ ایسی عورت جو اونچے منصب و خاندان والی ہے اور خوبصورت بھی ہے، اس نے بدکاری کے لیے دعوت دی، تنہائی میں اپنی طرف آمادہ کیا، ایسے موقع پر آدمی عام طور پر اس میں مبتلا ہو جاتا ہے، لیکن وہ آدمی جواب میں کہتا ہے کہ مَیں اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہوں،

اس کے لیے اس حرکت سے باز رہنے کا ذریعہ صرف اللہ تعالیٰ کا خوف بنا؛تو قیامت کے روز ایسے آدمی کو بھی اللہ تعالیٰ اپنے سایہ میں جگہ دیں گے۔

چھٹا گروہ:

”وَرَجُلٌ تَصَدَّقَ بِصَدَقَةٍ فَأَخْفَاهَا حَتَّى لاَ تَعْلَمَ شِمَالُهُ مَا تُنْفِقُ يَمِينُهُ“ وہ آدمی جس نے کوئی صدقہ ایسا چھپاکر کیا کہ بائیں ہاتھ کو بھی پتہ نہیں چلا کہ دائیں ہاتھ نے کیا خرچ کیا۔اس لیے کہ صدقہ اگر کھل کر کیا جائے تو ہوسکتا ہے کہ اس میں مقصود نام آوری اور شہرت ہو،اس لیے ایسے چھپاکر دیا کہ گویا اس کے دائیں ہاتھ نے خرچ کیا لیکن اس کے بائیں ہاتھ کو بھی پتہ نہیں چلا۔آدمی کا اس طرح عمل کو انجام دینا انتہائی خلوص کی طرف اشارہ کرتا ہے،اس لیے اللہ تعالیٰ کے یہاں ایسا مقبول اور پسندیدہ ہوتا ہے کہ ایسے آدمی کو بھی قیامت کے روز اللہ تعالیٰ اپنا سایہ عطا کریں گے۔

ورنہ تو عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ لوگ کھل کر دینے ہی پر اکتفاء نہیں کرتے بلکہ بعد میں بھی ساری دنیا میں اعلانات کرتے پھرتے ہیں کہ مَیں نے اس کو اتنا دیا اور فلاں کو اتنا دیا۔ اور اگر خدانخواستہ اس کے چشم وابرو کا خیال رکھنے میں ذرا سی کوتاہی ہوئی تو پھر اس کی خیر نہیں ہوتی۔ اس لیے کہا گیا کہ یہ جو کچھ کررہا ہے خالص اللہ کے واسطے اور اللہ تعالیٰ سے اپنا اجر و ثواب حاصل کرنے کے لیے کررہا ہے؛اس لیے اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کی بڑی قدر ہے۔

ساتواں گروہ:

"وَرَجُلٌ ذَكَرَ اللهَ خَالِياً فَفَاضَتْ عَيْنَاهُ" وہ آدمی جو تنہائی میں اللہ کو یاد کرے اور اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ تنہائی میں اللہ کو یاد کرکے رونا، یہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ غایتِ تعلق اور انتہائی محبت اور اس کے خوف و خشیت کی علامت ہے، ایسے آدمی کو بھی اللہ تعالیٰ اپنے سائے میں جگہ دیں گے۔

تو یہ سات قسم کے آدمی ہیں، جن میں نمبر اول پر حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس حکمران اور صاحبِ اختیار کو شمار کرایا جو انصاف سے کام لے۔ اللہ تعالیٰ نے جس آدمی کو جہاں کہیں بھی کچھ اختیارات دیئے ہوں اور ان اختیارات کی نوعیت جیسی بھی ہو، وسیع پیمانے پر ہو، یا محدود طریقہ پر ہو، اپنے گھر میں ہو، اپنے خاندان میں ہو، اپنی برادری میں بڑا عہدہ اور بڑے اختیارات ملے ہوں، پوری جماعت اور برادری کی سربراہی ملی ہو، یا پورے علاقہ کا حاکم ہو، اور وہ اپنے اختیارات کے حدود اور دائرے میں عدل و انصاف سے کام لیتا ہو، تو ان شاء اللہ اس وعدے کا حقدار ہوگا اور یہ بشارت اس کو حاصل ہوگی۔ اسی طرح اپنے گھر میں اپنے ماتحتوں پر، بیوی بچوں پر اور دوسرے اہلِ خانہ پر جہاں اس کو اختیارات حاصل ہیں، اگر وہ انصاف سے کام لے گا تو اس کے حق میں بھی یہ بشارت پوری ہوگی۔

نور کے منبروں پر ہوں گے:

حدیث ۶۶۰:-

وعن عبدِاللهِ بن عَمرو بن العاص رضی اللہ عنہما قَالَ قَالَ رسولُ الله (ﷺ): إنَّ المُقْسِطِينَ عِنْدَ اللهِ عَلَى مَنَابِرَ مِنْ نُورٍ، الَّذِينَ يَعْدِلُونَ فِی حُكْمِهِمْ وأَهْلِيهِم وَمَا وَلُوا۔ (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: انصاف کرنے والے اللہ تعالیٰ کے یہاں نور کے منبروں پر ہوں گے، جو اپنے فیصلوں اور اپنے گھر والوں کے معاملہ میں اور جن لوگوں کے اوپر ان کو جو اختیارات دیئے گئے ہیں ان اختیارات کو استعمال کرنے کے معاملہ میں عدل وانصاف سے کام لیتے ہیں۔

افادات:- قیامت کے روز اللہ تبارک وتعالیٰ ان کو نور کی کرسیوں اور نور کے منبروں پر بٹھائیں گے، یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ان کا اعزاز واکرام ہوگا۔ انصاف کرنے والے کون ہیں؟ جو اپنے فیصلوں اور اپنے گھر والوں کے معاملہ میں اور جن لوگوں کے اوپر اس کو حاکم بنایا گیا ہے اور اختیارات دیئے گئے ہیں ان اختیارات کو استعمال کرنے کے معاملہ میں عدل و انصاف سے کام لیتے ہیں، یعنی بلاوجہ کسی کی جانبداری سے، ظلم وزیادتی اور کسی کو ترجیح دینے سے کام نہیں لیتے، بلکہ انصاف کے تقاضوں کو پورا کرتے ہیں، اور ماتحتوں کے حقوق کو پورا پورا ادا

کرتے ہیں، ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن نور کے منبروں پر بٹھائیں گے۔ اور جو ان تقاضوں کو پورا نہیں کریں گے ،ان کے لیے یہ بشارت نہیں ہے۔

بہترین اور بدترین حکمرانوں کی علامت:

حدیث ۶۶۱ :-

عن عوف بن مالك رضی اللہ عنہ قال سمعتُ رسولَ اللهِ (ﷺ) يقول: خِيَارُ أَئِمَّتِكُمُ الَّذِينَ تُحِبُّونَهُمْ وَيُحِبُّونَكُمْ، وَتُصَلُّونَ عَلَيْهِمْ وَيُصَلُّونَ عَلَيْكُمْ . وشِرَارُ أَئِمَّتِكُم الَّذِينَ تُبْغِضُونَهُمْ وَيُبْغِضُونَكُمْ ، وَتَلعَنُونَهُمْ وَيَلْعَنُونَكُمْ !، قَالَ: قُلْنَا: يَارسول اللهِ! أَفَلاَ نُنَابِذُهم ؟ قَالَ: لاَ ،مَا أَقَامُوا فِيكُمُ الصَّلاَةَ. لاَ ،مَا أَقَامُوا فِيكُمُ الصَّلاَةَ. (رواه مسلم)

قَوْله: ((تصلّون عَلَيْهِمْ)): تدعون لَهُمْ.

ترجمہ:۔حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم (ﷺ) کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: تمہارے حکمرانوں میں بہترین لوگ وہ ہیں جن سے تم محبت کرو، اور جو تم سے محبت کریں، ان کے لیے تم دعائیں کرو اور وہ تمہارے لیے دعائیں کریں۔ اور تمہارے حکمرانوں میں بدترین حکمران وہ ہیں کہ تم ان سے دل میں عداوت رکھو، اور وہ تم سے عداوت رکھیں تم ان پر لعنت بھیجو، اور وہ تم پر لعنت بھیجیں ،وہ تم کو برا کہیں اور تم ان کو برا کہو۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یارسول اللہ! ایسے حکمرانوں کی اطاعت کا پھندا کیا ہم اپنی گردنوں سے اتار نہ دیں ؟ آپ (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: نہیں! جب تک کہ وہ

تمہارے درمیان نماز کو قائم کرتے رہیں۔ نہیں ! جب تک کہ وہ تمہارے درمیان نماز کو قائم کرتے رہیں (وہاں تک ان کو پھینک مت دیجیو۔)

افادات:- دیکھو! آج دنیا کا حال کیا ہے؟ آج کل ہر گھر میں یہی مصیبت ہے۔اس لیے اپنے گھر والوں میں بھی کون بہترین آدمی ہے اور کون نہیں؛ اس کا اِس سے اچھا کوئی معیار نہیں ہے۔ آدمی اپنے متعلق یہ سمجھنا چاہتا ہو کہ میرا تعلق اپنے ماتحتوں کے ساتھ کیسا ہے؟ تو نبی کریم (ﷺ) نے اس کا بہترین معیار بتلایا کہ وہ آپ سے محبت کرتے ہیں اور آپ ان سے محبت کرتے ہو۔وہ آپ کے لیے دعا کرتے ہیں اور آپ ان کے لیے دعا کرتے ہو۔وہ آپ کے لیے بے چین ہو جاتے ہیں اور آپ ان کے لیے بے چین ہو جاتے ہو؛ یہ "خِيَارُ أَئِمَّتِكُمْ" بہترین حکمران کی علامت ہے۔ اس لیے اگر آپ کو بھی معلوم کرنا ہے کہ اپنے ماتحتوں کے درمیان میں آپ کا معاملہ کیسا ہے؟ آپ کو جو اختیارات دیئے گئے ہیں ان کے استعمال میں آپ صحیح ہیں یا غلط ؟ تو دیکھ لو کہ آپ کے ماتحت آپ سے محبت کرتے ہیں اور آپ بھی ان کے ساتھ محبت کرتے ہو؟ آپ ان کو دل سے چاہتے ہو اور وہ بھی آپ کو دل سے چاہتے ہیں؟ آپ ان کے لیے دل سے دعائیں کرتے ہو اور وہ بھی آپ کے لیے دل سے دعائیں کرتے ہیں؟ اگر آپ کو ذرا سی گزند پہنچے تو وہ بے چین ہو جاتے ہیں اور رونے لگتے ہیں آپ کے لیے دعائیں کرنے لگتے ہیں ،اور اگر ان کو کچھ ہو جائے تو آپ بے چین ہو جاتے ہو،ان کے لیے آپ دعائیں کرنے لگ جاتے ہو، وہ آپ سے ٹوٹ کر محبت کرتے ہیں اور آپ بھی ان سے محبت رکھتے ہو؟ اگر ایسا ہے تب تو سمجھ جاؤ کہ معاملہ

برابر ہے۔ اور اگر ایسا نہیں ہے، تو سیدھی بات ہے کہ معاملہ الٹا ہے۔ ویسے تو ہر آدمی اپنے طور پر یہی دعویٰ کرتا ہے کہ میرا معاملہ برابر ہے، اپنے آپ کو کون غلط کہتا ہے، لیکن حضور اکرم (ﷺ) نے اس کی یہ علامت بتلادی۔

نظام سلطنت کے بقاء کی اہمیت:

جب حضورِ اکرم (ﷺ) نے بدترین حکمرانوں کی یہ علامت بتلائی کہ تم ان سے بغض رکھو، وہ تم سے بغض رکھیں، تم ان سے دشمناوٹ رکھو، وہ تم سے دشمناوٹ رکھیں، تم ان کو برا بھلا کہو اور لعنت ملامت کرو، اور وہ تم کو برا بھلا کہیں، تم پر لعنت ملامت کریں، تم ان کے لیے بددعائیں کرو اور وہ تمہارے لیے بدعائیں کریں، تو صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے عرض کیا: یارسول اللہ! کیا ایسے حکمرانوں کی اطاعت کا پھندا ہم اپنی گردنوں سے اتار نہ دیں؟ یعنی جو حکمران ایسے ہوں تو ان کی بات ماننے کی کیا ضرورت ہے، ان کو گولی مارو؛ ہم ان سے بغاوت نہ کرلیں؟ تو آپ (ﷺ) نے ایسا کرنے سے منع فرمایا۔

دیکھو! شریعت نظام کو باقی رکھنے کا کتنا اہتمام کرتی ہے! ان کی علامت تو بتلائی گئی، لیکن اس کے باوجود آگے کہہ رہے ہیں کہ ان کی اطاعت کی جو ذمہ داری تم پر عائد ہوتی ہے، اس سے آپ اپنے آپ کو نکال نہیں سکتے، جب تک کہ وہ تمہارے درمیان نماز کو قائم کرتے رہیں وہاں تک ان کو پھینک مت دیجیو۔ یعنی یہ حکمران جب تک تھوڑا بہت بھی دین کو قائم کررہے

ہیں، نمازیں قائم کررہے ہیں ،ظاہری طورپر دین پر ہیں ،توپھران سے ان کی اطاعت کا جو عہدوپیمان آپ نے کیاہے اس کو چھوڑ نہیں سکتے۔ ہاں!اگر وہ کفرمیں مبتلاہوجائیں ،بلکہ بعض روایتوں میں یہاں تک ہے: "إِلَّاأَنْ تَرَوْا كُفْراً بَوَاحاًعِنْدَكُمْ مِنَ اللهِ فِيهِ بُرْهَانٌ"(بخاری.باب قَوْلِ النَّبِيِّ(ﷺ) سَتَرَوْنَ بَعْدِي أُمُورًا تُنْكِرُونَهَا.حديث رقم : ٧٠٥٦)جب کھلم کھلا کفرکرنے لگیں ،اور بالکل اسلام سے ہٹ جائیں تو پھر تمہارے اوپر ان کی اطاعت کی کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔شریعت نے حکمرانوں کی زیادتیوں کے باوجودان کی اطاعت سے نکلنے کی اجازت نہیں دی۔

یہی معاملہ گھرکے ذمہ دارکا ہے کہ اگرگھرکے بڑے کی طرف سے زیادتی ہورہی ہے تو شریعت یہ ضرورکہے گی کہ وہ غلطی پر ہے،اور اس کی علامتیں بھی بتلادیں ، لیکن اس کے باوجود آپ کویہ اجازت نہیں دی جائے گی کہ آپ ان کی اطاعت سے نکل جائیں ، آپ کوتوہرحال میں ان کی اطاعت کرتے رہنا ہے۔

تین جنتی:

حدیث ٦٦٢:-

وعن عِياضِ بن حِمارٍ رضی اللہ عنہ قَالَ سَمِعْتُ رسولَ الله (ﷺ) يقول: أَهْلُ الْجَنَّةِ ثَلَاثَةٌ: ذُوسُلْطَانٍ مُقْسِطٌ مُوَفَّقٌ، وَرَجُلٌ رَحِيمٌ رَقِيقُ الْقَلْبِ لِكُلِّ ذِى قُرْبَى وَمُسْلِمٍ ، وعَفِيفٌ مُتَعَفِّفٌ ذو عِيالٍ. (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت عیاض بن حمار رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبیٔ کریم (ﷺ) کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: جنت والے تین ہیں ؛ایک تو وہ حکمران جس کے پاس پاور ہے پھر بھی وہ انصاف کرنے والا ہے، اور اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھلائی کی توفیق دی گئی ہے۔دوسرا وہ آدمی جو ہر رشتہ دار اور مسلمان کے لیے مہربان اور نرم دل ہے۔اور تیسرا وہ بال بچے والا جو اپنے آپ کو سوال کے تقاضوں سے بچاتا ہو۔

افادات:- بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ دوسرے لوگ بھی اس کو ڈانٹتے ہیں کہ ارے یار! تم اتنے میٹھے کیوں بنتے ہو،سب لوگ تم کو ہڑپ کر جائیں گے (خود سے تو کچھ بھلائی ہوتی نہیں،اور دوسرے کچھ کرتے ہیں تو ان کو بھی روکنے کی کوششیں کی جاتی ہیں)تب بھی وہ کہتا ہے کہ جس کو جو کرنا ہے اس کو وہ کرنے دو، اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کا بڑا اجر ہے۔

اور وہ بال بچے والا جو اپنے آپ کو سوال کے تقاضوں سے بچاتا ہو۔مطلب یہ ہے کہ چوں کہ وہ بال بچے والا ہے اس لئے یہ احتمال تھا کہ وہ اپنی ضرورتوں کی زیادتی کی وجہ سے کسی کے سامنے اپنی ضرورتیں پیش کرے،لیکن وہ کسی سے سوال نہیں کرتا، جو ضرورت ہوتی ہے وہ اللہ تعالیٰ ہی سے مانگتا ہے؛تو ایسا آدمی بھی جنتی ہے۔

وُجُوبُ طَاعَةِ وُلَاةِ الْأُمُورِ فِي غَيْرِ مَعْصِيَةٍ وَتَحْرِيمُ طَاعَتِهِمْ فِي الْمَعْصِيَةِ

حاکموں کی اطاعت کے احکام مجلس ۱

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حاکم کے حکم دینے کی وجہ سے جائز کام واجب ہو جاتا ہے:

اس باب میں یہ بتلاتے ہیں کہ رعایا پر اپنے حکمرانوں کی اطاعت کن چیزوں میں ضروری ہے؟

حکمرانوں کی طرف سے دیا جانے والا کام گناہ کا نہ ہو، بلکہ جائز کام ہو تو حاکم کی حکمرانی کی وجہ سے وہ جائز کام واجب کا درجہ اختیار کرلیتا ہے۔ ماں باپ کا بھی مسئلہ یہی ہے، اس لیے ماں باپ اگر اولاد کو ایسے کام کا حکم دیں جو جائز ہے، تو ماں باپ کے حکم دینے کے بعد وہ کام واجب ہو جاتا ہے۔

ماں باپ کے لیے اہم نصیحت:

اسی لیے حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: ماں باپ کو چاہیے کہ اپنے الفاظ کو استعمال کرنے میں احتیاط سے کام لیں، اگر اولاد سے کوئی کام کروانا چاہتے ہیں تو یوں نہ کہیں کہ ایسا کرو۔ اس لیے کہ اگر اولاد وہ کام نہیں کرے گی تو ماں باپ کی حکم عدولی کرنے کی وجہ سے گنہگار ہو گی اور یہ حرکت نافرمانی قرار دی جائے گی۔ اور ماں باپ کی نافرمانی پر جو وعیدیں ہیں اس کی حقدار بن جائے گی اور مصیبتوں میں پڑے گی اور کوئی ماں باپ اپنی اولاد کے لئے

ایسا نہیں چاہتے۔ لہٰذا ماں باپ کو یوں کہنا چاہیے کہ: بیٹا! ایسا ہو جائے تو اچھا ہے۔ اگر اس طرح ہو جائے تو ٹھیک ہے۔ اور اولاد کو بھی یہ سمجھنا چاہیے کہ ماں باپ کی یہ خواہش ہے، اگرچہ وہ صاف لفظوں میں حکم نہیں دے رہے ہیں، لیکن ان کی منشاء یہی ہے، اور ان کا جی یہی چاہتا ہے تو اس کے مطابق عمل کرے۔

بہر حال! جس کو بھی آپ پر حکمران اور سربراہ بنایا گیا ہے، اس کی طرف سے کسی ایسے کام کا حکم دیا جائے جو گناہ نہیں ہے، بلکہ جائز ہے؛ تو اس حکمران کے حکم کے نتیجہ میں وہ کام ضروری اور واجب ہو جاتا ہے۔

سربراہ کی بات ماننے کے حدود:

ایک بات یاد رکھیے کہ سربراہی کی نوعیتیں مختلف ہیں۔ کچھ سربراہی محدود ہوتی ہے، اور کسی کو عام سربراہی حاصل ہوتی ہے۔ جیسے: حاکم اعلیٰ اور پورے ملک کے بادشاہ کو عمومی سربراہی حاصل ہے۔ بعضوں کو مختلف شعبوں میں سربراہی حاصل ہوتی ہے، مثلاً: آپ نے کسی کے یہاں ملازمت اختیار کی اور اس کو اپنا بڑا مان لیا، تو وہ مالک اور سیٹھ اگر اس شعبہ سے متعلق کسی جائز کام کا حکم کرتا ہے تو آپ کے لیے اس کا حکم ماننا ضروری ہے۔ لیکن اگر وہی سیٹھ آپ کو اس شعبہ سے ہٹ کر کسی دوسرے کام کے متعلق کہتا ہے، مثلاً: آپ کا سیٹھ آپ کو یوں کہے کہ تو تیری بیوی کو طلاق دیدے؛ تو وہاں سیٹھ صاحب کا حکم نہیں مانا جائے گا۔ سیٹھ صاحب کا حکم

دوکان، فیکٹری، اورآفس سے متعلق جو بھی جائز کام ہیں، وہیں تک ماناجائے گا۔اگرناجائزکام یا شریعت کے خلاف کسی بات کے لیے کوئی بھی کہے؛ تواس پر عمل کرنے کی شریعت اجازت نہیں دیتی۔

نافرمانی میں فرمانبرداری نہیں:

"وَتَحْرِيمُ طَاعَتِهِمْ فِي الْمَعْصِيَةِ" گناہ اور نافرمانی کے کاموں کا حکم اگر بادشاہِ وقت بھی دے، اور باقاعدہ فرمان جاری کردے؛ تب بھی اس پر عمل نہیں کیا جائے گا۔اس لئے کہ جتنے بھی حکمران ہم پر بڑے بنائے گئے ہیں، ہم ان کی اطاعت اللہ تعالیٰ کے حکم کی وجہ سے ہی کرتے ہیں۔میں پہلے بھی کسی موقع پر بتلاچکاہوں کہ مؤمن کا اصل تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے، ایک آدمی جب یہ کہتاہے کہ میں ایمان لایاتو اس نے اپناتعلق اللہ تعالیٰ سے جوڑدیا، اب اُدھر سے جوکہاجائے گاوہی کیاجائے گا۔اولاد ماں باپ کی فرمانبرداراس لئے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو ماں باپ کی فرمانبرداری کاحکم دیاہے۔آدمی اپنے بڑوں کی عزت اوران کااحترام اس لیے کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیاہے کہ اپنے بڑوں کی عزت و احترام کرو، جوآدمی ایسانہیں کرتاوہ برا سمجھاجاتاہے۔

اس طرح بیوی کاحق اداکرتاہے، اس کی فرمائشیں حق سمجھ کر اس لیے پوری کرتا ہے کہ شریعت نے اس کے حقوق کے ادا کرنے کاحکم دیا ہے۔بیوی شوہرکی بات اس لیے مانتی ہے کہ جس پروہ ایمان رکھتی ہے اس نے حکم دیاہے کہ شوہرکی اطاعت کرو، اولادپرماں باپ

شفقت کا معاملہ کرتے ہیں اور ان کی ضرورتوں کا خیال اس لیے رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا حکم دیا ہے۔ جب اصل بات یہ ہے تو اب وہی شوہر، وہی ماں باپ، وہی بیوی، وہی اولاد؛ کوئی ایسی حرکت کرنے کے لیے کہیں جو اللہ تعالیٰ کے حکم کے خلاف ہو، اللہ تعالیٰ کو ناراض کرنے والی ہو؛ تو ہم کہیں گے کہ ہم تو اللہ تعالیٰ کے کہنے سے تمہاری بات مانتے تھے، اب اگر تم ہم کو اللہ تعالیٰ ہی سے توڑنا چاہتے ہو، تو یہ کسی حال میں قابلِ برداشت نہیں ہو گا۔ معلوم ہوا کہ مؤمن کا اصل رشتہ اور تعلق اللہ تعالیٰ سے ہی ہوتا ہے۔

مؤمن کے اللہ تعالیٰ سے تعلق کی مثال:

میں نے مثال بھی دی تھی کہ آپ کے گھر میں جو فون ہوتا ہے اس کا کنکشن ٹیلیفون ایکسچینج کے ساتھ ہوتا ہے۔ اسی ٹیلیفون ایکسچینج کے ساتھ دوسرے بہت سارے فون بھی جڑے ہوئے ہوتے ہیں، یہاں تک کہ آپ کے پڑوس میں مکان ہے جس کی دیواریں بالکل آپ کے گھر سے لگی ہوئی ہیں، اگر آپ اس کے فون پر بھی کال (Call) کریں گے تو وہ سیدھی اس کے فون پر نہیں جائے گی، بلکہ پہلے ٹیلیفون ایکسچینج جائے گی اور وہاں سے اُدھر آئے گی۔ وہ جواب دے گا تو وہ بھی ڈائرکٹ (Direct) آپ کے فون پر نہیں آئے گی بلکہ اِنڈائرکٹ (In Direct) آئے گی۔ اگر آپ کا تعلق ٹیلیفون ایکسچینج سے ختم ہو جائے گا تو پڑوسی سے بھی ختم ہو جائے گا، حالاں کہ وہ بالکل پڑوس میں ہے، لیکن ایکسچینج کے واسطے سے بات ہو رہی ہے۔ ایسے ہی جن جن

لوگوں کے ساتھ مؤمن کا تعلق ہے وہ اللہ تعالیٰ کے واسطے سے ہے، درمیان میں اللہ تعالیٰ کا حکم ہی واسطہ ہے۔ اس لیے چاہے باپ ہو، یا شوہر ہو، یا کوئی اور بڑا ہو؛ اگر وہ کسی ایسے کام کے کرنے کا حکم دیتے ہیں جو ناجائز ہے ،شریعت نے جس کام کی اجازت نہیں دی ہے، تو ان کی اطاعت نہیں کی جائے گی، اور نہ کرنے پر کوئی گناہ بھی نہیں ہوگا، بلکہ آدمی کے لیے لازم اور ضروری ہے کہ ایسا کام نہ کرے، اگر ایسا کام کرے گا تو گنہگار ہوگا۔

پریشان ہونے کی ضرورت نہیں:

بعض مرتبہ لوگ آکر کہتے ہیں کہ ابّا ایسی بات کا حکم دیتے ہیں جو گناہ ہے، اور جب میں نہیں مانتا تو ابّا کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا یہ حکم ہے کہ میری بات مانو۔ پھر بھی میں نہیں مانتا تو ابّا ناراض ہو کر مجھے بددعا دیتے ہیں ؛اب مَیں کیا کروں ؟مَیں ان سے کہتا ہوں کہ: بھائی! ابّا کی بددعا کو عمل میں کون لائے گا؟ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی عمل میں لائیں گے۔ اگر ابّا کے ہاتھ میں کچھ ہوتا تو وہ کچھ کر کے نہ بتلاتا؟ صرف بددعا کر کے چپ چاپ کیوں بیٹھا رہتا؟ معلوم ہوا کہ بددعا کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ ہی سے کہہ رہا ہے کہ: اے اللہ! یہ میری بات نہیں مانتا ہے، اس لیے اس کا ایسا کرڈالیو۔ اور اللہ تعالیٰ بھی جانتے ہیں کہ وہ کس بنیاد پر ایسا کہہ رہا ہے، اس نے میرے ایک بندہ کو میرے ہی حکم کی خلاف ورزی کرنے کا حکم دیا تھا، اور اس نے وہ

بات نہیں مانی تھی، اس پروہ بددعا کررہاہے؛تو اب اس کی بددعا تھوڑے ہی قبول کی جائے گی؟ لہٰذا ایسے موقع پر ذرابھی پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ…:

حدیث ۶۶۳:-

عن ابن عمر رضی اللہ عنہ عن النبی (ﷺ) قَالَ:عَلَی المَرْءِ الْمُسْلِمِ السَّمْعُ و الطَّاعَةُ فِيمَا أحَبَّ و كَرِهَ، إلاَّ أنْ يُؤْمَرَ بِمَعْصِيةٍ، فَإذَا أُمِرَ بِمَعْصِيةٍ فَلاَ سَمْعَ وَلاَ طَاعَةَ.

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: کسی بھی حکمران کی طرف سے جب حکم دیا جائے، تومسلمان کے لیے ضروری ہے کہ اس کو سنے ماننے اوراس پر عمل کرے، چاہے جوچیز کرنے کے لیے کہی گئی ہے وہ اس کی طبیعت کو پسند ہو، یا ناپسند ہو(بس صرف یہ دیکھا جائے گا کہ گناہ کے کام کا حکم تونہیں ہے، اگر کسی جائز چیز کا حکم ہے ،توچاہے آپ کی طبیعت کو پسند ہویا نہ ہو، طبیعت اس کے لیے آمادہ ہویا نہ ہو؛ اس کوماننا ضروری ہے۔ہاں !)اگر گناہ کا حکم دیا جائے تو(آپ ادب کے ساتھ بتلادو کہ آپ کی)یہ بات سننے اور عمل کے قابل نہیں ہے۔

حدیث ۶۶۴:-

وعنه قَالَ: كُنَّا إذَا بَايَعْنَا رَسُولَ اللهِ (ﷺ) عَلَی السَّمعِ و الطَّاعَةِ، يَقُولُ لَنَا: فِيمَا اسْتَطَعْتُمْ (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:-حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب ہم نبیؐ کریم (ﷺ) کے ہاتھ پر (کسی بھی حاکم کی بات) سننے اوراس کوماننے کے بارے میں عہد کرتے تھے توآپ یہ قیدلگادیاکرتے تھے کہ جتنی طاقت و قدرت میں ہوگی (اتنی ضرور سنیں گے اورمانیں گے)

..جاہلیت کی موت مرے گا:

حدیث ٦٦٥:-

وعنه قَالَ: سَمِعْتُ رسول الله (ﷺ) يقول: مَنْ خَلَعَ يَداً مِنْ طَاعَةٍ لَقِيَ اللهَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلاَ حُجَّةَ لَهُ، وَمَنْ مَاتَ وَلَيْسَ فِي عُنُقِهِ بَيْعَةٌ، مَاتَ مِيتَةً جَاهِلِيَّةً. (رواه مسلم)

وفي رواية لَهُ: وَمَنْ مَاتَ وَهُوَ مُفَارِقٌ لِلجَمَاعَةِ، فَإنَّهُ يَمُوتُ مِيتَةً جَاهِلِيَّةً.

((المِيتَةُ)) بكسر الميم.

ترجمہ مع تشریح:-حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ میں نے نبیؐ کریم (ﷺ) کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: جس نے اپنے امیراور حاکم کی اطاعت سے ہاتھ کھینچ لیا، قیامت کے روزاللہ تعالیٰ سے ایسی حالت میں ملے گاکہ اپنے اس جرم کے اوپر معذرت کے واسطے اس کے پاس کوئی دلیل نہیں ہوگی (یعنی اس کے پاس کوئی عذراوردلیل ایسی نہیں ہوگی جس کے ذریعہ وہ اپنے آپ کو اپنے حاکم کی نافرمانی کی سزا سے بچاسکے۔جب اسلامی حکومت ہوتی ہے تو حکومت کاجوحکمرانِ اعلیٰ اور بادشاہِ وقت ہوتاہے ، لوگ اس کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں،ہاتھ میں ہاتھ دے کر وعدہ اور عہد و

پیمان کرتے ہیں کہ ہم آپ کی اطاعت کریں گے، آپ کا حکم مانیں گے۔ تو حضورِ اکرم (ﷺ) فرماتے ہیں کہ) جو آدمی ایسی حالت میں مرا کہ اس نے کسی ایسے مسلمان حاکم (جس کو باقاعدہ حکومت کا سربراہ مقرر کیا گیا ہے اس) کے ہاتھ پر اطاعت کی بیعت نہیں کی؛ تو وہ جاہلیت کی موت مرے گا۔

افادات:–زمانۂ جاہلیت میں اس طرح کا کوئی نظام نہیں تھا اور جس وقت نبیٔ کریم (ﷺ) جزیرۃ العرب میں مبعوث ہوئے اس وقت بھی کوئی بادشاہت نہیں تھی، ہر ہر قبیلے کا اپنا اپنا الگ الگ نظام ہوتا تھا، اور ہر ہر قبیلے میں مختلف سردار ہوتے تھے، کوئی اِس کی مان رہاہے، کوئی اُس کی مان رہاہے، کسی ایک کی اطاعت وفرمانبرداری پر کسی کا اتفاق نہیں تھا، لیکن اسلام نے آکر پورا ایک نظام قائم کیا اور ایک آدمی کی اطاعت کے لیے سب کو آمادہ کیا، اسی لیے آپ (ﷺ) نے فرمایا کہ جو آدمی بغیر بیعت کے انتقال کرے گا تو وہ جاہلیت کی موت مرے گا۔

ہر حکمران کی بات سنو اور مانو؛ چاہے ...:

حدیث ٦٦٦:-

وعن أنسٍ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رسولُ اللہ (ﷺ) : اسْمَعُوا وأطِيعُوا، وَإنِ اسْتُعْمِلَ عَلَيْكُمْ عَبْدٌ حَبَشيٌّ، كَأَنَّ رأْسَهُ زَبِيبَةٌ. (رواہ البخاری)

ترجمہ:- حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: تم اپنے حکمرانوں کی بات سنو اور اس پر عمل کرو، چاہے تم پر کسی حبشی غلام کو حاکم بنایا جائے اور وہ بھی ایسا حبشی غلام ہو کہ جس کا سر اتنا چھوٹا ہو جیسے کشمش (کالی دراک) ہوتی ہے۔

افادات:- بعض حبشی ایسے ہوتے ہیں جن کے سر چھوٹے ہوتے ہیں۔ تو ویسے بھی عرب اور تمام اقوام میں حبشی سب سے کمتر سمجھے جاتے ہیں، اور اس میں بھی جو غلام ہو تو وہ اور زیادہ کمتر سمجھا جاتا ہے، اور پھر وہ غلام بھی چھوٹے سر والا ہو، تو اس کی تو کوئی وقعت ہی نہیں ہوتی۔ لیکن اگر حاکمِ اعلیٰ کی طرف سے کسی ایسے غلام کو بھی کسی جگہ کا حاکم بنادیا جائے جو پہلے غلام تھا؛ تو اس کی اطاعت ضروری ہے۔

ویسے یہ مسئلہ اپنی جگہ پر الگ ہے کہ جو خود غلام ہو اس کو کسی طرح کی حکمرانی سونپی جاسکتی ہے یا نہیں ؟ اس کو کسی ماتحت جگہ کا حاکم بنایا جاسکتا ہے یا نہیں؟ یہاں مطلب یہ ہے کہ پہلے وہ غلام تھا، اب غلامی سے آزاد ہو چکا ہے، لیکن سیاہ فام ہے اور ظاہری شکل وصورت اور جسم کے اعتبار سے ایسا نہیں کہ جس کو دیکھ کر کسی کے دل میں اس کی وقعت پیدا ہوتی ہو ، ایسے آدمی کو بھی اگر تمہارے اوپر نگران اور حاکم مقرر کردیا گیا ہو تو حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا کہ اس کی بات بھی کو سنو اور مانو۔

ہر حال میں مانو:

حدیث ۶۶۷:-

وعن أَبِی هریرة رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رسولُ اللهِ (ﷺ): عَلَيْكَ السَّمْعُ وَالطَّاعَةُ فی عُسْرِكَ وَيُسْرِكَ، وَمَنْشَطِكَ وَمَكْرَهِكَ، وأَثَرَةٍ عَلَيْكَ. (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: تمہارے لیے ضروری ہے کہ اپنے حکمران کی بات سنو اوراس کی اطاعت اور فرمانبرداری کرو، فقیری کی حالت میں ہو یامالداری کی حالت میں ہو(ایسا نہیں کہ جیب خالی ہے تو حکم مانتے رہے، لیکن جب دو پیسے آگئے تو ماننے کے لیے تیار نہیں)اور تمہاری طبیعت اس حکم کوماننے کے لیے آمادہ ہو یا نہ ہو(تمہارا موڈ ہو یا نہ ہو)اور تمہارے مقابلہ میں جب دوسروں کو ترجیح دی جائے(تب بھی ماننا ضروری ہے)

افادات:- "مَنْشَطِكَ وَمَكْرَهِكَ" کا مطلب یہ ہے کہ ہر حال میں ماننا ہے۔لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ موڈ میں آئے تو اپنے ابّا کی بات پر عمل کرلیا،ورنہ نہیں کیا،ایسا نہیں ہونا چاہیے،بلکہ ان کی بات کو تو ہر حال میں ماننا ہی ہے،بس شرط ایک ہی ہے جو اوپر گزر چکی کہ گناہ کے کام کا حکم نہ دیا جارہا ہو۔

...تو پھر تم میں اور اجنبی میں فرق ہی کیا؟:

"وَأَثَرَةٍ عَلَيْكَ"، ایک تو یہ کہ ابّا آپ کو خوب پیسے دے رہے ہیں ، کھلا پلا رہے ہیں ، اس وقت آپ ابّا کی بات مان رہے ہیں، اسی طرح حاکم کی طرف سے خوب نوازشات کا معاملہ چل رہا ہے، داد و دہش ہو رہی ہے، اس وقت تو مانتے ہیں، حالاں کہ ایسے وقت تو سب ہی مانتے ہیں، لیکن جب آپ کے مقابلہ میں دوسروں کو ترجیح دی جا رہی ہے، مثلاً: چار بھائی ہیں ، تین بھائیوں کے ساتھ ابّا بہت اچھا معاملہ کر رہے ہیں ، آپ کو تو ایک پائی بھی نہیں دیتے، ان کو اچھے اچھے کپڑے لا کر دے رہے ہیں، لیکن آپ کو کبھی اچھا سوٹ لا کر نہیں دیا، ان کی ساری فرمائش پوری ہوتی جا رہی ہیں ، اور آپ کی ایک فرمائش بھی پوری نہیں کی؛ پھر بھی ابّا یہ حکم دیں کہ تمھیں ایسا کرنا ہے، تو حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) فرماتے ہیں کہ ان کی بات مانو اور ویسا ہی کرو۔ یوں مت کہنا کہ ان تینوں بھائیوں کی باتیں تو مانی جائیں اور ان کی فرمائشیں پوری کی جائیں ، میرا تو آج تک کبھی کچھ کیا ہی نہیں ؛ اب میں آپ کی بات کیسے مانوں ؟ ارے بھائی! اس بنیاد پر بات مانی جائے گی تو پھر تمھارے اور اجنبی میں فرق ہی کیا رہا؟ تم پر جو اطاعت ضروری قرار دی گئی وہ تو ہر حال میں ضروری ہے، بس شرط ایک ہی ہے کہ گناہ کے کام کے لیے نہ کہا جائے۔

کسی حاکم یا بڑے کی طرف سے کسی کے ساتھ کوئی خصوصی معاملہ کیا جا رہا ہے جس کی وجہ سے وہ اطاعت کرتا ہے ، تو وہ تو اطاعت کرے گا ہی، لیکن آپ کے ساتھ کوئی خصوصی معاملہ

نہیں کیا بلکہ آپ کے مقابلہ میں دوسروں کو ترجیح دی جارہی ہے، آپ دیکھ رہے ہیں کہ آپ کی جماعت کا چیرمین دوسرے کو ترجیح دے رہا، اور آپ کی بات کی طرف دھیان نہیں دیتا، تب بھی چیرمین چوں کہ چیرمین (Chair Man) ہے، اس لیے آپ بات مان رہے ہیں ؛ تب تو برابر ہے۔ ورنہ آپ کو اگر لڈّو کھلا رہا ہے اور آپ اس کی بات مان رہے ہیں ؛ تو کیا فرق پڑتا ہے۔

کہنے کا حاصل یہی ہے کہ اپنے حکمران اور سربراہ کی اطاعت ہر حال میں کرنی ہے، چاہے وہ آپ کے ساتھ اچھا سلوک رکھتا ہو، یا نہ رکھتا ہو۔ آپ کے مقابلہ میں دوسروں کو ترجیح دیتا ہو تب بھی آپ کو اس کا حکم ماننا ہے، بس ایک شرط ہے کہ وہ کوئی گناہ کے کام کا حکم نہ دیتا ہو۔ اور اسی شعبہ سے متعلق حکم کو ماننا لازم ہے جس شعبہ میں آپ اس کے ماتحت ہیں جیسا کہ میں نے اوپر مثال دے کر بتلایا تھا۔

وُجُوبُ طَاعَةِ وُلَاةِ الْأُمُورِ فِي غَيْرِ مَعْصِيَةٍ وَتَحْرِيمُ طَاعَتِهِمْ فِي الْمَعْصِيَةِ

حاکموں کی اطاعت کے احکام مجلس ۲

یکم ذی قعدہ ۱۴۲۱ھ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۲۷/ جنوری ۲۰۰۱ء

بنیادی اصول:

باب کا عنوان قائم کیا ہے کہ: حکمران اگر ایسا حکم دے جس میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہ ہوتی ہو، تو ان کے حکم کو ماننا واجب اور ضروری ہے۔ اور اگر وہ کوئی ایسا حکم دے جس کے بجالانے میں اللہ تبارک وتعالیٰ کے کسی حکم کی نافرمانی ہوتی ہے، تو پھر اس کو پورا کرنا اور اس پر عمل کرنا حرام ہے۔ اسی مناسبت سے روایتیں لا رہے ہیں۔

پہلے بھی میں نے بتلایا تھا کہ مسلمان کا اصل تعلق تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات کے ساتھ ہے، جب وہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتا ہے تو اسی کے حکم سے دوسرے لوگوں کی اطاعت کرتا ہے، اگر ماں باپ کا حکم مانتا ہے تو اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے ماں باپ کی اطاعت کو ضروری قرار دیا ہے۔ بیوی اگر شوہر کا حکم مانتی ہے تو اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے شوہر کی اطاعت کو ضروری قرار دیا ہے۔ اسی طرح کوئی ماتحت اپنے سربراہ کا کوئی حکم مانتا ہے تو وہ اسی لیے کہ شریعت نے اس کی اتباع اور فرمانبرداری کا حکم دیا ہے، مؤمن کا اصل تعلق اور رشتہ تو اللہ تبارک وتعالیٰ کے ساتھ ہی ہے، اس کے بعد وہ ان سارے لوگوں کے احکام کو اللہ تعالیٰ ہی کے حکم کی وجہ سے مانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے احکام کو اپنے اپنے دائرے اور حدود

میں واجب الاطاعت قرار دیا ہے۔ اس میں بنیادی اصول بتلادیا گیا تھا کہ جب کسی کا کوئی حکم ایسا ہو جس سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی لازم آتی ہو تو پھر ان کے کسی حکم پر عمل نہیں کیا جائے گا، اس لیے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے حکم کی وجہ سے ان کے حکم پر عمل کرتے تھے، بلکہ ان کے حکم کی تعمیل کو اپنی سعادت سمجھتے تھے، لیکن جب وہی ایسی بات کا حکم دے رہے ہیں جس پر عمل کرنے کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی لازم آتی ہے؛ تو پھر ان کے حکم کو ہم رد کردیں گے۔

اُمتِ محمدیہ کی فتنوں سے سلامتی:

حدیث ۶۶۸:-

وعن عبدِ اللهِ بن عمر رضی اللہ عنہ وَقَالَ: کنا مَعَ رسول الله (ﷺ) فی سَفَرٍ فَنَزَلْنَا مَنْزِلاً، فَمِنَّا مَنْ يُصْلِحُ خِبَاءَهُ، وَمِنَّا مَنْ يَنْتَضِلُ، وَمِنَّا مَنْ هُوَ فی جَشَرِهِ، إِذْ نَادَى مُنَادِى رسولِ الله (ﷺ): الصَّلاةُ جَامِعَةٌ. فَاجْتَمَعْنَا إِلَى رسولِ الله (ﷺ) فَقَالَ: إِنَّهُ لَمْ يَكُنْ نَبِيٌّ قَبْلِي إِلاَّ كَانَ حَقّاً عَلَيْهِ أَنْ يَدُلَّ أُمَّتَهُ عَلَى خَيْرِ مَا يَعْلَمُهُ لَهُمْ، وَيُنْذِرَهُم شَرَّ مَا يَعْلَمُهُ لَهُمْ. وَإِنَّ أُمَّتَكُمْ هذِهِ جُعِلَ عَافِيَتُهَا فی أَوَّلِهَا، وَسَيُصِيبُ آخِرَهَا بَلاَءٌ وَأُمُورٌ تُنْكِرُونَهَا، وَتَجِيءُ فِتْنَةٌ يُرَقِّقُ بَعْضُهَا بَعْضاً، وَتَجِيءُ الفِتْنَةُ فَيقُولُ المُؤْمِنُ: هذه مُهلكتي، ثُمَّ تنكشف، وتجيء الفتنةُ فيقولُ المؤمنُ: هذِهِ هذِهِ. فَمَنْ أَحَبَّ أَنْ يُزَحزَحَ عَنِ النَّارِ، ويُدْخَلَ الجَنَّةَ، فَلْتَأْتِهِ منيَّتُهُ وَهُوَ يُؤْمِنَ باللهِ واليَوْمِ الآخِرِ، وَلْيَأْتِ إِلَى النَّاسِ الَّذِى يُحِبُّ أَنْ يُؤْتَى إِلَيْهِ. وَمَنْ بَايَعَ إِمَاماً فَأَعْطَاهُ صَفْقَةَ يَدِهِ، وَثَمَرَةَ قَلْبِهِ، فَلْيُطِعْهُ إِنِ اسْتَطَاعَ، فَإِنْ جَاءَ آخَرُ يُنَازِعُهُ فَاضْرِبُوا عُنُقَ الآخَرِ.

ترجمہ مع مختصر تشریح:-حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم لوگ نبیٔ کریم (ﷺ) کے ساتھ ایک سفر میں تھے ، دورانِ سفر آرام کی ضرورت پیش آئی تو ہم نے ایک جگہ پر قیام کیا۔ اس دوران کوئی آدمی اپنے خیمے کو درست کررہا تھا، کوئی آدمی نیزے بازی کی مشق کررہا تھا، اور کوئی آدمی اپنے مویشیوں میں مشغول تھا (اس لئے کہ جب کسی جگہ پر ٹھہرتے ہیں تو ہر ایک اپنی اپنی ضرورتیں پوری کرلیتا ہے) اتنے میں نبیٔ کریم (ﷺ) کے منادی نے آواز دی: اَلصَّلوٰۃُ جَامِعَۃٌ (حضورِ اکرم (ﷺ) صحابہ کو کسی خاص بات بتلانے کے لئے یا کسی خاص پیغام کو ان تک پہنچانے کے لئے اگر فوری طور پر جمع کرنا چاہتے تو اس کے لئے ان الفاظ میں اعلان کراتے تھے۔ مقصد ہوتا تھا کہ فوراً آجاؤ) چناں چہ ہم لوگ نبیٔ کریم (ﷺ) کے پاس جمع ہوگئے اس وقت نبیٔ کریم (ﷺ) نے یہ ارشاد فرمایا: مجھ سے پہلے جو بھی نبی آئے ان پر اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے یہ ضروری قرار دیا گیا تھا کہ وہ اپنی امت کو ہر ایسی چیز کی طرف رہنمائی کریں جسے اُس امت کے لئے بھلائی کا ذریعہ سمجھتے ہوں۔ اوران کو اس برائی سے ڈرائیں جو ان کے حق میں وہ بری سمجھتے ہوں۔ پھر ارشاد فرمایا: ہماری اس امت -یعنی امتِ محمدیہ- کی فتنوں سے سلامتی اللہ تعالیٰ نے اس کے شروع میں رکھی ہے، البتہ اس امت کے بعد میں آنے والے حصے اور طبقے کو کچھ آزمائشیں اور کچھ ایسی چیزیں پیش آئیں گی جن کو تم اُوپرا اور اَجنبی سمجھتے ہو۔ اس امت کے آخری زمانہ میں ایسے فتنے آئیں گے کہ ایک فتنہ دوسرے فتنے کو کم کرکے دکھلائے گا اور صورتِ حال یہ ہوگی کہ ایک فتنہ آئے گا اور ایسے حالات پیدا ہوجائیں گے کہ جس میں آدمی کے لیے حق و باطل میں تمیز کرنا مشکل ہوجائے گا، ایسے موقع پر ایک مؤمن یوں کہے گا کہ یہ فتنہ تو مجھے ہلاک ہی کر ڈالے گا (مطلب یہ ہے کہ ہر بعد میں آنے والا فتنہ پہلے والے فتنہ سے بڑا ہوگا۔ ایک فتنہ جب آئے گا تو اس کو

دیکھ کر آدمی یوں سمجھے گا کہ یہ فتنہ بہت بڑا ہے اوراس فتنہ کی کیفیت کو دیکھ کر مؤمن اپنے ایمان کے متعلق خطرہ محسوس کرے گا اوریوں کہے گا یہ مجھے ہلاک کر دے گا۔پھر جب وہ فتنہ ختم ہوجائے گا اوروہ حالات دور ہوجائیں گے)اس کے بعد دوسرا فتنہ آئے گاتواس وقت مؤمن کہے گا کہ بس یہی وہ فتنہ ہے جو مجھے ہلاک کردے گااور میرے ایمان کو ختم کردے گا۔اس لیے جو آدمی یہ چاہتاہو کہ اس کو جہنم سے دورکیاجائے اورجنت میں داخل کیا جائے؛اس کو چاہیے کہ اس کی موت ایسی حالت میں آئے کہ وہ اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتاہو، اورلوگوں کے ساتھ ویساہی معاملہ کرے جسے اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے۔اور جس کسی نے حاکمِ وقت امام یعنی حاکمِ اَعلیٰ، بادشاہِ وقت کے ہاتھ پر اطاعت و فرمانبرداری کی بیعت کی اوربیعت کے وقت اپناہاتھ اس کے ہاتھ میں دیا اور ساتھ ہی ساتھ اپنے دل سے عہدو پیمان اوراقرار بھی کیا،تواب اپنی طاقت کے مطابق اس حکمران کی پوری پوری اطاعت کرے۔ اس کے بعد اگر کوئی دوسرا آدمی حکومت اورتاج وتخت کا دعویدار کھڑا ہوجائے تو جوبعد میں کھڑا ہوا ہے اس کی گردن اڑادو۔

افادات:–اس روایت سے مندرجۂ ذیل امور معلوم ہوئے :–

ا: ہرنبی کا یہ فریضہ تھا کہ جوکام اورطریقہ اپنی امت کے لئے باعثِ خیر جانتاہو،اپنی امت کو اس طریقہ اوراس کام کی طرف رہنمائی کرے اور دعوت دے، اور جوکام اور طریقہ اپنی امت کے لئے غلط،برا، مضر اور نقصان دہ سمجھتاہو، اس سے اپنی امت کوڈارئے اوراس کام سے بچائے۔حضرات علمائے کرام بھی چونکہ انبیاء کے جانشین ہیں ، اس لئے ان کا بھی یہی

فریضہ ہے کہ لوگوں کو وہ چیز بتلائیں جو دین اور شریعت کی تعلیمات کے اعتبار سے بھلائی اور خیر کا ذریعہ ہیں۔ اور جو چیزیں لوگوں کے حق میں مضر اور نقصان دہ ہوں، ان سے روکنا بھی اہلِ علم کے لیے ضروری ہے۔ یہ کام علماء کے لیے ضروری اور واجب ہے، خاموشی اختیار کرنے کی شریعت اجازت نہیں دیتی

۲: اس امت کا ابتدائی دور وہ ہے جس میں یہ امت فتنوں سے محفوظ رہے گی، ظاہر ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) تشریف فرماتھے، آپ کے بعد حضراتِ خلفائے راشدین کا زمانہ تھا، تو اس وقت یہ اُمت دینی فتنوں سے محفوظ تھی۔ البتہ اس امت کے بعد میں آنے والے حصے اور طبقے کو کچھ آزمائشیں اور کچھ ایسی چیزیں پیش آئیں گی جن کو اُوپرا اور اَجنبی سمجھا جائے گا۔

ہر وہ کام جس کے کرنے کی شریعت نے اجازت نہ دی ہو، اس کو غلط اور ممنوع قرار دیا ہو؛ ان کو ''منکَر '' کہتے ہیں۔ اور جس کام کا شریعت کی طرف سے حکم دیا گیا ہو؛ اس کو ''معروف'' کہا جاتا ہے۔ لغوی اور ڈکشنری کے اعتبار سے معروف کا ترجمہ 'جانی پہچانی چیز' ہوتا ہے۔ جس کا مزاج دینی ہوگا اور ماحول بھی دینی ہوگا، ایسے معاشرہ میں نیک کام جانے پہچانے ہوں گے۔ اور غلط و گناہ کے کام انجانے ہوں گے، جن کو کوئی جانتا اور پہچانتا نہ ہوگا، گویا ایسے کام اجنبی اور اُوپرے سمجھے جاتے ہیں، اس لیے ان کو ''منکَر'' سے تعبیر کیا جاتا ہے (معروف اور منکَر پر تفصیلی کلام جلد/۳ میں ملاحظہ فرمائیں۔ مرتب۔)

فتنہ کسے کہتے ہیں ؟:

۳: ’’فتنہ ‘‘ عربی زبان کا لفظ ہے ’’فَتَنَ یَفۡتِنُ‘‘ کا اصل ترجمہ ہوتا ہے : سونے کے کھرے اور کھوٹے ہونے کو پہچاننے اور اس کے میل کچیل کو دور کرنے کے لئے آگ کے اندر ڈالنا۔ اور شریعت کی اصطلاح میں ’’فتنہ‘‘ ان حالات اور آزمائش کو کہا جاتا ہے جس سے آدمی کے ایمان اور نفاق، اخلاص اور عدمِ اخلاص کو پہچانا جاتا ہے ایسے حالات کہ جس میں حق اور باطل ایسے گھل مل جائیں ، دونوں میں ایسی آمیزش ہو جائے، دونوں ایسے قریب ہو جائیں کہ آسانی کے ساتھ یہ پہچاننا مشکل ہو جائے کہ حق کیا ہے اور باطل کیا ہے، سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا ہے، ایسے حالات کو سمجھنا ہر آدمی کا کام نہ رہے؛ ایسے واقعات کو ’’فتنہ ‘‘ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اسی طریقہ سے اگر گناہوں کی کثرت ہونے لگے، فسق وفجور عام ہو جائے، تو اس کو بھی بعض روایتوں میں ’’فتنہ ‘‘ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اسی طرح مسلمانوں کی دو جماعتوں میں آپس میں ٹکراؤ ہو جائے اور جنگ چھڑ جائے اور ان دونوں میں سے ہر ایک اپنے اپنے موقف اور نظریہ پر ایسا قائم ہو کہ اس کو چھوڑنے کے لیے تیار ہی نہ ہو، دونوں ایک دوسرے سے ایسے بھڑے ہوئے ہوں کہ ملنے کے لئے بھی تیار نہ ہوں، ہر ایک اپنے حق پر ہونے کا دعویٰ کرتا ہو، ایسے مشکل حالات پیدا ہو جائیں ، اور ایسی شکل

بن گئی ہو کہ عام آدمی کے لیے تمیز کرنا دشوار ہو جائے کہ کون حق پر ہے اور کون باطل پر ہے؛ اس کو بھی روایتوں میں ’’فتنہ ‘‘ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

بہر حال! لفظ’’ فتنہ ‘‘ کا مفہوم عام ہے ،سب کے اندر قدرِ مشترک بات اتنی ہے کہ ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ جس میں آدمی کے لئے آسانی سے حق اور باطل،سچ و جھوٹ کے اندر تمیز کرنا مشکل ہو جائے۔بس! جس کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایمانی بصیرت عطا فرمائی ہو اور جس پر اللہ تعالیٰ کا خصوصی فضل وکرم ہو،وہی ان حالات کے اندر کوئی صحیح فیصلہ کرنے پر قدرت رکھتا ہے،ورنہ ہر ایک کے لیے یہ کام آسان نہیں ہوا کرتا؛ایسے حالات کو ’’فتنہ ‘‘سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

حضورِ اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ ایسے فتنے آئیں گے کہ ایک فتنہ دوسرے فتنہ کو کم کرکے بتلائے گا،یعنی ہر بعد میں آنے والا فتنہ اس سے پہلے والے فتنہ کے مقابلہ میں بڑھا ہوا ہوگا۔ایک حالت آتی ہے تو آدمی اس کو دیکھ کر سہم جاتا ہے اور ڈر جاتا ہے کہ یہ تو بڑا خطرناک معاملہ ہے،ایسا تو ہم نے کبھی دیکھا ہی نہیں ،لیکن جب اس کے ختم ہونے کے بعد دوسرا معاملہ پیش آتا ہے تو بعد والا معاملہ اس سے بھی زیادہ بھیانک اور خطرناک ہوتا ہے،اس وقت وہی آدمی یوں کہتا ہے کہ پہلے والے حالات تو اس کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں تھے۔

”فتنہ“ کی تشریح بہ زبانِ نبی:

اور فتنہ کی تشریح فرماتے ہوئے حضورِ اکرم (ﷺ) خود فرماتے ہیں کہ صورتِ حال یہ ہوگی کہ ایک فتنہ آئے گا اور ایسے حالات پیدا ہوجائیں گے کہ جس میں آدمی کے لیے حق وباطل میں تمیز کرنا مشکل ہوجائے گا، ایسے موقع پر ایک مؤمن کہے گا کہ یہ فتنہ تو مجھے ہلاک ہی کرڈالے گا، یعنی اس فتنہ کی کیفیت کو دیکھ کر مؤمن اپنے ایمان کے متعلق خطرہ محسوس کرے گا اور یوں کہے گا یہ مجھے ہلاک کردے گا، پھر وہ فتنہ ختم ہوجائے گا، حالات دور ہوجائیں گے، اس کے بعد دوسرا فتنہ آئے گا تو اس وقت مؤمن کہے گا کہ بس! یہی فتنہ ایسا ہے جو مجھے ہلاک کردے گا اور میرے ایمان کو ختم کردے گا گویا پہلے کے مقابلہ میں دوسرے کو اتنا زیادہ سخت پائے گا کہ یہ کہنے پر مجبور ہوجائے گا کہ یہی میرے ایمان کی بربادی کا ذریعہ بنے گا۔ مطلب یہ ہے کہ ایسی صورتِ حال ہوگی کہ ہر آنے والا فتنہ پہلے والے فتنہ کے مقابلہ میں بڑا ہوگا، ہر آنے والی کیفیت پہلی والی کیفیت کو مات کردے گی۔ آج کل یہی شکلیں پیدا ہورہی ہیں۔

امیر کی اطاعت ضروری ہے:

۴: جس کسی نے حاکمِ وقت امام یعنی حاکمِ اعلیٰ بادشاہِ وقت کے ہاتھ پر اطاعت وفرمانبرداری کی بیعت کی، اور اپنے دل سے اقرار بھی کیا، گویا وہ اس بات کا عہد وپیمان لیتا ہے کہ میں اس کو

اپنا امیر تسلیم کرتا ہوں اور اس کی اطاعت کروں گا، چاہے اس کا حکم میرے مزاج کے موافق ہو، یا میرے مزاج کے خلاف ہو۔ آدمی جب بیعت کرتا ہے تو اس وقت اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اپنے دل سے عہد و پیمان اور اقرار بھی کرتا ہے، تو اب اس حکمران کی پوری پوری اطاعت اپنی طاقت کے مطابق کرے، اس کے بعد کوئی دوسرا آدمی حکومت اور تاج و تخت کا دعویدار اگر کھڑا ہو جائے تو جو بعد میں کھڑا ہوا ہے اس کی گردن اڑادو۔ مطلب یہ ہے کہ جب تم پہلے والے سے عہد و پیمان کر چکے ہو، تو اب دوسرے کا ساتھ دینا کسی حال میں بھی جائز نہیں۔ پہلے والے کے ساتھ اطاعت کا عہد و پیمان کیا تھا تو اب اس کی اطاعت ضروری ہے اور دوسرا جو دعویدار کھڑا ہوا ہے اس کے ساتھ کوئی معاملہ نہیں کیا جائے گا، بلکہ اس کو تو ختم کیا جائے گا۔ بہر حال! باب کا عنوان جو قائم کیا تھا کہ امیر کی اطاعت ضروری ہے وہ اس روایت سے ثابت ہوتا ہے۔

اُن کا بوجھ اُن پر؛ تمہارا تم پر:

حدیث ۶۶۹:-

وعن أَبِي هُنَيْدَةَ وَائِلِ بن حُجْرٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: سَأَلَ سَلَمَةُ بن يَزِيدَ الجُعْفِيُّ رسولَ الله (ﷺ) فَقَالَ: يَا نَبِيَّ الله، أَرَأَيْتَ إِنْ قَامَتْ عَلَيْنَا أُمَرَاءُ يَسأَلُونَا حَقَّهُم، وَيَمْنَعُونَا حَقَّنَا، فَمَا تَأْمُرُنَا؟ فَأَعْرَضَ عنه، ثُمَّ سَأَلَهُ، فَقَالَ رسولُ الله (ﷺ): إِسْمَعُوا وَأَطِيعُوا، فَإِنَّمَا عَلَيْهِمْ مَا حُمِّلُوا، وَعَلَيْكُمْ مَا حُمِّلْتُمْ. (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت سلمہ بن یزید جعفی رضی اللہ عنہ نے نبیٔ کریم (ﷺ) سے پوچھا:اے اللہ کے نبی!ہمیں بتلائیے کہ اگر ہمارے اوپر ایسے حکمران مسلط ہوں جو ہم سے اپنا حق مانگتے ہوں اور ہمارا حق ادا نہ کرتے ہوں؛ایسوں کے متعلق آپ ہمیں کیا حکم ارشاد فرماتے ہیں؟ ہم ان کے ساتھ کیا معاملہ کریں ؟ یہ سن کر نبیٔ کریم (ﷺ) نے بے رخی برتی۔انہوں نے پھر یہی سوال پوچھا تو حضورِ اکرم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: اپنے حکمرانوں کے حکم کو سنو اور ان کی اطاعت کرو،اس لیے کہ اگر وہ اپنی ذمہ داری پوری نہیں کرتے تو اس کا بوجھ ان پر رہے گا، اور تمہاری ذمہ داری تم پر ہے۔

افادات:- اسلام نے حاکم کا حق محکومین وماتحتوں پر مقرر کیا ہے، ان کا حق رعایا کے ذمہ یہ ہے کہ جائز کاموں کے اندر ان کی اطاعت واجب اور فرض قرار دی گئی ہے،اس کے علاوہ بھی حقوق ہیں کہ ان کی خیر خواہی ضروری ہے۔اسی طریقہ سے محکوم یعنی رعیت کے بھی حقوق ہیں جیسا کہ پہلے بھی آچکا ہے کہ رعایا کی خیر خواہی کرنا حاکم کے لیے ضروری ہے،اوردوسرے حقوق بھی ہیں جن کی تفصیل پچھلے باب میں آگئی تھی۔

ان صحابی نے سوال کیا کہ ایسے حکمران اگر ہمارے اوپر آگئے جو اپنا حق توہم سے وصول کرتے ہیں یعنی اپنی بات توہم سے منواتے ہیں ،اپنی اطاعت تو کرواتے ہیں گویا ان کی طرف سے اس بات کا مطالبہ ہوتا ہے کہ ہماری فرمانبرداری کرو،لیکن ہمارے جو حقوق ان کے اوپر لازم ہوتے ہیں وہ ادا نہیں کرتے،ہماری ضرورتوں اور تقاضوں کو وہ پورا نہیں کرتے، ہمارے ساتھ جو خیر خواہی کا

معاملہ کرنا چاہیے وہ نہیں کرتے؛ایسے وقت ہم کیا کریں؟ان کا یہ سوال سن کر نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کوئی جواب نہیں دیا۔

عام طور پر جب اس طرح کے سوالات حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) سے کیے جاتے تھے تو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) ابتداءً اس کا جواب نہیں دیا کرتے تھے۔اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ہر سوال کا فوری جواب نہیں دیا جاتا،بلکہ بعض سوالات ایسے ہوتے کہ ان کے جواب میں ٹال مٹول سے کام لیا جاتاہے، اور بہت سے سوال تو ایسے ہوتے بھی نہیں کہ ا ن کا فوری جواب دیا جائے۔ ہاں !جب دیکھے کہ آدمی کے سوال کا جواب دیئے بغیر چارۂ کار نہیں ہے ؛تو بات دوسری ہے۔

شریعت کا اصول:

دیکھو!شریعت کا یہ ایک اصول ہے جو میں پہلے بھی کئی مرتبہ بتلا چکا ہوں کہ شریعت کی طرف سے ہر جگہ حقوق مقرر کردئے گئے ہیں۔ حکمرانوں کے اوپران کے ماتحتوں اور رعایا کے حقوق مقرر کیے گئے،اوررعایا کے اوپر حکمرانوں کے حقوق مقرر کیے گئے۔اب ہر ایک کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان حقوق کوادا کرے۔یاجیسے شوہر کے اوپر بیوی کا حق مقرر کیا گیا اور بیوی کے اوپر شوہر کا حق مقرر کیا گیا۔اب شوہر کے لیے ضروری ہے کہ بیوی کا حق ادا کرے اور بیوی کے لیے ضروری ہے کہ شوہر کا حق ادا کرے۔لیکن عام طور پر دنیا میں ہوتا یہ ہے کہ جن دوفریق کے آپس میں ایک دوسرے کے اوپر حقوق مقرر کیے گئے ہیں (جیسے میاں بیوی،یاحاکم

اور محکوم، آقا اور غلام) اس میں جو قوت والا فریق ہوتا ہے وہ ایسا انداز اور ایسی روش اختیار کرتا ہے کہ اپنا حق جو سامنے والے پر ہے وہ تو اپنی قوت کے زور سے وصول کرتا ہے، لیکن سامنے والے کا جو حق اپنے اوپر ہے اس کو ادا کرنے کی فکر نہیں کرتا؛ تو اب ایسے مواقع پر کیا کیا جائے؟

آپ حدیث کے پورے ذخیرے کو اٹھاکر دیکھ لیجیے کہ آپ (ﷺ) نے ایسے تمام مواقع پر یہ نہیں فرمایا کہ وہ تمہارا حق ادا نہیں کرتا تو تم بھی اس کا حق ادا مت کرو۔ کہیں بھی ایک حدیث آپ کو ایسی نہیں ملے گی، اس لیے کہ نظامِ عالَم کو باقی رکھنے کا طریقہ یہ ہے ہی نہیں۔ اور میں پہلے بھی کئی مرتبہ بتلاچکا ہوں کہ اگر دونوں فریق ایک دوسرے کے حقوق کی ادائیگی کا اہتمام کرتے ہیں تب تو نورٌ علی نورٍ؛ پورا معاشرہ جنت کا نمونہ بن جائے گا۔ اور اگر جن دو فریق کے ایک دوسرے کے اوپر حقوق مقرر کیے گئے ہیں، ان میں سے ایک فریق سامنے والے کے حقوق کو ادا نہیں کرتا، لیکن دوسرا فریق اس کے حقوق کو ادا کرتا ہے؛ تب بھی ٹکراؤ کی نوبت نہیں آئے گی، معاملہ سنبھلا ہوا رہے گا۔ لیکن اگر سامنے والا فریق بھی حق ادا نہیں کرتا تو پھر ٹکراؤ کی نوبت آئے گی۔ جیسے: شوہر اپنا حق وصول کرتا ہے، لیکن بیوی کا حق ادا نہیں کرتا، تو وہاں ہم بیوی کو کبھی یہ مشورہ نہیں دیں گے کہ تو بھی شوہر کا حق ادا مت کر۔ اسی طرح حاکم کے پاس قوت ہے جس کی وجہ سے وہ اپنا حق وصول کرتا ہے، لیکن اس کے اوپر اپنے ماتحتوں کے جو حقوق عائد ہوتے ہیں وہ ان کو ادا نہیں کرتا۔ اب اگر ماتحت آکر یہ سوال کریں کہ آپ ہی بتایئے کہ ہم کیا کریں؟ تو آپ کبھی بھی یہ مشورہ نہ دیں کہ تم بھی اس کا حق ادا مت کرو۔ اس

روایت میں حضورِ اکرم (ﷺ) بھی ایسا مشورہ نہیں دے رہے ہیں بلکہ آپ (ﷺ) نے فرمایا: "إِسْمَعُوْا وَأَطِيعُوْا" اس کا تم پر یہ حق ہے کہ وہ تم کو جو حکم دے اس کو مانو، بس! جب وہ حکم دیتا ہے تو مان لو، اس طرح تمہاری ذمہ داری تو تم پوری کرلو۔

"فَإِنَّمَا عَلَيْهِمْ مَا حُمِّلُوا، وَعَلَيْكُمْ مَا حُمِّلْتُمْ" ہماری ذمہ داری یہی ہے کہ جو شریعت کی طرف سے ہم پر لازم کی گئی، اور ان کی ذمہ داری وہ ہے جو شریعت کی طرف سے ان پر لازم کی گئی تھی۔ اب اگر وہ اپنی ذمہ داری پوری نہیں کرتے تو اس کا بوجھ ان پر رہے گا، ہمیں اس بات کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ ہمارا حق ادا نہیں کرتے تو ہم ان کا حق کیوں ادا کریں؟ شریعت ہمیں اس بات کی اجازت نہیں دیتی۔ آپ حق ادا کرتے رہے یا نہیں؛ اس کا فیصلہ تو اللہ تبارک تعالیٰ کی طرف سے آپ کے ساتھ قیامت کے روز کیا ہی جائے گا جہاں کبھی اس کے خلاف ہونے والا نہیں ہے۔

یہاں یہی بتلانا چاہتے ہیں کہ حکمران کی اطاعت ضروری ہے۔ اور ویسے بھی جب وہ قوت کے زور سے اپنا حق وصول کررہا ہے، تو اگر ہم یہ مشورہ دیں کہ تم اس کا حق ادا مت کرو؛ تو یہی چیز فتنہ بڑھانے کا ذریعہ بنے گی۔

اصل علاج یہ نہیں :

اورایک بات یہ بھی غور طلب ہے کہ وہ اپناحق اسی لئے تووصول کررہا ہے کہ اس کاحق ہے،اور کسی آدمی کااپنے حق کووصول کرناکوئی گناہ کاکام نہیں ہے،سیدھی سی بات ہے۔اس کو حق پہنچتاہے کہ اپناحق وصول کرے اس لیے کررہا ہے۔ہاں !سامنے والے کاجوحق ادانہیں کررہا ہے،یہ بات غلط ہے، اس کی طرف سے یہ کوتاہی ہورہی ہے۔اب اگرہم سامنے والے کویہ مشورہ دیں کہ تم بھی حق ادامت کرو،توآپ ہی سوچئے کہ ہم سامنے والے کوبھلائی کامشورہ دے رہے ہیں ، یاغلط مشورہ دے رہے ہیں ؟جوغلطی یہ کررہاتھااس کا علاج ڈھونڈنے کے لیے سامنے والافریق ہمارے پاس آیا،توعلاج میں ہم بھی وہی بات بتلارہے ہیں کہ توبھی اس کاحق مت اداکرنا؛تویہ علاج کہاں ہوا،بلکہ معاملہ کواورزیادہ بگاڑناہوا۔شریعت کبھی یہ مشورہ نہیں دیتی ۔

اگرہم یہ کہیں گے کہ تم اس کاحق ادا مت کرو توظاہرہے کہ وہ تو پہلے ہی قوت سے اپناحق وصول کررہا تھااوراب اگریہ حق ادا نہیں کرے گا تو ٹکراؤکی شکلیں پیدا ہوگی جب یہ اس پراپنازورچلاناچاہیے گاتواس کے اس زورسےبچنے کے لیے سامنے والا فریق جوکمزورہے وہ دوسروں کی حمایت حاصل کرے گا،اورجب دوسروں کی حمایتیں آئیں گی توجھگڑے اورفتنے زیادہ پیدا ہوں گے، اس لئے شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی،یہ بات بڑے خطرے کی ہے،

عام طور پر فتنے اسی کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں ، ایسے تمام حالات میں شریعت کی بڑی تاکید رہتی ہے کہ تم سامنے والے کا حق ادا کرتے رہو، اگرچہ وہ تمہارے حق میں کوتاہی کرے۔

شفابخش علاج :

آج کل تو ایسا مزاج بن گیا ہے کہ لوگ یہ سوچنے لگتے ہیں کہ کیا ہم بزدل ہیں کہ وہ ہمارا حق ادا نہیں کرتا تب بھی ہم اس کا حق ادا کریں؟ لوگوں نے اس کا نام بزدلی رکھ دیا ہے، حالاں کہ یہ بزدلی نہیں ہے۔ آپ یہ طے کر لیجئے کہ میں اس کا جو حق ادا کر رہا ہوں وہ بزدلی کی وجہ سے نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے اس لئے ادا کر رہا ہوں ۔ ہمیں چاہیے کہ ہم ہر کام میں اللہ تعالیٰ کے حکم کو پیشِ نظر رکھیں۔

اور یہ بھی بڑی عجیب بات ہے کہ بہت سے دینی کام جو ہم کرتے ہیں وہ حکمِ خداوندی کی وجہ سے نہیں، بلکہ معاشرے اور سماج کا ایک طریقہ اور دھارا بنا ہوا ہے اس لیے کرتے ہیں۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہماری دینداری کا بہت بڑا حصہ ایسا ہی ہے۔ بعض لوگ اگر شراب نہیں پیتے تو وہ اس لیے نہیں کہ حرام ہے، بلکہ سوچتے ہیں کہ اگر میں پیوں گا تو لوگ کیا کہیں گے۔ میں سنیما دیکھنے جاؤں گا تو لوگ کیا کہیں گے؟ وہاں وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کو نہیں سوچتا۔ تو درحقیقت بہت سے گناہوں سے لوگ اللہ تعالیٰ کی خاطر نہیں ،بلکہ سماج کے ڈر سے بچتے ہیں، اور بہت سے کام اللہ تعالیٰ کی خاطر نہیں ، بلکہ سماج کے ڈر سے کرتے ہے۔ حالاں

کہ شریعت کی تعلیم تو یہ ہے کہ چھوٹے سے چھوٹا کام کرو تب بھی اور بڑے سے بڑا کام کرو تب بھی اللہ تعالیٰ کے واسطے ہی کرو۔ اور اگر کوئی کام نہ کرو، تو وہ بھی اللہ تعالیٰ کے واسطے مت کرو۔ جیسا کہ حدیثِ پاک میں آتا ہے: "مَنْ أَعْطَىٰ لِلّٰهِ وَمَنَعَ لِلّٰهِ" جس نے دیا تو اللہ کے واسطے دیا، اور نہیں دیا تب بھی اللہ کے واسطے نہیں دیا "فَقَدِ اسْتَكْمَلَ الْإِيمَان" تو اس کا ایمان کامل ہو گیا۔

خلاصۂ علاج:

خلاصہ یہ ہوا کہ ایسے مواقع پر آدمی اللہ تعالیٰ کے حکم کو مدِّنظر رکھے، اور یہی سوچے کہ میرا اس کے حق کو ادا کرنا بزدلی کی وجہ سے نہیں ہے، بلکہ اس لئے ہے کہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے؛ تو پھر دیکھئے کہ بھائیوں بھائیوں میں اور رشتہ داروں میں کیسی محبتیں قائم ہو جاتی ہیں۔ ہمارے سماج میں جتنے بھی بگاڑ ہیں یہ آپسی حقوق کے ادا نہ کرنے کے نتیجہ ہی میں ہیں، اگر اس تعلیم پر عمل کر لیا گیا تو ان شاءاللہ سارے بگاڑ ختم ہو جائیں گے۔ جب بھی ایسا کوئی معاملہ ہو اور لوگ کہیں کہ کیا تو بزدل ہے؟ وہاں اسی سوچ کی ضرورت ہے "فَإِنَّمَا عَلَيْهِمْ مَا حُمِّلُوا، وَعَلَيْكُمْ مَا حُمِّلْتُمْ" وہ جو کرتا ہے اس کی ذمہ داری اس پر ہے، کل کو قیامت میں اس کا جواب اس کو دینا ہے۔ ہاں! میری ذمہ داری مجھ پر ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کا جو حق میرے اوپر لازم کیا ہے، میں اس کو ادا کروں گا، چاہے وہ میرا حق ادا نہ کرتا ہو۔

یہ سودے بازی نہیں ہے:

”معاملات میں سودے بازی ہوتی ہے، حقوق میں سودے بازی نہیں ہوتی“ دونوں باتیں الگ الگ ہیں جس کو ذرا برابر سمجھ لیجئے۔ جیسے: میں نے آپ سے ایک مکان خریدا، اگر میں پیسے نہ دوں تو آپ مجھے مکان نہ دیجئے۔ آپ مکان نہ دیں، تو میں پیسے نہ دوں؛ یہ تو برابر کا معاملہ ہے، یہ تو سودا ہوا جو آپس کے معاملات میں ہوتا ہے۔ لیکن شریعت نے جو حقوق مقرر کئے ہوئے ہیں، یہ کسی طرح کی سودے بازی نہیں ہے، باپ کے اوپر بیٹے کا حق، یا بیٹے کے اوپر باپ کا حق؛ یہ کوئی سودے بازی نہیں ہے کہ بیٹا باپ کا حق ادا کرے تب ہی باپ بیٹے کا حق ادا کرے گا۔ بلکہ یہ تو اللہ تعالیٰ کا حکم ہے، اور دونوں کے لیے لازم ہے کہ اپنا اپنا کام کریں۔ دونوں میں کوئی ایک نہیں کرتا تو دوسرے کو چاہیے کہ یہ نہ دیکھے کہ وہ کیوں نہیں کرتا، بلکہ وہ خود حق ادا کرنے کا اہتمام کرے۔ یہ سب حقوق ہیں اور حقوق اللہ تعالیٰ نے متعین کئے ہیں۔ اسی ایک اصول کو مدِّ نظر رکھنے کی ضرورت ہے، اگر ہم اس چیز کو پیشِ نظر رکھیں گے، تو ان شاء اللہ کبھی کوئی گڑبڑ کی نوبت نہیں آئے گی۔

ایسے زمانہ میں کیا کرے؟:

حدیث ۶۷۰:-

عن عبد الله بن مسعود رضی اللہ عنہ قال قال رسول الله (ﷺ): إِنَّهَا سَتَكُونُ بَعْدِي أَثَرَةٌ وَأُمُورٌ تُنْكِرُونَهَا! قالوا: يَا رسول الله! كَيْفَ تَأْمُرُ مَنْ أَدْرَكَ مِنَّا ذَلِكَ؟ قَالَ: تُؤَدُّونَ الحَقَّ الَّذِي عَلَيْكُمْ، وَتَسْأَلُونَ اللهَ الَّذِي لَكُمْ. (متفق عليه)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: میرے بعد ترجیحی معاملہ کیا جائے گا، اور ایسی چیزیں ہوں گی جن کو تم اجنبی سمجھوگے یعنی پسند نہیں کروگے۔ اس پر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یارسول اللہ! جو آدمی ایسا زمانہ پالے تو وہ کیا کرے؟ حضورِ اکرم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: ان حاکموں کا تم پر جو حق ہے وہ تم ادا کرو، اور تمہارا ان پر جو حق ہے وہ اللہ تعالیٰ سے مانگو اور اسی سے دعا کرو۔

افادات:- حُکّام جن کے ہاتھ میں اختیارات اور پاورس (Powers) ہوتے ہیں، ان اختیارات کے نتیجہ میں جب وہ کوئی فیصلہ کرتے ہیں تو انصاف کے ساتھ اور حقدار کا حق سمجھ کر کرتے ہیں، لیکن بعض لوگوں کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ صحیح نہیں ہے، اس کو یہ منصب اور عہدہ نہیں دینا چاہیے تھا، وہ آدمی اس لائق نہیں تھا، اس نے اس کی فیور (Favour) کی ہے۔ "أَثَرَةٌ" کے معنٰی فیور کرنا۔ حضورِ اکرم (ﷺ) نے کبھی کوئی معاملہ کیا تو بعض لوگوں نے اس کو بھی فیور پر

محمول کیا تھا جس پر آپ ﷺ نے فرمایا تھا: ہم تو ایسا نہیں کرتے، لیکن آئندہ ایسا ہوگا کہ تم ایسے ترجیحی اور فیور والے معاملات دیکھو گے۔

توحکمرانوں کا معاملہ بڑا پیچیدہ ہوتا ہے، جن کے ہاتھ میں اختیارات ہوتے ہیں، وہ کوئی معمولی چیز نہیں ہے، بلکہ ان کی بڑی ذمہ داریاں ہوتی ہیں۔ اگر وہ اپنی ذمہ داری کے مطابق کام کرتا ہے، پھر بھی اپنے اور پرائے سب ان پر اشکالات کرتے ہیں کہ یہ فیصلہ غلط کیا ہے، اس کو یہ چیز نہیں کرنی چاہیے تھی، فلاں منصب فلاں کو نہیں دینا چاہیے تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یارسول اللہ! جو آدمی ایسا زمانہ پالے اور اپنی آنکھوں سے دیکھے کہ ترجیحی سلوک کئے جارہے ہیں ،نامناسب باتیں ہورہی ہیں؛ تو وہ کیا کرے؟ تلوار نکال کر مقابلہ کے لئے میدان میں آجائے؟ حضورِ اکرم ﷺ فرمایا: اپنا حق وصول کرنے کے لیے آستینیں مت چڑھاؤ، تلوار لے کر میدان میں مت اتر آؤ؛ یہی چیز فتنہ ہے، اور فتنہ چھوٹے انداز میں ہو یا بڑے انداز میں؛ بہت بری چیز ہے۔ اس لیے ان حاکموں کا تم پر جو حق ہے وہ تم ادا کرو، اور تمہارا ان پر جو حق ہے وہ اللہ تعالیٰ سے مانگتے رہو اور دعا کرتے رہو۔

عام طور پر آپ دیکھیں گے کہ جہاں کہیں بھی اس طرح کے فتنے، جنگیں اور لڑائیاں ہوتی ہیں، وہ انہی بنیادوں کے اوپر ہوا کرتی ہیں کہ فلاں ہمارا حق کیوں نہیں

دے رہا ہے، ہم تو اپنا حق وصول کر کے رہیں گے، اسی میں دو پارٹیاں ہو جاتی ہیں اور مقابلہ کی نوبت آجاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ سب کو صحیح سمجھ اور نیک توفیق عطا فرمائے

وُجُوبُ طَاعَةِ وُلَاةِ الْأُمُورِ فِيْ غَيْرِ مَعْصِيَةٍ وَتَحْرِيمُ طَاعَتِهِمْ فِي الْمَعْصِيَةِ

حاکموں کی اطاعت کے احکام مجلس ۳

۸/ ذی قعدہ ۱۴۲۱ھ بسم اللہ الرحمن الرحیم ۳/ فروری ۲۰۰۱ء

بیان چل رہا تھا کہ جو حکمران ہیں ، چاہے وہ حاکمِ اعلیٰ اور بادشاہِ وقت ہوں، یا حاکمِ اعلیٰ کی طرف سے مقرر کردہ ماتحت حاکم ہوں ، پھر وہ ایسی بات کا حکم دیتے ہوں جس میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی لازم نہیں آتی ہو، تو اس صورت میں ان کی اطاعت اور فرماں برداری واجب اور ضروری ہے؛ البتہ گناہ کے کاموں کا وہ حکم دیں تو اس صورت میں اس کو مانا نہیں جائے گا اوران پر عمل نہیں ہو گا۔

جس نے امیر کی اطاعت کی......:

حدیث ۶۷۱ :-

وعن أبي هريرة رضی اللہ عنہ قال:قال رسول الله (صلى الله عليه وسلم) : مَنْ أَطَاعَنِي فَقَدْ أَطَاعَ اللهَ، وَمَنْ عَصَانِي فَقَدْ عَصَى اللهَ، وَمَنْ يُطِعِ الأَمِيرَ فَقَدْ أَطَاعَنِي، وَمَنْ يَعصِ الأمِيرَ فَقَدْ عَصَانِي. (متفق عليه)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیِ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: جس نے میری اطاعت کی گویا اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی۔ اور جس نے میری نافرمانی کی گویا اس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی۔ جس نے امیر کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی، اور جس نے امیر کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی۔

افادات:- اللہ تعالیٰ کی نافرمانی پر آدمی جس گناہ کا مرتکب شمار ہوتا ہے اور اس پر جو سزا مل سکتی ہے ، نبیٔ کریم (ﷺ) کی نافرمانی پر بھی وہی حکم ثابت ہو گا۔اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے حضورِ اکرم (ﷺ) کو بھیجا ہی اس لئے ہے کہ آپ جن چیزوں کا حکم دیں ان پر تمام لوگ عمل کریں، اورجن چیزوں سے حضورِاکرم (ﷺ) منع فرمائیں ان سے لوگ باز رہیں﴿مَاآتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَانَهَاكُمْ عَنْهُ فَانتَهُوا﴾ قرآنِ کریم میں ہے کہ:رسول جس چیز کا حکم دیں اس کو لے لو، اس پر عمل کرو، اور جس چیز سے وہ منع کریں اس سے باز آجاؤ۔تو جس طرح اللہ تعالیٰ کا حکم ماننا اوراس کی اطاعت و فرمانبرداری ضروری ہے، اسی طرح رسولِ پاک کا حکم ماننا اور آپ کی اطاعت وفرمانبرداری بھی ضروری ہے۔اور نبیٔ کریم (ﷺ) کی طرف سے جو حکام اور ماتحت امراء مختلف امورکوانجام دینے کے لئے مقرر کئے جاتے تھے ان کے متعلق حضورِ اکرم (ﷺ) فرماتے ہیں کہ میری طرف سے جو امراء مقرر کئے جائیں، جو ان کی اطاعت کرے گا گویا اس نے میری اطاعت کی۔

عام طور پریہی ہوتا ہے جو حاکمِ اعلیٰ ہوتا ہے یاجو بڑی شخصیت ہوتی ہے،اس کاحکم اور اس کی بات تو لوگ خوشی خوشی مان لیا کرتے ہیں ،اور اس پر عمل کرنے میں اور اس کی اطاعت وفرمانبرداری میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے، لیکن گڑبڑ نیچے آکرہوتی ہے کہ جب ان کی طرف سے کچھ باتیں پیش کی جاتی ہیں تو لوگ ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔حالاں کہ یہ بات بدیہی ہے کہ حاکمِ اعلیٰ تو پورے حدودِ سلطنت میں پہنچ نہیں سکتا، اس کو نظام چلانے کے لئے

اوراپنے ماتحت مختلف شعبوں اور مختلف کاموں کو انجام دینے کے لئے آدمی مقرر کرنے ہی پڑیں گے۔اور ظاہر ہے کہ جو شعبہ جس کے حوالہ کیا جائے گا اس شعبہ سے متعلق اختیارات بھی اس کودیئے جائیں گے،تو اس نے جن لوگوں پر اعتماد کیا ہے اور جن کی صلاحیتوں کو قابل سمجھتےہوئے ان کو متعین کیا ہے،ان حضرات کے متعلق حضورِ اکرم (ﷺ) فرماتے ہیں کہ جس نےان مقررکردہ لوگوں کی اطاعت کی گویااس نے میری اطاعت کی، اور جس نے ان کی نافرمانی کی اس نے گویا میری نافرمانی کی۔

گورنمنٹ کا اصول بھی یہی ہوتاہے۔گورنمنٹ کے عملہ اوراسٹاف کی طرف سے گورنمنٹ کے قوانین اور اصول کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے جو حکم جاری کیا جائے گا، اس حکم کو مانااوراس پر عمل کرنا اسی طرح ضروری ہوتاہے جیسا اوپر والے حاکم کی طرف سے جاری کئے ہوئے حکم کوماننا۔اگر اس کی خلاف ورزی کی جاتی ہے تو اسی طرح سزا کا حقدارہوتاہے جس طرح حاکمِ اَعلیٰ کے حکم کی خلاف ورزی کی صورت میں سزا کا حقدار ہوتاہے،اس کے بغیر کسی بھی سلطنت کا نظام،اورکوئی بھی نظمِ مملکت چل ہی نہیں سکتا، اسی لئے حضورِ اکرم (ﷺ) نے خاص طور پر اس طرف متوجہ کیا ہے۔

ایک اہم اصول:

ہمارے سماج اور معاشرہ میں مختلف طریقوں سے جو نظام چلائے جاتے ہیں ، چاہے انجمنوں کی شکلوں میں ہوں ،چاہے جماعتوں کی شکلوں میں ہوں ،یا مسجد و مدرسہ کا نظام ہو، ہرایک جگہ نظام چلانے کے لئے ایک تو سربراہ مقرر کیا جاتا ہے اور پھر وہ سربراہ اپنے ماتحت کاموں کو انجام دینے کے لئے مختلف لوگوں کو مقرر کرتا ہے،توعام طورپردوسروں کی طرف سے رکاوٹیں نیچے والوں کے معاملہ میں ہی پیش آتی ہیں ،وہ یوں سمجھتے ہیں کہ مَیں اس کی کیوں مانوں؟میں تواس سے اونچاہوں۔توان کویہ سوچنا چاہیے کہ دراصل وہ اِس کی نہیں مان رہے ہیں ،بلکہ اِس کو جس نے مقرر کیا ہے اُس کی مان رہے ہیں ،اگریہی بات سمجھ لیں گے تو پھر کبھی کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی، اور کبھی کوئی گڑبڑ نہیں ہوگی۔جتنے بھی جھگڑے اور اختلافات شروع ہوتے ہیں اوراس قسم کے نظاموں کو چلانے میں جو دشواریاں پیش آتی ہیں، اس کی بنیادی وجہ یہی ہوتی ہے۔

جاہلیت کی موت:

حدیث ۶۷۲:-

وعن ابن عباس رضی اللہ عنہما أن رسول الله (ﷺ) قال: مَنْ كَرِهَ مِنْ أَمِيرِهِ شَيْئاً فَلْيَصْبِرْ، فَإِنَّهُ مَنْ خَرَجَ مِنَ السُّلْطَانِ شِبْراً مَاتَ مِيتَةً جَاهِلِيَّةً. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: جو آدمی اپنے بادشاہ اور امیر کی طرف سے کسی چیز کو ناپسند سمجھے (یعنی امیر نے کوئی حکم دیا، یا کوئی معاملہ اور سلوک اس کے ساتھ ایسا کیا جو اس کو ناگوار ہے ، اس کی طبیعت اس کو پسند نہیں کرتی) تو اس کو چاہیے کہ صبر کرے(نہ کوئی مقابلہ کرے اور نہ اس کے خلاف کرے)اس لیے کہ جو آدمی حاکم کی فرمانبرداری سے ایک بالشت بھی باہر نکلا، وہ جاہلیت کی موت مرا۔

افادات:- اس لئے کہ مقابلہ کرنے، اس کی خلاف ورزی کرنے اور اس کی نافرمانی کرنے میں بڑی خرابیاں ہیں، ایسے ایسے نقصانات ہیں جس کی کوئی تلافی ہو ہی نہیں سکتی، لہٰذا جب یہ اس کا اپنا ذاتی معاملہ ہے تو صبر سے کام لے۔

اورچوں کہ زمانۂ جاہلیت میں اس طرح کا کوئی نظام نہیں تھا، ہر قبیلہ اپنا ایک الگ نظام، اوراپنی الگ حکومت چلاتا تھا، اسلام نے آکروہ سارے نظام ختم کرکے ایک امیر کے ماتحت سب لوگوں کو لاکراس ایک امیر کی اطاعت کوضروری قرار دیا، اور ایک اجتماعی نظام انسانوں کو عطافرمایا، پھر اس نظام کو چلانے کے لئے حکام کی تعیین کی گئی اور ان کے ذریعہ سے پورے نظام کو چلایا گیا۔یہ ساری چیزیں ایسی ہیں جو اسلام نے آکربتلائیں ،ورنہ زمانۂ جاہلیت میں

عربوں میں ایسا کوئی نظام نہیں تھا، اس لئے حضورِ اکرم (ﷺ) فرماتے ہیں :جو اس کی خلاف ورزی کرے گا گویا اس نے جاہلیت والا طریقہ اپنانا چاہا،اسی لئے وہ جاہلیت کی موت مرے گا۔

جس نے حاکم کی توہین کی:

حدیث ۶۷۲ :-

وعن أبي بكرة رضی اللہ عنہ قال:سمعتُ رسولَ اللهِ (ﷺ) يقول:مَنْ أهانَ السُّلطَانَ؛أَهَانَهُ اللهُ. (رواہ الترمذی وقال:حديث حسن)

ترجمہ:- حضرت ابو بکرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبیٔ کریم (ﷺ) کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا : جس نے حاکم اور بادشاہ کی بے عزتی اور توہین کی، اس کے ساتھ اس کی شان کے خلاف معاملہ کیا؛ اللہ تبارک و تعالیٰ ایسے آدمی کو بے عزت کرے گا۔

افادات:- اس لئے کہ جو حاکمِ اَعلیٰ ہوتا ہے اس کے ساتھ اس طرح کا سلوک کیا جانا پورے نظم ونسق کو برباد کرنے کا ذریعہ بنتا ہے،ہر ایک کو جرأت نہیں ہوتی لیکن کسی ایک آدمی نے جرأت کرلی تو گویا اس نے دوسروں کو بھی جرأت پر آمادہ کیا، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ نظام کا سارا ڈھانچہ ختم ہوجائے گا،اس ایک کی اہانت پورے نظام کی بربادی کی شکل میں ظاہر ہوگی،اور ظاہر ہے کہ اس کے نقصانات کتنے ہوسکتے ہیں؟ اسی لئے حضورِ اکرم (ﷺ) نے فرمایا: جس نے حاکم کی توہین کی، اللہ تعالیٰ اس کی توہین اور بے عزتی کرے گا۔وہ آدمی یہ نہ سمجھے کہ ایسا

کرکے میرا کچھ بگڑنے والا نہیں ہے، قدرت کی طرف سے تکوینی طور پر اس کے ساتھ اسی کے مناسب سزا کا معاملہ کیا جائے گا۔

اَلنَّهْيُ عَنْ سُؤَالِ الْإِمَارَةِ

وَاخْتِيَارُ تَرْكِ الْوِلَايَاتِ إِذَا لَمْ يَتَعَيَّنْ عَلَيْهِ

عہدہ طلب کرنے کی ممانعت

اور اختیاری صورت میں عہدہ قبول نہ کرنا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اسلامی اصول:

اگر کوئی آدمی اپنی طرف سے کوئی عہدہ مانگے اور طلب کرے ؛تواسلام اس کی اجازت نہیں دیتا،لیکن اگرکسی آدمی کے اندر صلاحیت ہے اور وہ باکمال شخصیت ہے اس میں ایسے اوصاف ہیں کہ ذمہ داری کے کاموں کوانجام دے سکتا ہے، توخود حاکمِ اَعلیٰ کو چاہیے کہ وہ اس کوذمہ داری حوالہ کرے۔ویسے بھی اسلام نے تو ایک اصول بتادیاہے: ﴿إِنَّ اللهَ يَأْمُرُكُمْ أَن تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا﴾ اللہ تعالیٰ حکم دیتے ہیں کہ تم امانتیں ان کے حق داروں تک پہنچاؤ۔ حکومتوں کے یہ عہدےاور مناصب بھی ایک طرح کی امانت ہیں ، اسی لئے نبی ٔکریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا کہ: کسی آدمی نے کسی کو کوئی عہدہ و منصب دیا، اور اس قوم میں اس سے اچھا آدمی موجودہےجواس ذمہ داری کو اس سے بھی اچھی طرح ادا کر سکتا ہے؛تو اس نے اللہ تعالیٰ اوراس کے رسول (ﷺ) کے ساتھ خیانت کی۔یعنی جس کوعہدہ دیاہے،اس کے مقابلہ میں دوسرے آدمی میں اس سے اچھی صلاحیتیں موجودہیں ، اورحاکم بھی اس کوجانتا ہے اوراس کو دینے میں کوئی دوسری رکاوٹ اورمانع بھی نہیں ہے،اس کے باوجود اُس کو نہ دے کردوسرے کو وہ منصب وعہدہ دیا؛ تواسلام کی تعلیم کے مطابق اس نے خیانت کی۔حاکمِ اعلیٰ کی ذمہ داری ہے کہ مناصب وعہدوں کی تقسیم کے وقت جب کسی آدمی کو تجویز کیا جائے تو ان کمالات،

صلاحیتوں اور اوصاف کی بنیاد پر تجویز کیا جائے جو اس کام کو انجام دینے کے لیے ہونے چاہئیں۔ جس میں جتنی زیادہ صلاحیت ہو اسی کو دینا چاہیے، اگر اس کو نہ دے کر اس سے کم صلاحیت والے کو دیا گیا تو اس نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول (ﷺ) کے ساتھ خیانت کی۔ جب اسلام کی تعلیم یہ ہے تو پھر کسی کو کوئی عہدہ مانگنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے حاکمِ اعلیٰ کو حکم دیا گیا ہے کہ جو باصلاحیت ہو اس کو پیشکش کرے۔ باقی خود ہی مانگنا کہ مجھے یہ عہدہ و منصب دیا جائے، اسلام اس کو پسند نہیں کرتا۔

باصلاحیت آدمی کے لیے دو راستے ہیں:

پھر یہ ہے کہ کسی کو اس کی صلاحیت اور کمالات کی وجہ سے کوئی عہدہ دیا جارہا ہو، جیسے: صدر بنایا جارہا ہو، سکریٹری بنایا جارہا ہو؛ تو اس کو قبول کرنا چاہیے یا نہیں؟

بعض مرتبہ شکل ایسی ہوتی ہے کہ پورے سماج و معاشرہ اور پوری کمیونٹی (community) میں کوئی ایسا ہے ہی نہیں جو اس عہدہ کو سنبھال سکے، صرف یہی اکیلا ہے۔ کسی دوسرے میں ایسے اوصاف نہیں جو اس ذمہ داری کو امانت داری کے ساتھ کماحقہ پورا کر سکے، سب لوگ کہتے ہیں کہ یہ کام تو یہی کر سکتا ہے، کوئی دوسرا نہیں کر سکتا؛ تو پھر اس کو انکار کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ ایسی صورت میں تو اس کی یہ ذمہ داری ہو جاتی ہے کہ اس ذمہ داری کو قبول کر لے، اگر انکار کر دے گا تو گنہگار ہو گا۔

لیکن اگر ایسا نہیں ہے، اس ذمہ داری کو انجام دینے کی صلاحیت رکھنے والا یہ اکیلا نہیں ہے بلکہ اور بھی بہت سارے لوگ اسی کے برابری اور لیول کے موجود ہیں جو اس ذمہ داری کو قبول کرسکتے ہیں، اور پھر اس سے کہا جارہا ہے کہ آپ قبول کیجئے، تو اس صورت کے اندر اپنے آپ کو اس ذمہ داری سے بچانے کے واسطے یہ سوچتے ہوئے انکار کرتا ہے کہ ذمہ داری کا کام ہے، پتہ نہیں کہ مجھ سے پورے طور پر یہ ذمہ داری ادا ہوگی یا نہیں، اس امانت کو پورے طور پر انجام دے سکوں گا یا نہیں، اس لیے کہتا ہے کہ یہ عہدہ مجھے نہیں چاہیے، میں اس ذمہ داری کو قبول کرنا اور یہ بوجھ اٹھانا نہیں چاہتا، یہ کام مجھ سے نہیں ہوگا، یا میں اس سے اپنے آپ کو بچانا چاہتا ہوں؛ تو شرعاً اس کی اجازت ہے۔

اسلام اس نظریہ کا قائل ہی نہیں:

لیکن اسلام نے سامنے سے کسی عہدہ اور منصب کو مانگنے کی تو بالکل اجازت دی ہی نہیں۔ آج کل تو معاملہ بالکل بدل ہی گیا ہے۔ الیکشن میں خود ہی امید واری کرتے ہیں کہ مجھے ذمہ دار بناؤ، حالاں کہ اسلام اس نظریہ کا قائل ہی نہیں اور اس نظریہ کو بالکل پسند ہی نہیں کرتا۔ اسلام تو کہتا ہے کہ آپ لوگوں سے نہ کہو، لیکن اگر ذمہ دار، اہل الرای، اربابِ حل وعقد آپ کی ان صلاحیتوں کو دیکھ کر آپ سے کہیں کہ آپ کو ہی یہ کام کرنا ہے اور آپ منع کریں؛ تو یہ اصل بات ہے۔ ایسا نہیں کہ ساری دنیا منع کرتی ہے کہ ان کو نہیں دینا ہے، لیکن

آپ کہتے ہیں کہ:"میں ہی صدر بنوں گا، میں ہی سکریٹری بنوں گا، اور میں بھی دیکھتا ہوں کہ کون میرے مقابلہ پر آتا ہے؟" اسلام اس نظریہ کا قائل نہیں ہے، یہ تو بڑی گڑبڑ والی چیز ہے۔

آخرت کا گھر کس کے لیے؟:

باری تعالیٰ کا ارشاد نقل کیا:﴿تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِينَ لَا يُرِيدُونَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ وَلَا فَسَادًا وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ (القصص:۸۳)﴾اس آیت سے پہلے آخرت کی کچھ چیزیں بیان کی گئی تھیں، اس کے بعد باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ آخرت کا وہ گھر ہم انہی لوگوں کو دیں گے، انہی کے لیے ریزروڈ (Reserved) رکھتے ہیں جو زمین میں بڑا بننا نہیں چاہتے، اور نہ زمین میں فساد پھیلانا چاہتے ہیں، اورانجام تو نیکوکاروں کے واسطے ہی ہے۔ یعنی جو اللہ تعالیٰ کے احکام پر چلتے ہیں اور نافرمانیوں سے اپنے آپ کو بچاتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ اپنے آپ کو بڑائی طلب کرنے سے بھی بچاتے ہیں؛ ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ آخرت میں کامیاب کرتا ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ کے نزدیک جو بندے آخرت کے حقدار ہیں ان کا مخصوص وصف ﴿لَا يُرِيدُونَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ﴾ ہے کہ وہ عہدہ نہیں چاہتے، ان کا مزاج ایسا ہے کہ ان کو کوئی عہدہ دیا جائے تب بھی وہ منع کرتے ہیں، ہاں! لوگوں کے اصرار کے نتیجہ میں قبول کرلیں؛ تو یہ بات اور رہی، لیکن وہ اپنی طرف سے اس کے خواہش مند نہیں ہوتے، بلکہ ان کی خواہش تو یہ ہوتی ہے کہ یہ عہدہ مجھے نہ سونپا جائے۔

اگر مدد چاہتے ہو تو عہدہ مت مانگو:

حدیث ۶۷۴:-

وعن أبي سعيد عبد الرحمن بن سمرة رضی اللہ عنہ قال قال لی رسول الله (ﷺ) : يَا عَبْدَ الرَّحمان بن سَمُرَةَ! لاَ تَسْأَلِ الإِمَارَةَ، فَإِنّكَ إن أُعْطِيتَهَا عَنْ غَيْرِ مَسْأَلَةٍ أُعِنْتَ عَلَيْهَا، وَإِنْ أُعْطِيتَهَا عَنْ مَسْأَلَةٍ وُكِلْتَ إِلَيْهَا، وَإِذَا حَلَفْتَ عَلَى يَمِينٍ، فَرَأَيْتَ غَيْرَهَا خَيْرًا مِنْهَا، فَأْتِ الَّذِي هُوَ خَيْرٌ وَ كَفِّرْ عَنْ يَمِينِكَ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت عبدالرحمن بن سمرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (ﷺ) نے مجھ سے ارشاد فرمایا: اے عبدالرحمن! عہدہ مت مانگو، امارت مت طلب کرو، سرداری کا سوال مت کرو(کہ مجھے پرسیڈنٹ بناؤ، مجھے سکریٹری بناؤ) اس لئے کہ (اللہ تعالیٰ کے یہاں ایک اصول ہے کہ) جو عہدہ اور منصب بغیر مانگے ہوئے ملتا ہے اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کی مدد ہوگی، اور اگر آپ کے طلب کرنے اور مانگنے سے ملا ہے، تو(اللہ تعالیٰ کی مدد نہیں ہوگی، بلکہ) تمہارے حوالہ کردیا جائے گا۔اور جب تم نے کسی کام کی قسم کھائی اور دوسرا کام ایسا ہے جو اس سے بہتر ہے تو ایسی قسم کو چھوڑ کر دوسرے اچھے کام کو انجام دو اور قسم ٹوٹنے کا کفارہ دیدو۔

افادات:- آدمی نے کوئی عہدہ مانگا نہیں تھا، کوئی مطالبہ نہیں کیا تھا، بلکہ ذمہ داروں نے اس کی صلاحیتوں کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے بغیر طلب کے اس پر ڈالا ہے؛ تو اس صورت میں اس عہدہ کی جو ذمہ داریاں ہیں ان کو انجام دینے میں اور اس ڈیوٹی کو پورا کرنے میں اللہ تعالیٰ اس

کی مدد کرے گا۔اوراگر کوئی عہدہ سامنے سے مانگتاہے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اس بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ میں اس کام کو انجام دینے کی صلاحیت رکھتا ہوں،باری تعالیٰ کہتے ہیں کہ: اچھا!اب اس کام کو تم ہی انجام دو۔

چھوٹے سے چھوٹے کام میں بھی آدمی کو چاہیے کہ اپنی ذات کے اوپر اعتماد نہ کرے،ہر کام میں اعتماد اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہونا چاہیے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ ہی وہ کام کرواسکتاہے،اور کسی کا سامنے چل کر عہدہ مانگنا؛ اللہ تعالیٰ کی ذات کے بجائے اپنی ذات پر اعتماد کی دلیل ہے۔

عمدہ مثال:

جیسے:ایک باپ کئی فیکٹریوں کا مالک ہے ،اس کے ماتحت کئی طرح کے کام ہیں،اس کے بیٹوں میں سے ایک بیٹا کہتا ہے کہ: اباجان! مجھے فلاں پوسٹ دیدو،میں اس عہدہ پر کام کروں گا، اپنی طرف سے اس نے ابا سے یہ فرمائش کی کہ مجھے اس عہدہ پر کام کرناہے۔تواس کی طرف سے یہ فرمائش کرنااس بات کی دلیل ہے کہ وہ یوں سمجھتا ہے کہ میں اس عہدہ کا حقداراور اہل ہوں ، اور میں اس کام کو برابر انجام دوں گا۔ویسے باپ کی خواہش تو یہ تھی کہ وہ دوسرے کو دیتا ،لیکن یہ سامنے سے مانگ رہا ہے۔

ایک شکل یہ تھی کہ اس نے مانگا نہیں، بلکہ باپ نے کہا کہ تم یہ کام کرو، اور وہ منع کرتا ہے کہ ابا جان! مجھے نہیں چاہیے، اس کے منع کرنے کے باوجود جب باپ وہ کام سونپے گا، تو پھر اس پر برابر نظر بھی رکھے گا، ذرّہ بھی اِدھر اُدھر ہوگا تو فوراً باپ اس کو ڈائریکشن دے گا کہ بیٹا! ایسا نہیں، بلکہ ایسا کرو۔ ہمہ تن اس کی طرف متوجہ رہے گا کہ کہیں چوک نہ ہوجائے۔ لیکن جس نے خود ہی مانگا ہے، اور کہیں گڑبڑ کا موقع آئے گا تو باپ سوچے گا کہ چلو! دیکھتے ہیں وہ کیا کرتا ہے؟ بہت اکڑتا تھا کہ میں کرکے دوں گا تو اب دیکھتے ہیں کہ وہ کیا کرتا ہے؟ قدرت کی طرف سے بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔

بہتر کام کو انجام دینے کے لیے قسم توڑنا:

اس روایت میں دوسری چیز یہ بتلائی گئی کہ کسی بات پر قسم کھائی ہو، اور اس کے علاوہ دوسرا کوئی کام تمہیں اچھا معلوم ہوا، جیسے: کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی معاملہ پر آدمی قسم کھالیتا ہے کہ فلاں جگہ نہیں جاؤں گا، لیکن وہاں جانے میں ہی خیر معلوم ہوتی ہے۔ یا کسی نے قسم کھالی کہ میں فلاں سے بات نہیں کروں گا، لیکن جب مسئلہ پوچھا تو معلوم ہوا کہ ایسی قسم کھانا جائز نہیں ہے، اس لیے اس قسم کو توڑو اور اس سے بات کرلو۔ جب بات کروگے تو قسم ٹوٹے گی، تو اس کا کفارہ دیدو۔ تو کسی کام کی قسم کھائی اور دوسرا کام سامنے آیا جو اس سے بہتر ہے تو ایسی قسم کو چھوڑ کر دوسرے اچھے کام کو انجام دینا چاہیے، اور قسم ٹوٹنے کا کفارہ دے دینا چاہیے۔

پہلے بھی کئی بار یہ قصہ بتاچکاہوں کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت مسطح بن آثاثہ رضی اللہ عنہ کے متعلق قسم کھائی تھی کہ ان کو خرچہ نہیں دوں گا، پھر اللہ تعالیٰ نے آیت نازل فرمائی جس میں کہا گیا کہ: معاف کر دو، اللہ تعالیٰ معافی کو پسند کرتا ہے، کیا تم یہ نہیں چاہتے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے گناہوں کو معاف کرے؛ تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے خرچہ دیناشروع کر دیا۔ کسی پر خرچ نہ کرنے کے مقابلہ میں اس پر خرچ کرنا اچھا کام ہے، چناں چہ اس کو اختیار کرنے پر قسم کا کفارہ دیدیا۔

کسی دو آدمیوں کے اوپر بھی امیر مت بننا:

حدیث ۶۷۵:-

وعن أَبِي ذرٍّ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رسول الله (صلی اللہ علیہ وسلم): يَاأَبَاذَرٍّ! إِنِّي أَرَاكَ ضَعِيفاً، وَإِنِّي أُحِبُّ لَكَ مَا أُحِبُّ لِنَفْسِي. لاَ تَأَمَّرَنَّ عَلَى اثْنَيْنِ، وَلاَ تَوَلَّيَنَّ مَالَ يَتِيمٍ.

ترجمہ:- حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھ سے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: اے ابوذر! میں تمہیں کمزور پاتا ہوں (یعنی تمہارا حال دیکھ کر مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ تم میں ضعف وکمزوری ہے) اس لئے میں تمہارے لئے وہی بات پسند کرتا ہوں جو اپنے لئے پسند کرتا ہوں؛ لہٰذا دو آدمیوں پر بھی امیر مت بننا، اور کسی یتیم کے مال کا والی مت بننا۔

افادات:- امیر اور سربراہ بننا بڑی ذمہ داری کا کام ہے، چاہے کسی بھی شعبہ میں ہو،اس کی وجہ سے بہت بوجھ سر پر آجاتا ہے۔اس لیے حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا:تم کمزور ہو،لہٰذا دو آدمیوں کے اوپر بھی امیر اور سربراہ مت بننا۔اور کسی یتیم کے مال کا والی مت بننا، اس لئے کہ یتیم کے مال کی ذمہ داریاں بھی بہت بڑی ہیں ،ذرّہ برابر بھی اس میں اِدھر اُدھر ہوگیا تو اللہ تعالیٰ کے یہاں بڑا سخت جواب دینا پڑے گا۔

کہنے کا حاصل یہ ہے کہ لوگوں میں بھی اس طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔بعض وہ ہوتے ہیں کہ جن کو اس طرح کی ذمہ داری اگر سونپی جائے اوروہ اپنے مزاج اور اپنی طبیعت کے پیشِ نظر یہ سمجھتا ہو کہ میں اپنی کمزوری کی وجہ سے اس ذمہ داری کو پورے طور پر کماحقہٗ ادا نہیں کرسکوں گا،تو پھر اس کو چاہیے کہ ایسی ذمہ داری قبول نہ کرے۔

امارت سببِ ندامت:

حدیث ٦٧٦:-

وعنه،قَالَ:قُلْتُ:يَارسول الله!ألا تَسْتَعْمِلُنِی؟فَضَرَبَ بِيَدِهِ عَلَى مَنْكِبِی،ثُمَّ قَالَ:يَا أَبَا ذَرٍّ!إِنَّكَ ضَعِيفٌ،وإنّها أمانةٌ،وَإِنَّهَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ خِزْيٌ وَنَدَامَةٌ،إِلاَّ مَنْ أَخَذَهَا بِحَقِّهَا،وَأَدَّى الَّذِی عَلَيْهِ فِيهَا.(رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ میں نے خود ہی حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) سے درخواست کی:اے اللہ کے رسول!آپ مجھے کسی جگہ کا عامل (حکمران) نہیں بناتے؟(فلاں کو آپ نے

فلاں جگہ بھیجا، فلاں کو فلاں جگہ؛ مجھے بھی کسی جگہ کا امیر بنادو، حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میری اس درخواست پر) نبی کریم (ﷺ) نے میرے کندھے پر ہاتھ مارااور فرمایا:اے ابوذر!تم کمزور ہو،اور کسی جگہ کا تم کو امیر بنادیا جانا(ایک طرح کا منصب و عہدہ ہے،جو) ایک طرح کی امانت ہے(یہ دنیا میں تو بہت اچھالگتا ہے کہ بڑائی ملتی ہے،عہدہ و منصب ملتاہے)لیکن(اگراس کا حق ادا نہیں کیاگیا تو)قیامت کے روزیہی چیز رسوائی اورندامت کا سبب ہوگی۔ہاں ! جو اس کا حق اداکرے اور اس ذمہ داری کو قبول کرنے پر جو جوکام سرپر آتے ہیں ، ان کو پورے طورپرانجام دے ؛تب تو ٹھیک ہے۔

افادات:-اس روایت کو لاکر یہ بتلاناچاہتے ہیں کہ اپنی طرف سے تو سوال کرناہی نہیں چاہیے؛لیکن اگرسامنے سے کوئی ذمہ داری دی جارہی ہو تو اس کو چاہیے کہ برابردیکھ لے کہ یہ ذمہ داری جو میرے حوالہ کی جارہی ہے اس کو میں پورے طورپرانجام دے سکتا ہوں یا نہیں ؟اس ذمہ داری کوانجام دینے کے لئے جن وسائل اور اسباب ، جن کمالات وخوبیوں، جس صلاحیت اور قابلیت کی ضرورت ہے وہ مجھ میں ہے یانہیں؟اگر نہیں ہے تو پھر اس کو قبول نہ کرے،اس لئے کہ اس صورت میں اس کا حق ادا نہ ہوسکے گا، اور حق ادا نہ ہونے کی صورت میں ظاہر ہے کہ امانت میں خیانت ہوگی اور قیامت کے روز رسوائی ہوگی۔

حدیث ٦٧٧:-

وعن أبي هريرة رضی اللہ عنہ **أن رسول الله (ﷺ) قال: إِنَّكُمْ سَتَحْرِصُونَ عَلَى الإِمَارَةِ، وَسَتَكُونُ نَدَامَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ.** (رواہ البخاری)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: تم لوگ امارت (حکمرانی، کرسی ومنصب) کی حرص ولالچ رکھوگے، آرزو رکھوگے اور تمنا کروگے؛ لیکن یہی چیز قیامت کے روز ندامت اور پچھتاوے کا ذریعہ بنے گی۔

افادات:- فلاں عہدہ مجھے مل جائے، میں صدر بن جاؤں، میں سیکریٹری بن جاؤں، لیکن یہی چیز قیامت کے روز ندامت اور خسارہ کا ذریعہ بنے گی۔اس روایت میں بھی وہی بات ارشاد فرمائی گئی جو اوپر گزرچکی ہے کہ مانگنے کی صورت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدد نہیں ہوگی،اور مدد نہ ہونے کی صورت میں اس کے حقوق کی ادائیگی میں جو حق تلفی ہوگی اور کمی رہ جائے گی، اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے قیامت کے روز سزا بھگتنی پڑے گی۔اسی لئے حضور (ﷺ) نے فرمایا: تم حرص تو رکھتے ہو، لیکن یہی چیز قیامت میں ندامت کا ذریعہ بنے گی۔

حَثُّ السُّلْطَانِ وَالْقَاضِيْ وَغَيْرِهِمَا مِنْ وُلَاةِ الْأُمُوْرِ عَلٰى إِتِّخَاذِ وَزِيْرٍ صَالِحٍ وَتَحْذِيْرِهِمْ مِنْ قُرَنَاءِ السُّوْءِ

بادشاہ اور قاضی وغیرہ حکمرانوں کو اپنے لئے صالح مشیر رکھنے کی ترغیب

اور برے ساتھیوں سے بچنے کی تاکید

بسم اللہ الرحمن الرحیم

صالح آدمی کو مشیر بناؤ:

اس باب میں یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ حکمران جن کے ہاتھ میں کرسی کی وجہ سے کچھ پاورس اور اختیارات ہیں ،چاہے حاکمِ اعلیٰ ہو، کسی جگہ کا گورنر یا کلکٹر ہو، قاضی ہو، یا جتنے بھی سربراہانِ مملکت ہیں ؛ان کو چاہیے کہ کسی صالح آدمی کو اپنا مشیر مقرر کرلیں۔ اس لیے کہ جتنے بھی ذمہ دار اور حکمران ہوتے ہیں ان کے پاورس سے فائدہ اٹھانے کے لیے ان کے آس پاس بہت سارے لوگ جمع ہوجاتے ہیں جو ان کو مشورہ دینے کا کام کرتے ہیں۔اس لیے ایسے لوگوں کو چاہیے کہ کسی صالح اور نیک آدمی کو -جو اس کام کی صلاحیت بھی رکھتا ہو- اپنے لیے مشیر مقرر کرلیں۔ اور بُرے رفقاء اور ساتھیوں سے اپنے آپ کو بچائیں اور ایسوں کی بات ماننے سے بچیں ؛ورنہ یہی لوگ ان کے لیے ہلاکت کا اور جہنم میں ڈھکیلے جانے کا ذریعہ بن جائیں گے۔

دنیا کی دوستیاں قیامت کی دشمنیاں :

اس سلسلہ میں علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے قرآنِ پاک کی ایک آیت پیش کی ہے جو اپنے عام مفہوم کے لحاظ سے یہاں بھی صادق آتی ہے: ﴿اَلْأَخِلَّاءُ يَوْمَئِذٍ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ إِلَّا الْمُتَّقِيْنَ﴾(سورۂ زخرف:٦٧) دنیا کے اندر آپس میں جو دوستیاں کی جاتی ہیں ، خاص کر وہ دوستیاں

جو اپنی اغراض کی بنیاد پر ہوتی ہیں ،ایسی سب دوستیاں قیامت کے روز دشمنیوں میں تبدیل ہوجائیں گی،اور جب وہاں اس کا نتیجہ ظاہر ہوگا تو یہ سب ایک دوسرے کے خلاف بارگاہِ الٰہی میں مقدمہ دائر کریں گے کہ اس نے میرا یوں کیا اور توں کیا﴿ إِلَّا الْمُتَّقِيْنَ﴾البتہ جو لوگ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے ہیں ،اور جن کا تعلق آپس میں اپنی اغراض کی بنا پر نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی نسبت پر ہے،ایسی دوستی دنیا میں بھی کارآمد ہے اور آخرت میں بھی کام آئے گی کہ یہ دوستی دشمنی سے نہیں بدلے گی، بلکہ باقی رہے گی،اوراس سے ان شاء اللہ فائدہ بھی پہنچے گا۔

قاعدۂ کلیہ:

حدیث ٦٧٨:-

وعن أَبِي سعيدٍ وأَبِي هريرة رضی اللہ عنہما أَنَّ رسولَ الله (صلی اللہ علیہ وسلم) قَالَ:مَا بَعَثَ اللهُ مِنْ نَبِيٍّ ، وَلاَ اسْتَخْلَفَ مِنْ خَلِيفَةٍ إِلاَّ كَانَتْ لَهُ بِطَانَتَانِ:بِطَانَةٌ تَأْمُرُهُ بِالمَعْرُوفِ وتَحُضُّهُ عَلَيْهِ ، وَبِطَانَةٌ تَأْمُرُهُ بِالشَّرِّ وَتَحُضُّهُ عَلَيْهِ ، وَالمَعْصُومُ مَنْ عَصَمَ اللهُ (رواہ البخاری)

ترجمہ:- حضرت ابوسعید خدری اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا:اللہ تعالیٰ نے جو بھی نبی بھیجا،یا جس کو خلیفہ بنایاہے،ان کے کچھ خصوصی مشورہ دینے والے ہوتے ہیں، جن میں کچھ لوگ اچھے بھی ہوتے ہیں جو اس کو اچھا مشورہ دیتے ہیں اور بھلائی کے لیے آمادہ کرتے

ہیں، اور کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو برا مشورہ دیتے ہیں اور برائی کے لئے آمادہ کرنے والے اور برائی کی ترغیب دینے والے ہوتے ہیں؛ لیکن معصوم تو وہی رہتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ بچالے۔

افادات:- "بِطَانَةٌ" ایسا آدمی جو بالکل اندر گھسا ہوا ہو، جس کا اس کے اوپر پورا پورا اثر ہوتا ہے، اور وہ مشورہ کے طور پر اپنی ہی بات منواتا ہے۔ اس روایت کے الفاظ پر غور کیجئے "مَابَعَثَ اللّٰهُ مِنْ نَبِيٍّ" جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کے پاس بھی دونوں طرح کے لوگ ہوں گے۔

اس روایت میں نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایک اصول اور قاعدۂ کلیہ بتلادیا کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں یہی دستور ہے کہ اگر کسی کو کسی جگہ کی حکمرانی یا کسی جگہ کی کوئی ذمہ داری سونپی جاتی ہے- اور یہ حکم عام ہے، چاہے وہ سربراہِ اعلیٰ اور بادشاہِ وقت ہو، یا کسی صوبہ کی سربراہی ہو، یا اپنی قوم، اپنے خاندان، اپنے قبیلہ کی سرداری، ذمہ داری اور امارت ہو- تو اس امیر کے پاس اثر انداز جو حلقہ ہوتا ہے، اس میں دونوں قسم کے لوگ ہوتے ہیں، اچھائی کا مشورہ دینے والے، بھلائی کی ترغیب دینے والے بھی ہوتے ہیں اور برائی کے لیے ابھارنے والے بھی ہوتے ہیں۔ جتنے بھی صاحبِ اختیار لوگ ہوں گے، جیسے: کسی کو کسی جماعت و برادری کا پریسیڈنٹ بنادیا گیا، کسی کو مدرسہ کا مہتمم بنادیا گیا، کسی کو مسجد کا متولی بنادیا گیا، ان سب کے لیے یہی قانون ہے۔ پھر اگر اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے خیر مقدر فرمائی ہے تو وہ اچھے مشورے دینے والوں ہی کی سنے گا، اس کی سمجھ میں انھی کی بات بیٹھے گی اور وہی کرے گا، دوسروں کی بات پر دھیان بھی نہیں دے گا، لہٰذا اچھا مشورہ دینے والوں کی وجہ سے اگر اچھا فیصلہ کرے گا وہ کام اچھے طریقہ سے انجام پذیر ہوگا۔ اور اگر

اللہ تعالیٰ کی طرف سے توفیق شاملِ حال نہیں ہے تو پھر غلط مشورے دینے والوں کی بات ہی اس کی کھوپڑی اور دماغ میں بیٹھے گی، اچھی راہ دکھانے والوں کی بات سمجھ میں ہی نہیں آئے گی اور ان کی نہیں مانے گا، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی توفیق چھین رکھی ہے۔اس سے معلوم ہوا کہ کوئی آدمی ایسا ہے ہی نہیں جس کے پاس اچھی بات پہنچتی ہی نہ ہو۔

مصاحبین سے بدگمانیاں مت کرو:

اور یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی کے آس پاس کے حلقہ کے بارے میں دور رہ کر بدگمانی میں مبتلا ہونے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ہمارے سماج ومعاشرہ میں صاحبِ اختیار کے پاس بیٹھنے والوں کے متعلق بھی بہت زیادہ بدگمانیاں کی جاتی ہیں ، اگر صاحبِ اختیار نے کوئی غلط فیصلہ اور اقدام کیا، تو کہیں نہ کہیں سے وہ بات اس کے کان میں پڑی ہوگی، لیکن ہم لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ متعین ہی کردیتے ہیں کہ فلاں نے ہی ایسا کہا ہوگا، اس لیے اس نے ایسا کیا۔ارے بھائی! کیا تم سننے گئے تھے کہ اس نے ہی یہ کہا ہے! ایسی بدگمانی بالکل غلط ہے۔

اور دوسری بات یہ ہے کہ دوسرا آدمی تو صرف بتلانے والا ہوتا ہے ، کرنے والا تو خود ہی ہے، اور جب اس کی توفیق ہی چھین لی گئی ہے تو دوسرا کیا کرے گا۔پھر بعض مرتبہ تو صرف بدگمانی کی بنیاد پر لوگ اس کے درپئے آزار ہوجاتے ہیں، حالاں کہ اس بات میں کوئی حقیقت نہیں ہوتی، بعد میں جب حالات کا پتہ چلتا ہے اور حقیقت سامنے آتی ہے، تو پھر بدگمانی کرنے والے پچھتاتے ہیں اور

کہتے ہیں کہ ہاں بھائی! دراصل اس نے تو بہت اچھے مشورے دئے تھے، لیکن اُسی نے نہیں مانے، ہم نے خواہ مخواہ ہی بدگمانیاں کیں۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ کسی کے متعلق بدگمانیوں میں مبتلا نہ ہوا جائے، بلکہ اگر حکمران وذمہ دار کی طرف سے غلط چیزیں ہورہی ہیں تو اس کی خیرخواہی یہی ہے کہ اس کے لیے دعاکروکہ اللہ تعالیٰ اس کو بھلائی کی توفیق دے، اگر اللہ تعالیٰ توفیق دے گاتووہ بھلی باتیں مانے گااوراس کے مطابق فیصلے کرے گا۔

کہنے کاحاصل یہ ہے کہ قدرت کایہ ایک نظام ہے۔ ایساہوہی نہیں سکتاکہ کسی کواچھے مشورے دینے والے موجودہی نہ ہوں، اس کے اردگردایسے لوگ ضرورہوں گے۔ یہ اوربات رہی کہ توفیق نہ ہونے کی صورت میں وہ ان کی بات نہیں مانے گااور جب توفیق ملے گی تواُنہی کی مانے گااوروہی کرے گا۔

اللہ تعالیٰ صاحبِ اختیار کے ساتھ جب بھلائی کاارادہ فرماتے ہیں:

حدیث ۶۷۹:-

وعن عائشة رضی اللہ عنہا قالت: قَالَ رسولُ الله (صلی اللہ علیہ وسلم): إِذَا أَرَادَ اللّٰهُ بِالأَمِيرِ خَيْراً، جَعَلَ لَهُ وَزِيرَ صدقٍ، إِنْ نَسِيَ ذَكَّرَهُ، وَإِنْ ذَكَرَ أَعَانَهُ، وَإِذَا أَرَادَ بِهِ غَيْرَ ذَلِكَ جَعَلَ لَهُ وَزِيرَ سُوءٍ، إِنْ نَسِيَ لَمْ يُذَكِّرْهُ، وَإِنْ ذَكَرَ لَمْ يُعِنْهُ. (رواه أبو داود بإسنادٍ جيدٍ عَلَى شرط مسلم)

ترجمہ:–حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبیٔ کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: جب اللہ تعالیٰ کسی امیر (حکمران اور سربراہ و ذمہ دار، صاحبِ اختیار) کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرماتے ہیں تو اس کو ایک مخلص اور خیر خواہ مشورہ دینے والا عطا فرماتے ہیں، اگر وہ بھلی بات کو بھولتا ہے تو یہ یاد دلاتا ہے، اور اگر اس کو یاد ہوتی ہے تو یہ مدد کرتا ہے، اس کو آگے بڑھانے کی کوشش کرتا ہے۔ اور اگر اللہ تعالیٰ کسی امیر کے ساتھ دوسرا کوئی (یعنی برائی کا) ارادہ فرماتے ہیں تو اس کے لیے برا مشورہ دینے والا ساتھی مقرر کر دیتے ہیں، وہ اگر اچھی بات بھولتا بھی ہے تو یہ اس کو یاد نہیں دلاتا ہے، اور اگر اس کو یاد ہوتا ہے تو اس کو انجام دینے میں ساتھ نہیں دیتا (مدد نہیں کرتا، سپورٹ نہیں کرتا)۔

افادات:–قدرت کے اُسی نظام و دستور کے **متعلق** –جو اوپر بیان کیا گیا تھا– اس روایت میں بالکل صاف صاف ارشاد فرمادیا ہے۔

النهى عن تولية الامارة والقضاء وغيرهما من الولايات لمن سألها

امارت وقضاء وغیرہ عہدے؛ ان کا مطالبہ کرنے والوں، یا لالچ رکھنے والوں کو دینے کی ممانعت

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اس سلسلہ کا یہ آخری باب ہے۔جو آدمی امارت،عہدۂ قضاء ،یاکسی بھی طرح کاعہدہ ومنصب مانگے،اس کووہ عہدہ ومنصب دینے سے شریعت میں منع کیا گیا ہے۔اس سلسلہ میں پہلے بتایا جاچکا ہے کہ اسلام کااصول تویہی ہے کہ کوئی سامنے سے چل کر مانگے تومت دو،بلکہ زبان سے نہیں بولالیکن اس کی حرص و طلب اور لالچ دل میں ہے، اوراپنے دل کی بات اشاروں میں ظاہر کررہاہے ،تاکہ سامنے والا سمجھ جائے کہ وہ فلاں عہدہ ومنصب مانگ رہا ہے؛ ایسے آدمی کو بھی وہ عہدہ ومنصب دینے سے منع کیا گیا ہے۔مطلب یہ ہے کہ جس کے دل میں عہدہ کی خواہش پیداہوئی اس کواگر دوگے توخیر نہیں ہے۔پہلے بھی یہ بات آچکی کہ تمہارے مانگنے پر اگر دی گئی تواس کی ذمہ داریوں کے اداکرنے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدد نہیں ہوگی، اوراگر بغیرمانگے ملاتواس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہاری مدد کی جائے گی۔

جوکوئی عہدہ مانگے یااس کی لالچ رکھے اس کوعہدہ نہیں دیتے:

حدیث ۶۸۰:-

عن أبي موسى الأشعري رضی اللہ عنہ قَالَ:دَخَلْتُ عَلَى النَّبِيِّ (صلی اللہ علیہ وسلم) : أَنَا وَرَجُلَانِ مِنْ بَنِي عَمِّي،فَقَالَ أَحَدُهُمَا : يَا رسول الله ، أَمِّرْنَا عَلَى بَعْضِ مَا ولاَّكَ الله عزوجل - . وقال الآخَرُ مِثْلَ ذَلِكَ . فَقَالَ : إِنَّا وَاللهِ لاَ نُوَلِّي هَذَا العَمَلَ أَحَداً سَأَلَهُ، أَوْ أَحَداً حَرَصَ عَلَيْهِ.

ترجمہ:- حضرت ابو موسیٰ اَشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نبیٔ کریم (ﷺ) کی خدمت میں حاضر ہوا، میرے ساتھ میرے دو چچازاد بھائی بھی تھے، ان دونوں میں سے ایک نے نبیٔ کریم (ﷺ) سے درخواست کی کہ: اے اللہ کے رسول! فلاں ذمہ داری کا کام اور عہدہ جو اللہ تعالیٰ نے آپ کے اختیار میں دیا ہے؛ وہ میرے حوالے کیجیے۔ دوسرے نے بھی ایسی ہی بات کہی۔ اس پر نبیٔ کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: جو آدمی کوئی عہدہ ہم سے مانگے، یا دل میں کسی عہدہ کی لالچ رکھے؛ ہم اس کو وہ عہدہ نہیں دیتے۔

افادات:- دوسری روایت میں ہے کہ نبیٔ کریم (ﷺ) نے حضرت ابو موسیٰ اَشعری رضی اللہ عنہ سے کہا : ابو موسیٰ! جاؤ! ہم تم کو مقرر کرتے ہیں، حالاں کہ ان کے دل میں اس کا خیال بھی نہیں تھا اور وہ اس مقصد کے لیے حاضر بھی نہیں ہوئے تھے، لیکن ان کو یمن کے ایک حصہ کا گورنر بناکر بھیج دیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو آدمی خود عہدہ طلب کرے اسے نہیں دیا جائے۔

آج کل تو جمہوریت کا اصول ہی یہ ہے کہ الیکشن کے لیے آپ اپنا نام پیش کرو، جس میں پہلا کام ہی اپنی طرف سے مطالبہ پیش کرنے کا آتا ہے، حالاں کہ اوپر معلوم ہو چکا کہ جو عہدہ ومنصب مانگنے سے ملا کرتا ہے اس میں سے اللہ تعالیٰ کی نصرت و مدد ہٹ جایا کرتی ہے، اور جو ذمہ داری بغیر مانگے ملا کرتی ہے اس میں اللہ تعالیٰ کی مدد شاملِ حال ہوتی ہے، اس لیے ہمیں اسلام کی ان ساری تعلیمات کو مدِّ نظر رکھنی چاہئیں

کتاب الادب

باب الحیاء وفضلہ

والحث علی التخلق بہ

شرم کا بیان اور اس کی فضیلت

اور شرم اختیار کرنے کی ترغیب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حیاء اور شرم کسے کہتے ہیں؟:

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اس باب کے اخیر میں خود ہی حیاء کی وضاحت فرمائی ہے ویسے حیاء کی تشریح لغوی اعتبار سے یہ کی گئی ہے: "تَغَیُّرٌ وَ إِنْكِسَارٌ يَعْتَرِي الْإِنْسَانُ مِنْ خَوْفِ مَايُعَابُ بِهِ وَيُلَامُ عَلَيْهِ" ایساکام جس کے کرنے کی وجہ سے آدمی پر کوئی داغ اور عیب آتا ہو، یا جس کے کرنے پر لوگ اس پر ملامت کرتے ہوں (کہ تم نے یہ کیا حرکت کی؟) ایسے ڈر سے آدمی کی طبیعت میں ایک طرح کی جو شکستگی پیدا ہوتی ہے اور پھر ایسے کام سے بچنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے؛ اسی کا نام حیاء ہے۔

جیسے: ایک آدمی کے دل میں سنیما دیکھنے کا خیال آیا لیکن وہ سوچتا ہے کہ اگر میں دیکھنے گیا تو لوگ کیا کہیں گے۔ جو بھی کام ایسا ہو جس کے کرنے پر لوگوں کی طرف سے اس پر نکتہ چینی اور ملامت ہوتی ہو، اس پر عیب لگتا ہو، اس خیال سے اس کام کے کرنے کا جذبہ اور حوصلہ ٹوٹے، طبیعت میں شکستگی پیدا ہو؛ اسی کا نام حیاء ہے۔

بعضوں نے اس کو انقباضی کیفیت کہا ہے: "إِنْقِبَاضُ الْإِنْسَانِ عَنْ اِرْتِكَابِ مَايُكْرَهُ" ناپسندیدہ چیز جس کے کرنے سے آدمی کی طبیعت میں جو جھجھک پیدا ہوتی ہے، جس کو گجراتی زبان میں

(સંકોચ) کہتے ہیں، یعنی کسی برے کام کے کرنے سے طبیعت منقبض ہوتی ہے (સંકોચ) محسوس کرتی ہے؛ اسی کانام حیاء ہے۔یہ تولغت اور ڈکشنری کے لحاظ سے حیاء کامعنٰی ہوا۔

شریعت کے اعتبار سے بتایاہے کہ یہ ایک وصف اورخُلق ہے۔اللہ تعالیٰ نے فطری طور پر جو وصف انسان کے دل میں پیدا کیے ہیں؛ان کوخُلق سے تعبیر کیا جاتاہے۔توجووصف آدمی کو برے کام کے چھوڑنے پر آمادہ کرتاہے، اورکسی بھی حق والے کے حق کی ادائیگی میں (حق کوئی بھی ہو، اللہ کاحق، بندوں کاحق)کوتاہی کرنے سے آدمی کو روکتا ہو؛اس وصف کو شریعت کی اصطلاح میں ”حیاء اورشرم“ کہتے ہیں۔

شرم توایمان کاحصہ ہے:

حدیث ۶۸۱:-

عن ابن عمرَ رضی اللہ عنہما أنَّ رسولَ اللهِ (ﷺ) مَرَّعَلَى رَجُلٍ مِنَ الأَنْصَارِ وَهُوَ يَعِظُ أَخَاهُ فِي الحَيَاءِ، فَقَالَ رسولُ اللهِ (ﷺ): دَعْهُ. فَإِنَّ الحَيَاءَ مِنَ الإِيمَانِ. (متفقٌ عَلَيه)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ نبیٔ کریم (ﷺ) کاگزر ایک انصاری کے پاس سے ہواجواپنے بھائی کوشرم کے سلسلہ میں نصیحت کررہاتھا۔نبیٔ کریم (ﷺ) نے اس نصیحت کرنے والے سے کہا : بھائی!چھوڑو بھی؛(ایسی نصیحت کرنے کی ضرورت نہیں ہے) شرم والی خوبی بھی ایمان کا ایک حصہ ہے۔

افادات:-دوسری روایت میں موجود ہے کہ وہ کہہ رہاتھاکہ توکتنی زیادہ شرم رکھتاہے جس کی وجہ سے تجھے نقصان اُٹھاناپڑتاہے۔جیسے:بعض آدمیوں کے مزاج میں اتنی حیاء ہوتی ہے کہ وہ اپناحق جودوسرے کے اوپرہوتاہے اس کے وصول کرنے میں بھی جھجھک محسوس کرتے ہیں، حیاء کی صفت ان کو سختی کرنے سے روکتی ہےاور سامنے والااس کاحق نہیں دیتاتویہ شرماتا اور سوچتاہےکہ اس سے سختی کےساتھ کیسے بات کروں۔اس انصاری کابھائی بھی ایسا ہی تھا،تووہ اپنے بھائی کو نصیحت کررہاتھاکہ اگرتو ایسا ہی کرتا رہے گا تو لوگ تجھے جینے نہیں دیں گے،ایسی شرم اچھی نہیں ہے،اتنانرم بھی مت رہ، تھوڑا بہت پھُوں پھاں (رعب داب) کرنی چاہیے۔نبی ٔکریم (ﷺ) نے اس نصیحت کرنے والے سے کہا:دَعْهُ ! فَإِنَّ الْحَيَاءَ مِنَ الإِيْمَانِ۔ بھائی!ایسی نصیحت کرنے کی ضرورت نہیں ہے،اس کوایساہی رہنے دو؛یہ شرم توایمان کا ایک حصہ ہے۔گویایہ بڑی قیمتی چیز ہے۔یہ جوکررہاہےوہ کوئی براکام نہیں ہے کہ اس پرآپ اس کوڈانٹ رہےاور روک رہے ہیں! بلکہ یہ توایمان کا تقاضہ ہے،اوریہ وصف جتنا زیادہ ہوگااتناہی اچھا ہے،اس میں کوئی برائی نہیں ہے،اس میں خیرہی خیراوربھلائی ہی بھلائی ہے۔اگرچہ بظاہر ایسا معلوم ہوتاہوکہ اس سے کچھ نقصان ہورہاہے لیکن حقیقت میں اللہ تعالیٰ کے یہاں اس سے کوئی نقصان نہیں ہوتا۔

حدیث ۶۸۲:-

وعن عمران بن حصینٍ رضی اللہ عنہما قَالَ قَالَ رسولُ اللہ (ﷺ) :اَلْحَيَآءُ لَايَأْتِيْ إِلَّا بِخَيْرٍ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

وفی روایة لمسلمٍ :الحیآءُ خَیْرٌ کُلُّہٗ. أَوْقَالَ:اَلْحَيَآءُ كُلُّهٗ خَيْرٌ.

ترجمہ:- حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہما سے روایت ہے (اسی واقعہ میں یہ بھی آیا ہے کہ وہ بھائی جو نصیحت کر رہا تھا اس سے) نبی کریم (ﷺ) نے فرمایا: حیاء اور شرم تو پوری کی پوری بھلائی اور خیر ہی خیر ہے، اس میں کوئی بری چیز ہے ہی نہیں (اس لئے اس بارے میں کوئی نصیحت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔)

ایمان کی ایک شاخ:

حدیث ۶۸۳:-

وعن أَبي هريرة رضی اللہ عنہ أَنَّ رسولَ اللهِ (ﷺ) قَالَ: الإيمَانُ بِضعٌ وَسَبعُونَ أَوْ بِضعٌ وَسِتُّونَ شُعبَةً: فَأَفْضَلُهَا قَوْلُ: لاَ إلهَ إِلاَّ اللهُ، وَأَدْنَاهَا إمَاطَةُ الأَذَى عَنِ الطَّرِيقِ، وَالحَيَاءُ شُعْبَةٌ مِنَ الإيمَانِ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

((البِضْعُ)) بكسر الباءِ ويجوز فتحها: وَهُوَ مِنَ الثَّلاَثَةِ إِلَى الْعَشَرَةِ.

وَ((الشُّعْبَةُ)): القِطْعَةُ وَالْخَصْلَةُ. وَ((الإمَاطَةُ)): الإزَالَةُ. وَ((الأَذَى)): مَا يُؤْذِي كَحَجَرٍ وشوك وَطِينٍ ورماد وَقَذَرٍ وَنَحْوِ ذَلِكَ.

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: ایمان کی ستّر (۷۰) سے کچھ اوپر شاخیں ہیں، اور ایک روایت میں ہے کہ ایمان کی ساٹھ (۶۰) سے کچھ اوپر شاخیں ہیں، جس میں سب سے اعلیٰ درجہ "لاالٰہ الااللہ" ہے، اور سب سے کم درجہ تکلیف دینے والی چیز (پتھر یا کانٹا، وغیرہ) کو راستہ سے ہٹانا ہے، اور حیاء بھی ایمان کی ایک بڑی شاخ ہے۔

افادات:- حیاء اور شرم کی اہمیت کے پیشِ نظر اس کو الگ سے بیان کیا۔ ایمان کے نتیجہ میں آدمی کو جتنے بھی اچھائی کے کام کرنے ہیں، یا جن برائی کے کاموں سے اپنے آپ کو بچانا ہے، ان تمام اچھائی کے کاموں پر آمادہ کرنے والی اور تمام برائی کے کاموں سے آدمی کو روکنے والی چیز حیاء ہی ہے۔

حقیقی حیاء اور شرم:

ترمذی شریف کی روایت میں ہے کہ نبیٔ کریم (ﷺ) نے حضرات صحابہ سے ارشاد فرمایا: اسْتَحْيُوا مِنَ اللهِ حَقَّ الْحَيَاءِ. قَالَ: قُلْنَا يَا رَسُولَ اللهِ! إِنَّا لَنَسْتَحْيِي وَالْحَمْدُ لِلهِ. قَالَ: لَيْسَ ذَاكَ، وَلَكِنَّ الِاسْتِحْيَاءَ مِنَ اللهِ حَقَّ الْحَيَاءِ أَنْ تَحْفَظَ الرَّأْسَ وَمَا وَعَى، وَتَحْفَظَ الْبَطْنَ وَمَا حَوَى، وَتَتَذَكَّرَ الْمَوْتَ وَالْبِلَى، وَمَنْ أَرَادَ الآخِرَةَ تَرَكَ زِينَةَ الدُّنْيَا. فَمَنْ فَعَلَ ذَلِكَ فَقَدِ اسْتَحْيَا مِنَ اللهِ حَقَّ الْحَيَاءِ (ترمذی شریف:۲۶۴۶) اللہ تعالیٰ سے ایسی شرم رکھو جیسی شرم رکھنی چاہیے۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنھم نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ہم تو الحمدللہ شرم رکھتے ہیں۔ حضورِ اکرم (ﷺ) نے فرمایا: ایسی بات نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ سے حقیقی شرم یہ ہے کہ آدمی اپنے سر کی اور جن چیزوں کو سر لئے ہوئے ہے؛ ان سب کی حفاظت کرے۔ یعنی آنکھیں، زبان، کان، خیالات، عقائد، تصورات؛ یہ ساری چیزیں سر سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان سے کوئی ایسی بات نہ ہو جو شریعت کے تقاضہ اور حکم کے خلاف ہو۔ اور پیٹ کی اور جن چیزوں کو پیٹ اپنے اندر لئے ہوئے ہے؛ ان سب کی حفاظت کرے۔ یعنی

حرام لقمہ سے پیٹ کو بچائے اور غلط طریقہ سے کسی کا مال ہڑپ کرنے سے اپنے آپ کو بچائے۔ اورآدمی موت کو اور موت کے بعد گَل سڑ جانے کو یاد رکھے۔ اور جو آدمی آخرت چاہتا ہے وہ دنیا کی زینت کو چھوڑ دے یعنی آخرت کو دنیا کے مقابلہ میں ترجیح دے؛اسی کا نام اللہ تعالیٰ سے حقیقی حیاء ہے

گویا آدمی اپنے پورے جسم کی اس طرح حفاظت کرے کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں میں مبتلا ہونے کی نوبت نہ آئے،اور سارے حقوق اداہوں ، دنیا کے مقابلہ میں آخرت کو ترجیح دے، گناہوں سے اپنے آپ کو بچائے؛اسی کو استحضار کی کیفیت کہا جاتا ہے کہ ہروقت آدمی یہ سوچے کہ مجھے اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دینا ہے۔ اسی لئے بعض حضرات فرماتے ہیں کہ حدیثِ جبرئیل میں جس چیز کو احسان سے تعبیر کیا گیا ہے، ترمذی شریف کی اس روایت میں بھی وہی مقصود ہے۔جب آدمی میں استحضار والی یہ کیفیت پیدا ہو جائے گی؛توپھر ان شاء اللہ وہ کبھی گناہ نہیں کرے گا۔

اورایک روایت میں یہ بھی ہے، حضورِ اکرم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا:الْحَيَاءُ وَ الإِيمَانُ قُرِنَا جَمِيعًا ، فَإِذَا رُفِعَ أَحَدُهُمَا رُفِعَ الآخَرُ(المستدرك علی الصحیحین : ۸۵) حیاءاور ایمان دونوں جوڑی ہیں،ایک جاتا ہے تو دوسرا بھی جاتا ہے۔

بے حیائی کی منظّم سازش:

اسی لئے اسلام کے دشمنوں نے خاص کر یہودیوں نے آج سے دوصدی پہلے اٹھارہویں صدی میں پورے عالَم پر اپنا تسلط جمانے کے لئے کچھ فیصلے کئے تھے جو یہودیوں کا پروٹوکول (Protocol) کہلاتا ہے کہ آئندہ ہمیں اپنا نظام کس طرح کا چلانا ہے، ان فیصلوں میں انہوں نے ایک بات یہ طے کی تھی کہ بے حیائی کو ایسی عام کردو کہ آدمی کے مزاج میں سے حیاء اور شرم کا مادّہ ہی ختم ہوجائے۔ آج کل ٹی وی اور انٹرنیٹ پر جتنے بھی پروگرام آتے ہیں اور میڈیا کے مختلف میگزین کے ذریعہ جن کی تشہیر کی جاتی ہے، جو مستقل ایک فن بن چکا ہے، ان ساری چیزوں کی جڑ اور بنیاد شرم وحیاء کے مادّے کو ختم کرنا ہے۔ اسی لئے حضورِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: إِنَّ مِمَّا أَدْرَكَ النَّاسُ مِنْ كَلَامِ النُّبُوَّةِ الْأُولَى . إِذَا لَمْ تَسْتَحِي فَافْعَلْ مَاشِئْتَ (صحیح البخاری: ۶۱۲۰) تمہارے اندر سے جب شرم کا مادّہ ختم ہوجائے تو پھر جو چاہو کرو۔ یہ حیاء ہی ہے جو آدمی کو گناہوں سے روکتی ہے، ایک مرتبہ کسی نے حیاء والی دیوار کو ڈھادیا؛ تو پھر وہ کسی بھی طرح کی حرکت کرنے میں جھجھک محسوس نہیں کرتا۔

عام طور پر عورت کے مزاج میں حیاء اور شرم ہوا کرتی ہے، لیکن بعض عورتوں کو دیکھا ہوگا کہ جب ان کے اندر سے صفتِ حیاء ختم ہوجاتی ہے، تو پھر کوئی بھی ان کا مقابلہ نہیں کرسکتا، سب ان سے ڈرتے ہیں۔ کوئی عورت جب بے حیاء ہوکر سامنے آتی ہے تو پھر وہ نہ باپ کی

عزت کو خاطر میں لاتی ہے، اورنہ بیٹے اور شوہر کو خاطر میں لاتی ہے، پھر توکوئی کچھ نہیں کرسکتا۔حیاءاور شرم ایک بڑاپردہ اورآڑ ہے، اورہرانسان کے مزاج میں اللہ تعالیٰ نے یہ وصف رکھاہے،اگریہ وصف ختم کردیاجائے ،اورایسی محنت کی جائے کہ مزاج میں سے یہ مادّہ ختم ہوجائے؛توپھروہ ہرطرح کااقدام کرنے کے لئے تیار ہوجائے گااورکوئی طاقت اس کوروک سکتی نہیں ہے۔"بے حیاء باش وہرچہ خواہی کُن"بے شرم بنواور پھر جوچاہو کرو۔گجراتی میں کہاوت ہے:

"નાંગા ને ન્હાવાનું અને નિચોડવાનુ શું"

یعنی ننگے بن گئے توبس پھرسب کچھ ختم ہوگیا۔جب آدمی میں سے حیاء ختم ہوجاتی ہے تو اس کا مزاج اسی قسم کا بن جاتاہے۔اسی لئے حیاء کی بڑی اہمیت ہے، اسلام نے اپنے اخلاقی نظام کی بنیاد جن چیزوں پررکھی ہے اس میں عفت اورحیاء بنیادی حیثیت رکھتی ہے،اسی لئے اخلاقی نظاموں کو برباد کرنے والے جتنے بھی لوگ ہیں ان کی پہلی کوشش یہ ہوتی ہے کہ آدمی میں سے حیاء کے مادّہ کوختم کردیاجائے،جب یہ مادّہ ختم ہوجائے گا تو پھرآدمی ساری برائیاں آسانی سے قبول کرتاچلاجائے گا۔

حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شرم وحیاء

حدیث ۶۸۴:-

وعن أبي سعيدٍ الخدري رضی اللہ عنہ قَالَ: كَانَ رسول الله (صلی اللہ علیہ وسلم) أشَدَّ حَيَاءً مِنَ العَذْرَاءِ فِي خِدْرِهَا، فَإِذَا رَأَى شَيْئاً يَكْرَهُهُ عَرَفْنَاهُ فِي وَجْهِهِ. (متفقٌ عَلَيْهِ.)

قَالَ العلماءُ: حَقِيقَةُ الحَيَاءِ خُلُقٌ يَبْعَثُ عَلَى تَرْكِ القَبِيحِ، وَيَمْنَعُ مِنَ التَّقْصِيرِ فِي حَقِّ ذِي الحَقِّ.

وَرَوَيْنَا عَنْ أَبِي القاسم الجُنَيْدِ رَحِمَهُ اللهُ قَالَ: الحَيَاءُ: رُؤيَةُ الآلاءِ - أيْ النِّعَمِ - ورُؤْيَةُ التَّقْصِيرِ، فَيَتَوَلَّدُ بَيْنَهُمَا حَالَةٌ تُسَمَّى حَيَاءً. (وَاللهُ أعلم)

ترجمہ:- حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) شرم وحیاء میں کنواری لڑکی سے جو اپنے پردہ میں ہو کہیں زائد بڑھے ہوئے تھے، جب آپ کو کوئی بات ناگوار ہوتی تو ہم آپ کے چہرہ سے پہچان لیتے (حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) غایتِ شرم کی وجہ سے اظہارِ ناپسندیدگی بھی نہ فرماتے تھے)

افادات:- **"کنواری لڑکی اپنے پردہ میں ہو"** کے دو مطلب علماء نے لکھے ہیں۔ ایک جماعتِ علماء نے یہ فرمایاہے کہ: اس سے پردہ نشین کنواری مرادہے کہ وہ اس کنواری لڑکی سے جو باہر پھرتی ہو، بہت زیادہ شرمیلی ہوتی ہے، گو کنواری ہر ایک ہی شرم دار ہوتی ہے۔ اسی لیے شریعت نے کنواری لڑکی کے نکاح کی اجازت کے لیے اس کے سکوت کو کافی بتایاہے کہ کنواری کے لیے شرم طبعی چیز ہے، اور بالخصوص پردہ دار لڑکی۔

اور بعض علماء نے پردہ نشین سے وہ لڑکی مراد لی ہے جو پردہ میں تربیت دی گئی ہو کہ اس کو عورتوں سے بھی پردہ کرایا گیا ہو۔ چناں چہ باہر پھرنے والی عورتوں سے اس کا پردہ کرانا بہت سے خاندانوں میں آج بھی مروج ہے۔ یہ لڑکی جس قدر شرمیلی ہوگی ظاہر ہے۔

دوسرا مطلب بعض علماء نے اپنے پردہ میں ہونے سے کنایہ بتایا ہے شبِ عروس کا۔ کہ کنواری لڑکی پہلی شب میں جس قدر شرمیلی ہوتی ہے وہ ظاہر ہے۔

باب حفظ السر

کسی کے بھید کی حفاظت کرنا

رازداری سے کام لینا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رازداری کے اصول:

نیا عنوان قائم کیا ہے کہ کسی آدمی نے اپنے کسی معاملہ میں ،اپنی کسی بات میں،یا آپ کے ساتھ کیئے گئے کسی سلوک میں آپ سے یہ امید قائم کی کہ آپ اس کو راز میں رکھیں گے، کسی کے سامنے اس کا اظہار نہیں کریں گے؛تو پھر آپ کی یہ ذمہ داری ہو جاتی ہے کہ اس راز کی حفاظت کریں،کسی کے سامنے اس کا اظہار نہ کریں،البتہ اگر وہ بات خلافِ شرع ہے اوراس کی وجہ سے کسی کو نقصان پہنچ سکتا ہے،تو پھر اس کے راز کا لحاظ رکھنا لازم نہیں ہے۔مثلاً:کسی نے آپ کو بتلایا کہ میں فلاں کے گھر میں چوری کرنے والا ہوں ،اور دیکھو!یہ راز کی بات ہے ،تم کسی کو بتلانا مت۔اب آپ بھی یہ سوچیں کہ شریعت میں رازداری کی تاکید آئی ہے،اس کا لحاظ کرتے ہوئے آپ کسی کو واقف نہ کریں ؛تو یہ صحیح نہیں ہے۔اس لیے کہ وہ آدمی جو حرکت کرنے والا ہے وہ تو گناہ کا کام ہے،اس کے نتیجہ میں خدا کے دوسرے بندے کو نقصان پہنچنے والا ہے،اس کو نقصان سے بچانے کے لیے اس کے اس راز سے آگاہ کر دیا جائے تو یہ عمل شریعت کے رازداری والے حکم کے خلاف شمار نہیں ہو گا۔

صریح راز:

اب یہ راز کی جو بات ہوتی ہے اس میں کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ بات کرنے والا خود ہی زبان سے صاف صاف کہہ دیتا ہے کہ یہ بات مَیں آپ کو راز کے طور پر بتا رہا ہوں ؛تب تو بات صاف ہے،اوراس صورت میں اس کو راز ہی سمجھا جائے گا،اس کی حفاظت کرنا ضروری ہو جائے گا،اس کا کسی کے سامنے اظہار کرنا غلط کام ہو جائے گا، اس میں اپنی طرف سے کوئی دوسرا مطلب نکالنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

راز کا انداز:

اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ اپنی زبان سے اس بات کا اظہار تو نہیں کرتا کہ یہ راز ہے، لیکن وہ انداز ایسا اختیار کرتا ہے جس کی وجہ سے سمجھ میں آتا ہے کہ وہ اپنی بات کو راز میں رکھنا چاہتا ہے، جیسے: آپ کو اپنے پاس بلا کر وہاں موجود دوسرے لوگوں سے کہا کہ آپ لوگ ذرا ہٹ جایئے، مَیں ان سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔ یا آپ سے بات شروع کرنے سے پہلے اِدھر اُدھر برابر دیکھا کہ کوئی سن تو نہیں رہا ہے، اور اطمینان کرنے کے بعد آپ سے بات کی؛تو اس صورت میں اگرچہ اس نے اپنی زبان سے یہ نہیں کہا ہے کہ جو کچھ کہا جا رہا ہے وہ راز کے طور پر ہے، لیکن جو انداز اختیار کیا گیا وہ خود بتلا رہا ہے کہ یہ جو کچھ کہا جا رہا ہے وہ بطورِ راز اور بھید کے

ہے، آپ کو اس کا کسی کے سامنے اظہار نہیں کرنا ہے۔اسی لیے حدیث میں آتا ہے، حضورِ اکرم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: بات کرنے سے پہلے کوئی آدمی اگر دائیں بائیں دیکھے اور پھر وہ کوئی بات آپ سے کہے؛تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ راز کی بات ہے،اب آپ کو اس بات کی حفاظت کرنی ضروری ہے۔

یہ بھی راز ہے:

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آپس کے کچھ معاملات رکھنے والے لوگ ہوتے ہیں جس کے نتیجہ میں ایک فریق کے دوسرے فریق کے ساتھ کچھ مخصوص تعلقات ہوتے ہیں جن کی شریعت کی طرف سے اجازت بھی دی گئی ہے،ان کی بنیاد پر ایک دوسرے کے ساتھ کوئی سلوک کرتے ہیں، مثلاً: میاں بیوی کا تعلق ورشتہ ہے جن کی بنیاد پر آپس میں کچھ معاملات اور باتیں ایسی ہوتی ہیں جو سب کے سامنے انجام نہیں دی جاتیں ؛وہ بھی راز ہیں۔شریعت اس کے اظہار کی اجازت نہیں دیتی، جیسا کہ حدیث میں صراحتاً موجود ہے،اور اس کے اظہار پر بڑی سخت وعید آئی ہے۔ اس لیے آدمی یہ نہ سمجھے کہ مرد اپنے دوستوں کے سامنے ،یا عورت اپنی سہیلیوں کے سامنے ان باتوں کو ظاہر کر سکتی ہے۔شریعت نے اس کو سخت گناہ قرار دیا ہے۔

یا کاروباری اعتبار سے دو آدمی شریک اور پارٹنر ہیں ،اپنے کاروبار سے تعلق رکھنے والے کچھ معاملات اور چیزیں ہیں جن سے کسی اور کو کوئی نقصان بھی نہیں ہے،تو وہاں پر بھی ان راز اور

بھیدوں کا لحاظ کیا جائے گا، اگرچہ بعد یہ شراکت باقی نہ بھی رہے تب بھی ان کو ایک دوسرے کی ان چیزوں کا لحاظ رکھنا چاہیے۔

حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے رازدار کی رازداری:

بہر حال! شریعت نے جن آداب اور حسنِ اخلاق کی تعلیم دی ہے، ان میں سے یہ بھی ہے کہ راز اور بھید سے تعلق رکھنے والی چیزوں کا کسی کے سامنے اظہار نہ کیا جائے۔ حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ کو نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایک راز کی بات بتلائی تھی۔ غزوۂ تبوک کے موقعہ پر بعض منافقین جو ساتھ میں آئے تھے انہوں نے سازش اور اسکیم تیار کی تھی کہ تبوک جانے کا راستہ بڑا طویل ہے اور راستہ میں پہاڑیاں اور بڑی سخت گھاٹیاں آتی ہیں، ان میں سے ایک پہاڑی کے پاس سے گزرتے ہوئے (نعوذ باللہ) اندھیرے میں حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) پر حملہ کر کے آپ کا کام تمام کر دیا جائے، وہ منافقین لشکر میں شامل تھے، اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس سازش سے حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو آگاہ کر دیا اور ان منافقین کے نام بھی حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو بتلا دیئے تھے، پھر حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان کے ناموں کا تذکرہ بطورِ راز کے حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ سے کیا اور ان منافقین کے نام بھی آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان کو بتلائے جن کے متعلق بذریعۂ وحی اللہ تعالیٰ نے یہ بتلا دیا تھا ان کی موت نفاق پر ہی آنے والی ہے، جن کو توبہ نصیب ہونے والی تھی ان کے نام نہیں بتلائے تھے، اس لیے کہ منافقین کی بڑی تعداد ایسی تھی جن کو موقع بموقع اللہ تعالیٰ نے توبہ

کی توفیق عطا فرمائی تھی اور ان کی موت ایمان پر آئی تھی، لیکن بعض ایسے بھی تھے جن کی نفاق کی حالت ہی میں موت آئی، اور اللہ تعالیٰ نے حضورِ اکرم (ﷺ) کو ان کی نمازِ جنازہ پڑھنے سے بھی منع فرمادیا تھا، انھی میں سے منافقین کا سردار عبداللہ بن اُبی بھی تھا۔ اس کے جو بیٹے تھے جن کا نام بھی عبداللہ تھا، وہ مخلص مؤمن تھے۔ اور چوں کہ عبداللہ بن اُبی ظاہری طور پر اپنے آپ کو مسلمان بتلاتا تھا، جتنے بھی منافقین تھے وہ سب اپنی زبان سے تو ایمان ہی ظاہر کرتے تھے، اور حضور (ﷺ) کی طرف سے بھی ان کے ساتھ اہلِ ایمان والا ہی معاملہ کیا جاتا تھا، یعنی جیسے ایک مسلمان کی جان و مال محفوظ ہے اسی طرح ان کی بھی جان و مال محفوظ سمجھی جاتی تھی، اس کے علاوہ اور معاملات کا بھی حال تھا، ان کے ساتھ کافروں جیسا سلوک نہیں کیا جاتا تھا۔ عبداللہ بن اُبی کی طرف سے بہت سے مواقع پر ایسے کام رونما ہوئے تھے کہ جن کی وجہ سے اس کا منافق ہونا سب کے سامنے واضح ہو چکا تھا، بہت سے مواقع پر اس نے مسلمانوں کو اور خود حضورِ اکرم (ﷺ) کو نقصان پہنچانے کی کوششیں کی تھیں۔ جب عبداللہ بن اُبی کا انتقال ہوا تو اس کے بیٹے حضرت عبداللہ نے نبیِ کریم (ﷺ) سے درخواست کی کہ میرے باپ کا انتقال ہو گیا ہے، آپ تشریف لا کر اس کے جنازہ کی نماز پڑھایئے۔ حضور (ﷺ) تشریف لے گئے، جب جنازہ رکھا گیا اور آپ نماز پڑھانے کے لیے آگے بڑھے اور نماز شروع کرانا ہی چاہتے تھے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ آگے بڑھے اور حضور کا کرتہ پکڑ لیا اور کہنے لگے: اے اللہ کے رسول! آپ اس کی نمازِ جنازہ پڑھا رہے ہیں؟ اس نے فلاں وقت یہ حرکت کی تھی، فلاں وقت یہ حرکت کی تھی۔ اسلام کے خلاف

اس نے جو جو حرکتیں تھیں وہ سب گنوائیں اور کہا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے متعلق خود فرمایا ہے کہ اگر آپ ستّر مرتبہ بھی ان کے لیے دعائے مغفرت کریں ، تب بھی اللہ تعالیٰ ان کو معاف کرنے والا نہیں ہے؛ پھر بھی آپ اس کی نمازِ جنازہ پڑھائیں گے؟ حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) سب سنتے رہے، جب وہ خاموش ہوگئے تو حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ان کی جنازہ کی نماز پڑھانے سے مجھے صاف صاف منع نہیں فرمایا ہے۔ خیر! آپ نے نمازِ جنازہ پڑھائی اور ابھی آپ وہاں سے ہٹے بھی نہیں تھے کہ آیت ﴿وَلَا تُصَلِّ عَلَىٰٓ أَحَدٍ مِّنْهُم مَّاتَ أَبَدًا وَلَا تَقُمْ عَلَىٰ قَبْرِهِۦٓ﴾ نازل ہوئی، اور اس طرح آئندہ ان کی نمازِ جنازہ پڑھنے سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمادیا، اور آپ کو یہ بھی بتا دیا کہ منافقین میں کون کون ہیں جن کی موت نفاق پر آنے والی ہے، اور پھر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان کے نام حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کو بھی بتلا دیئے تھے، لیکن حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے کبھی کسی صحابی کے سامنے ان کے ناموں کا اظہار نہیں کیا اسی لیے ان کا لقب ”صاحبُ سرِّ رسولِ اللہ“ یعنی ”حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے رازدار“ تھا ، البتہ چوں کہ ان کو معلوم تھا کہ فلاں فلاں کی موت نفاق پر آنے والی ہے اس لئے حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کی وفات کے بعد جب کسی کا انتقال ہوتا تو بعض محتاط صحابہ جیسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس بات کی ٹوہ میں لگے رہتے تھے اور خبر نکلواتے تھے کہ دیکھو! جنازہ کی نماز میں حضرت حذیفہ موجود ہیں یا نہیں ؟ اگر وہ حاضر ہوتے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی شریک ہوجاتے، ورنہ نہیں جاتے تھے۔ اور ان کا کسی کے جنازہ میں حاضر نہ ہونا اس بات کا قرینہ اور علامت سمجھی جاتی تھی کہ یہ منافق تھا۔ بہرحال! یہ تو دوسرے دیکھتے تھے اور اندازہ لگا

لیتے تھے، لیکن حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے کبھی اس کا اظہار نہیں کیا۔ اور یہ حضورِ اکرم (ﷺ) کی وفات کے بعد ایسا کرتے تھے، اس لیے کہ جب تک نبیٔ کریم (ﷺ) موجود تھے وہاں تک تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا، آپ (ﷺ) جس کی جنازہ کی نماز پڑھیں، اس سے معلوم ہو جاتا تھا کہ یہ مؤمن ہے، تو سب لوگ بھی پڑھ لیتے تھے۔

راز امانت ہوتے ہیں:

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ کسی نے بھی کوئی چیز بطورِ راز اور بھید کے بتلائی ہو، اس کا لحاظ کرنا ضروری ہے، اس لیے کہ راز ایک طرح کی امانت ہے، اور جس طرح امانت کی پاسداری ضروری ہے؛ اسی طرح راز اور بھید کی حفاظت بھی ضروری ہے۔ چوں کہ اس نے آپ پر اعتماد و بھروسہ کیا ہے اس لئے اس کے خلاف کوئی کام نہیں کیا جا سکتا؛ ورنہ وہ خیانت قرار دیا جائے گا۔

عہد کے بارے میں سوال ہوگا:

باری تعالیٰ کا ارشاد نقل کیا: ﴿وَأَوْفُوا بِالْعَهْدِ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولًا﴾ جو عہد و پیمان اور ایگریمنٹ ہیں ان کو پورا کرو، اس لیے کہ قیامت کے روز آپس کے عہد و پیمان کے متعلق پوچھ ہوگی کہ ان کو پورا کیا یا نہیں؟ ان کے حقوق کو ادا کیا یا نہیں؟ جو راز اور بھید ہوتے ہیں وہ بھی ایک طرح کے عہد ہی ہوتے ہیں، اس لیے ان کو پورا کرنا بھی ضروری ہے۔

اللہ تعالیٰ کی نگاہوں میں بدترین شخص:

حدیث ۶۸۵:-

عن أَبِی سعید الخدری رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رسولُ الله (ﷺ): إِنَّ مِنْ أَشَرِّ النَّاسِ عِنْدَ اللهِ مَنْزِلَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ الرَّجُلَ يُفْضِي إِلَى الْمَرْأَةِ وَتُفْضِي إِلَيْهِ، ثُمَّ يَنْشُرُ سِرَّهَا. (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کے یہاں سب سے برے مرتبہ والا اور سب سے بدترین آدمی وہ ہے کہ جو تنہائی میں اپنی بیوی کے ساتھ صحبت کے لیے بے پردہ ہوا، اور بیوی بھی شوہر کے لیے بے پردہ ہوئی (میاں بیوی کا آپس کا معاملہ ہے، ان کا اپنی ضرورت پوری کرنے کے لیے اور صحبت کے لیے ستر کھولا جائے گا) پھر وہ آدمی اپنی بیوی کا بھید لوگوں کے سامنے ظاہر کرتا پھرے۔

افادات:- یعنی شوہر ہونے کی حیثیت سے تنہائی میں جو معاملہ اپنی بیوی کے ساتھ انجام دیا جاتا ہے، اور میاں بیوی کے تعلقات کے نتیجہ میں آپس جو کچھ بھی ہو رہا ہے؛ ظاہر ہے کہ وہ سب ایک طرح کا بھید اور راز ہے، اس لیے اگر شوہر کسی کے بھی سامنے - چاہے وہ جگری دوست ہی کیوں نہ ہو- اس کا اظہار کرتا ہے؛ تو قیامت کے روز ایسا آدمی اللہ تعالیٰ کی نگاہوں میں بدترین شخص ہوگا۔ یہی حکم عورت کا بھی ہے کہ اگر عورت اپنی سہیلیوں کے سامنے ایسی چیزوں کا اظہار کرتی ہے۔

چوں کہ عام طور پر یہ چیزیں مردوں کی طرف سے زیادہ پیش آتی ہیں، اس لیے مردوں کا تذکرہ کیا گیا، لیکن آج ایسا زمانہ آگیا ہے کہ عورتیں مردوں کے مقابلہ میں ایسی باتیں زیادہ کہنے لگی ہیں۔ بہرحال! یہ حکم دونوں کے لیے ہے کہ میاں بیوی کا آپس کا معاملہ ایک طرح کا راز ہے جس کا کسی کے سامنے اظہار نہیں کیا جاسکتا۔

رازداری کا ایک واقعہ:

حدیث ٦٨٦:-

وعن عبدِ الله بن عمر رضی الله عنهما: أنَّ عمرَ رضی الله عنه حِيْنَ تَأَيَّمَتْ بِنْتُهُ حَفْصَةُ ، قَالَ: لَقِيتُ عُثْمَانَ بْنَ عَفَّانَ رضی الله عنه ، فَعَرَضْتُ عَلَيْهِ حَفْصَةَ ، فَقُلْتُ: إِنْ شِئْتَ أَنْكَحْتُكَ حَفْصَةَ بِنْتَ عُمَرَ؛ قَالَ: سَأَنْظُرُ فِي أَمْرِي. فَلَبِثْتُ لَيَالِيَ ثُمَّ لَقِيَنِي، فَقَالَ: قَدْ بَدَا لِي أَنْ لَا أَتَزَوَّجَ يَوْمِي هَذَا. فَلَقِيتُ أَبَا بَكْرٍ رضی الله عنه ، فقلتُ: إِنْ شِئْتَ أَنْكَحْتُكَ حَفْصَةَ بِنْتَ عُمَرَ؛ فَصمت أَبُو بَكْرٍ رضی الله عنه ، فَلَمْ يَرْجِعْ إِلَيَّ شَيْئاً! فَكُنْتُ عَلَيْهِ أَوْجَدَ مِنِّي عَلَى عُثْمَانَ. فَلَبِثَ لَيَالِيَ ثُمَّ خَطَبَهَا النَّبِيُّ (ﷺ)، فَأَنْكَحْتُهَا إِيَّاهُ. فَلَقِيَنِي أَبُو بَكْرٍ، فَقَالَ: لَعَلَّكَ وَجَدْتَ عَلَيَّ حِيْنَ عَرَضْتَ عَلَيَّ حَفْصَةَ فَلَمْ أَرْجِعْ إِلَيْكَ شَيْئاً؛ فَقُلْتُ: نَعَمْ. قَالَ: فَإِنَّهُ لَمْ يَمْنَعْنِي أَنْ أَرْجِعَ إِلَيْكَ فِيمَا عَرَضْتَ عَلَيَّ إِلَّا أَنِّي كُنْتُ عَلِمْتُ أَنَّ النبيَّ (ﷺ) ذَكَرَهَا، فَلَمْ أَكُنْ لِأُفْشِيَ سِرَّ رسول الله (ﷺ)، وَلَوْ تَرَكَهَا النَّبِيُّ (ﷺ) لَقَبِلْتُهَا. (رواه البخاری)

((تَأَيَّمَتْ)) أَيْ: صَارَتْ بِلَا زَوْجٍ، وَكَانَ زَوْجُهَا تُوُفِّيَ. (وَجَدْتَ)) : غَضِبْتَ

ترجمہ مع تشریح:- حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما (راز سے تعلق رکھنے والا ایک واقعہ) بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا (جو بعد میں اُم المؤمنین بنیں) کے پہلے شوہر کا جب انتقال ہوا (جن کا نام خُنَیس بن حذافہ سہمی تھا، غزوۂ بدر میں شریک ہوئے تھے، غزوۂ اُحد میں زخمی ہوئے اور اسی میں ان کا انتقال ہوا) تو وہ بیوہ ہوئیں۔ جب عدت پوری ہوگئی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے ملا اور ان سے کہا: اگر تم چاہو اور تمہارے دل میں رغبت ہو تو میں اپنی بیٹی حفصہ کو تمہارے نکاح میں دیدوں (گویا حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنی صاحبزادی کا پیغامِ نکاح لے کر بذاتِ خود گئے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے بات کی) حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جواب میں اس وقت تو یہ کہا کہ میں سوچوں گا ، پھر چند دن گزرنے کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مجھ سے ملے اور کہا: سوچنے کے بعد مَیں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ مَیں آپ کی صاحبزادی سے نکاح کرنا نہیں چاہتا (حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں) اس کے بعد میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ملا اور ان سے کہا: اگر تم چاہو تو مَیں اپنی بیٹی حفصہ کو تمہارے نکاح میں دینے کے لیے تیار ہوں۔ میری اس پیشکش اور درخواست پر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ خاموش رہے اور کوئی جواب نہیں دیا (نہ ہاں کہا اور نہ منع کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں) مجھے ان پر حضرت عثمانؓ کے مقابلہ میں زیادہ ناراضگی ہوئی (اس لیے کہ انہوں اگرچہ ''نا'' کہا، لیکن جواب تو دیا، اور یہ تو کچھ بولتے ہی نہیں) خیر! پھر چند دن گزرے تھے کہ نبیٔ کریم (ﷺ) نے حفصہ کے لیے پیغامِ نکاح بھیجا، تو مَیں نے حضور (ﷺ) سے نکاح کرادیا۔ جب نکاح ہوگیا اس کے بعد حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ میرے پاس ملاقات کے لیے آئے اور کہا : فلاں موقع پر تم نے مجھے اپنی صاحبزادی کے ساتھ نکاح کے لیے پیشکش کی تھی اور مَیں خاموش رہا تھا، شاید اس کی وجہ سے تم کو برا معلوم ہوا ہے، اور تم مجھ سے ناراض ہو؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: جی ہاں۔ تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کہا: بات دراصل یہ ہے کہ میں نے جواب اس

لیے نہیں دیا تھا کہ ایک مرتبہ نبی کریم (ﷺ) نے میرے سامنے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کا تذکرہ کیا تھا (اور آپ (ﷺ) کے اندازِ تذکرہ سے مَیں یہ سمجھا تھا کہ حضورِ اکرم (ﷺ) کا ارادہ ان کے ساتھ نکاح کرنے کا ہے۔ اگرچہ یہ بات آپ کو معلوم نہیں تھی لیکن مجھے تو معلوم تھی، اس لیے جب آپ نے میرے سامنے ان کے نکاح والی بات پیش کی تو چوں کہ وہ بات میرے علم میں تھی، اس لیے میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور یہ سوچا کہ آپ (ﷺ) نے جو تذکرہ کیا ہے جس سے آپ کا ارادہ معلوم ہو رہا ہے) لیکن آئندہ چل کر اگر نبی کریم (ﷺ) ان سے نکاح نہیں کریں گے ،اور مجھے یہ اندازہ ہو جائے گا کہ نبی کریم (ﷺ) کا ارادہ نکاح کرنے کا نہیں ہے، تو مَیں آپ کی پیشکش قبول کرلوں گا (اس لیے جواب میں مَیں نے نہ "نا" کہا، اور نہ "ہاں "کہا۔ اگر "نا" کا جواب دیتا تو دروازہ بند ہو جاتا، اور اگر ہاں کہتا تو جب حضور (ﷺ) نے ایک بات ارشاد فرمائی تھی اس کا لحاظ نہ رہتا۔ اس موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے کہا کہ: پھر آپ مجھے بتادیتے نا کہ ایسی ایسی بات ہے۔ اس وقت کیوں نہیں بتایا؟ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کہا) مَیں حضورِ اکرم (ﷺ) کا بھید کیسے کھول سکتا ہوں (یعنی جو خلاصہ میں ابھی کر رہا ہوں۔ یہی خلاصہ اگر میں اس وقت کرتا تو چوں کہ حضور (ﷺ) نے میرے سامنے تذکرہ کیا تھا اس سے میں نے اندازہ لگایا تھا کہ حضور (ﷺ) کا نکاح کرنے کا ادارہ ہے، اور یہ بات آپ (ﷺ) نے میرے سامنے ایک راز کے طور پر کہی تھی، اگر میں تمہارے سامنے وہ راز بتلادیتا تو مطلب یہ ہوتا کہ میں حضور (ﷺ) کے راز کو تمہارے سامنے کھول رہا ہوں، اب جبکہ وہ معاملہ ہو چکا ہے تو آپ کی ناراضگی دور کرنے کی غرض سے میں اس بات کی وضاحت کر رہا ہوں)

نکاح کا پیغام لڑکے والے بھیجیں یا لڑکی والے؟:

افادات:- یہاں ایک مسئلہ اور آگیا کہ نکاح کا پیغام لڑکے والے بھیجیں یا لڑکی والے؟ ویسے عورت کے احترام کا تقاضہ یہی ہے کہ لڑکے والوں کی طرف سے پیغام بھیجا جائے اور رشتہ کے لیے مطالبہ کیا جائے کہ ہم اپنے لڑکے کا تمہاری لڑکی سے رشتہ چاہتے ہیں، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس کے برعکس دوسری شکل جائز ہی نہیں، بلکہ اگر کسی موقع پر دیکھا کہ کوئی لڑکا نیک ہے اور جگہ بھی اچھی ہے اور ہاتھ سے نکل جانے کا اندیشہ ہے، تو اس صورت میں لڑکی والے سامنے چل کر درخواست کریں اور مطالبہ کریں کہ اگر تم اپنے لڑکے کا ہماری لڑکی سے نکاح کرانا چاہو، تو ہم رشتہ دینے کے لیے تیار ہیں؛ یہ بھی شریعت سے ثابت ہے۔ دیکھو! حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنی صاحبزادی حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے رشتہ کے لیے خود حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس گئے اور ان سے پوچھا کہ اگر تم چاہو تو میں اپنی بیٹی حفصہ کا نکاح تم سے کردوں۔

ایک اور روایت بخاری شریف میں موجود ہے۔ اُم المؤمنین حضرت اُم حبیبہ رضی اللہ عنہا نے حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) سے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ میری بہن سے نکاح کرلیجئے۔ حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے پوچھا: کیا تم ایسا چاہتی ہو؟ اس لیے کہ کسی کے شوہر کے نکاح میں کوئی دوسری عورت آئے یہ تو عام طور پر عورت کا مزاج نہیں ہے، اس لیے حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان کا امتحان لینے کے لیے پوچھا۔ انہوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میں آپ کے نکاح ہوں، اور آپ

کسی اور سے بھی نکاح توکرہی رہے ہیں ،اور کسی بھی عورت کا آپ کے نکاح میں آنا اس کے لیے دنیاوآخرت میں بڑی سعادت کی بات ہے،تومیں یہ چاہتی ہوں کہ یہ سعادت میری بہن کو نصیب ہوجائے۔ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: وہ میرے لیے حلال نہیں ہے، اس لیے کہ کسی عورت کے نکاح میں ہوتے ہوئے اس کی بہن سے نکاح کرنا حرام ہے۔ بہرحال! امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب" الجامع الصحیح"میں مستقل ایک عنوان قائم کیا ہے:باب عَرْضِ الإِنْسَانِ ابْنَتَهُ أَوْ أُخْتَهُ عَلَى أَهْلِ الْخَيْرِ"اس کے تحت اس روایت کولائے ہیں ،جس سے معلوم ہوتا ہے کہ لڑکی والوں کی طرف سے پیشکش کی جاسکتی ہے۔(بخاری شریف: رقم الحدیث:۵۱۲۳)

آج ہمارے سماج میں اس کو معیوب سمجھ کر لڑکی والے بیٹھے رہتے ہیں یہاں تک کہ لڑکی کی عمر بڑی ہوجاتی ہے اور پھر زندگی بھر اس کا نکاح نہیں ہوپاتا۔اس لیے معلوم ہوجانا چاہیے کہ اگرچہ بہتر شکل تو وہی تھی کہ انتظار کیا جاتا ،لیکن جب دیکھ رہے ہیں کہ وہ شکل نہیں بن رہی ہے تو پھر اپنی طرف سے پیش قدمی کر کے معاملہ کو نمٹانے کی ضرورت ہے،اس انتظار میں بیٹھے رہنا کہ سامنے سے رشتہ آئے تو شادی کریں گے اور رشتہ نہ آئے تو لڑکیوں کے نکاح نہ کرنا، یہاں تک کہ ساری زندگی اسی طرح گزر جائے،یہ پسندیدہ نہیں ہے،اس کے نتیجہ میں پھر بہت ساری برائیاں پھیلتی ہیں۔

فوائدِ حدیث :

اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر آپ کے کسی طرزِ عمل سے کسی کو ناراضگی ہوئی ہو، اوراسی وقت اس بات کا خلاصہ کرنے میں دوسری کوئی خرابی لازم آتی ہو تو آپ اس وقت خاموشی اختیار کرسکتے ہیں ،بعد میں جب وہ خرابی نہ رہے، تو پھر آپ اس بات کا خلاصہ کر کے اس ناراضگی کو دور کرلیں۔

اور یہ بھی معلوم ہوا کہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جب حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے سامنے تذکرہ کیا تو انہوں نے یہ نہیں سوچا کہ جب حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ارادہ ان سے نکاح کرنے کا ہے، تو آپ پیغام بھیجیں گے ہی !اس لیے اگر میں ابھی سے کہہ دوں تو اس میں کیا حرج ہے! اس لیے کہ اس وقت تو صرف آپ کا ارادہ معلوم ہوا تھا، اب معلوم نہیں کہ اس ارادہ میں پختگی آ کر آپ اس کو عملی جامہ پہناتے ہیں یا نہیں ؟ اس لیے یہ چیز راز ہی کی تھی، اورانہوں نے اس کا لحاظ کیا۔ لیکن ہم لوگ ایسے معاملات میں ذرا فاسٹ (Fast) چل جاتے ہیں ،اور یہی سوچنے لگ جاتے ہیں کہ جب ارادہ کا اظہار کیا ہے تو اگر میں ابھی کہہ دوں تو اس میں کیا حرج ہے!اگر سامنے والے نے کہا ہو کہ آپ کہہ دیں تاب تو ٹھیک ہے، لیکن جب اس نے کہا نہیں ہے، بلکہ صرف اپنے ارادہ کا اظہار کیا ہے تو ہمیں حق نہیں پہنچتا کہ اس بات کا کسی کے سامنے اظہار کریں۔

اور یہاں حضور (ﷺ) نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے یہ نہیں فرمایا تھا کہ یہ بات راز کی ہے، بلکہ جس انداز سے تذکرہ کیا تھا اس سے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سمجھ گئے تھے کہ میرے سامنے اس کا تذکرہ فرمارہے ہیں، کسی اور کے سامنے اس کا تذکرہ نہیں فرمایا ہے۔اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی آدمی اپنے کسی ارادہ کا اظہار صرف ہمارے ہی سامنے کرے، کسی اور کے سامنے نہ کرے، جس سے پتہ چلے کہ وہ آئندہ کوئی کام کرنا چاہتا ہے، تو یہ بھی اس کا راز ہے جس کا کسی دوسرے کے سامنے اظہار ہونا نہیں چاہیے۔

حضور (ﷺ) کے مرض الوفات کا واقعہ:

حدیث ۶۸۷:-

وعن عائشة رضی اللہ عنہا قالت: كُنَّ أَزْوَاجُ النَّبِيِّ (ﷺ) عِنْدَهُ، فَأَقْبَلَتْ فَاطِمَةُ رضی اللہ عنہا تَمْشِي، مَا تُخْطِئُ مِشيتُها مِنْ مِشْيَةِ رسولِ الله (ﷺ) شَيْئاً، فَلَمَّا رَآهَا رَحَّبَ بِهَا، وقال: مَرْحباً بِابْنَتِي. ثُمَّ أَجْلَسَهَا عَنْ يَمِينِهِ أَوْ عَنْ شِمَالِهِ ثُمَّ سَارَّهَا، فَبَكَتْ بُكَاءً شَدِيداً. فَلَمَّا رَأى جَزَعَهَا، سَارَّهَا الثَّانِيَةَ، فَضَحِكَتْ. فقلتُ لَهَا: خَصَّكِ رسولُ الله (ﷺ) مِنْ بَيْنِ نِسَائِهِ بِالسِّرَارِ، ثُمَّ أَنْتِ تَبْكِينَ! فَلَمَّا قَامَ رسولُ الله (ﷺ) سَأَلْتُهَا: مَا قَالَ لَكِ رسولُ الله (ﷺ)؟ قالت: مَا كُنْتُ لأُفْشِي عَلَى رسول الله (ﷺ) سِرَّهُ. فَلَمَّا تُوُفِّيَ رسولَ الله (ﷺ) قُلْتُ: عَزَمْتُ عَلَيْكِ بِمَا لِي عَلَيْكِ مِنَ الحَقِّ لَمَا حَدَّثْتِنِي مَا قَالَ لَكِ رسول الله (ﷺ)؟ فقالت: أَمَّا الآن فَنَعَمْ. أَمَّا حِيْنَ سَارَّنِي فِي المَرَّةِ الأُولَى، فَأَخْبَرَنِي أَنَّ جِبْرِيلَ كَانَ يُعَارِضُهُ القُرآنَ فِي كُلِّ سَنَةٍ مَرَّةً أَوْ مَرَّتَيْنِ، وَأَنَّهُ عَارَضَهُ الآنَ مَرَّتَيْنِ، وَإِنِّي لا أُرَى الأَجَلَ إِلاَّ قَدِ اقْتَرَبَ، فَاتَّقِي اللهَ وَاصْبِرِي، فَإِنَّهُ نِعْمَ السَّلَفُ

أَنَا لَكِ، فَبَكَيْتُ بُكَائِي الَّذِي رَأَيْتِ. فَلَمَّا رَأَى جَزَعِي سَارَّنِي الثَّانِيَةَ فَقَالَ: يَا فَاطِمَةُ! أَمَا تَرْضَيْنَ أَنْ تَكُونِي سَيِّدَةَ نِسَاءِ الْمُؤْمِنِينَ أَوْ سَيِّدَةَ نِسَاءِ هٰذِهِ الْأُمَّةِ؟ فَضَحِكْتُ ضَحِكِي الَّذِي رَأَيْتِ.

ترجمہ مع تشریح:۔حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم (ﷺ) کی تمام ازواجِ مطہرات مرض الوفات میں آپ کے پاس بیٹھیں ہوئی تھیں، اسی درمیان حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا تشریف لائیں، ان کی چال حضورِ اکرم (ﷺ) کی چال سے ذرّہ- برابر بھی فرق نہیں رکھتی تھی (جس طرح حضورِاکرم (ﷺ) چلتے تھے، ہوبہو اسی انداز سے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا چلتی تھیں۔ حضور (ﷺ) اپنی اس بیماری میں اپنی چارپائی پر لیٹے ہوئے تھے جب آپ (ﷺ) نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو آتے ہوئے دیکھا) تو ان کو مرحبا اور خوش آمدید کہا (معلوم ہوا کہ آنے والے کا "Wel Come" کرنا چاہیے، تاکہ وہ یہ سمجھے کہ میری آمد پر ان کو مسرت ہے، یہ بھی آنے والے کا ایک طرح کا اکرام ہے کہ اس کا استقبال اس انداز سے کیا جائے جس سے اس کا جی خوش ہو جائے۔ مہمان کے ساتھ جو آداب برتے جاتے ہیں ان میں پہلا ادب یہی ہے۔ اس معاملہ میں بھی ہمارے یہاں بڑی کوتاہیاں ہوتی ہیں دیکھو! حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی آمد پر حضور (ﷺ) نے فرمایا:) "مَرْحَبًا بِابْنَتِي" پیاری بیٹی! آؤ، تمہارا آنا باعثِ مسرت ہے۔ پھر حضور (ﷺ) نے ان کو اپنے پاس بٹھایا، اور ان کے کان میں رازدارانہ انداز میں کوئی بات ارشاد فرمائی، جس کو سن کر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بہت روئیں۔ حضور (ﷺ) نے جب ان کی اس بے صبری اور تکلیف کو دیکھا تو پھر دوبارہ ان کے کان میں رازدارانہ طور پر کوئی بات ارشاد فرمائی جس کو سن کو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا ہنس پڑیں اور خوش ہو گئیں، ان کا غم دور ہو گیا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ مَیں نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے کہا: یہاں حضور (ﷺ) کی تمام ازواجِ مطہرات بیٹھی ہوئی ہیں ان کو چھوڑ کر حضور

(صلی اللہ علیہ وسلم)نے تمہارے کان میں ایک بات کہی، جو تمہارے لیے بڑے فخر کی چیز تھی؛ پھر بھی تم رونے لگیں ؟ پھر جب حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) وہاں سے ہٹے۔اور بعض روایتوں میں سے کہ جب وہ خود وہاں سے اُٹھیں تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان سے پوچھا : حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے تمہارے کان میں کیا بات کہی تھی؟ذرا مجھے بھی بتاؤ۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے کہا:میں حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بھید کو کھولوں گی نہیں (جب کہ سب موجود تھیں اور میرے کان میں یہ بات کہی،اس کا مطلب ہی یہ تھا کہ وہ بات ان سب کے سامنے ظاہر کرنے جیسی نہیں ہے،اگر سب کو بتانی ہوتی تو حضور(صلی اللہ علیہ وسلم)میرے کان میں کیوں فرماتے؟اس لیے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے انکار کر دیا اور نہیں بتلایا)حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب حضور(صلی اللہ علیہ وسلم) کا انتقال ہو گیا اس کے بعد مَیں نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو قسم دے کر کہا: میرا تم پر ماں ہونے کی حیثیت سے حق ہے ،اس کا واسطہ دے کر مَیں تم کو تاکید کرتی ہوں کہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے تم سے جو کہا تھا وہ مجھے بتاؤ۔حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے کہا: ہاں ! اب وہ بات بھید نہیں رہی،اس لیے اب بتانے میں بھی کوئی اشکال نہیں،لہٰذا میں بتاتی ہوں۔پہلی مرتبہ حضور(صلی اللہ علیہ وسلم)نے رازدارانہ انداز میں میرے کان میں جو بات ارشاد فرمائی تھی وہ یہ تھی کہ: حضرت جبرئیل علیہ السلام ہر سال رمضان المبارک میں میرے ساتھ قرآنِ پاک کا دَور ایک مرتبہ کرتے تھے،لیکن اس سال دو مرتبہ دَور کیا(حضور(صلی اللہ علیہ وسلم) نے حضرت جبرئیل کو سنایا اور حضرت جبرئیل علیہ السلام نے حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کو سنایا)اس سے مَیں یہ سمجھتا ہوں کی میری موت کا وقت قریب آگیا ہے، اور اس بیماری میں ہی میری موت آنے والی ہے،اس لیے تم اللہ سے ڈرتی رہنا اور صبر سے کام لینا،اس لیے کہ میں تمہارے لیے بڑا اچھا پیش رو ہوں۔اس پر مَیں رو پڑی تھی جیسا کہ آپ نے دیکھا تھا کہ بڑا سخت رونا آیا تھا۔جب حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے میری تکلیف کو دیکھا تو پھر دوبارہ رازدارانہ انداز میں مجھ

سے ایک بات ارشاد فرمائی: اے فاطمہ! کیا تم اس بات پر راضی نہیں کہ تم ایمان والی عورتوں کی سردار بنائی جاؤ گی، یا اس امت کی عورتوں کی تم سردار ہوگی؟ (گویا اتنا بڑا شرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیا جائے گا) تو مَیں خوشی میں ہنس پڑی جیسا آپ نے دیکھا۔

افادات:- یہاں یہ روایت اسی لیے لائے ہیں کہ دیکھئے! حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایک بات بطورِ راز کے ان کے کان میں ارشاد فرمائی تھی تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے اس کا اتنا لحاظ کیا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جو حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بڑی لاڈلی زوجۂ مطہرہ ہیں، ان کے پوچھنے پر بھی ان کو نہیں بتلایا۔

"فَرَطٌ" یعنی پیش رو۔ جیسے اگر ہمیں بمبئی جانا ہو، تو ہمارا کوئی آدمی ہم سے پہلے بمبئی پہنچ جائے اور ہمارے لیے وہاں قیام کی سہولت کا نظم کرلے؛ اسی کو "فَرَطٌ" یعنی پیش رو سے تعبیر کرتے ہیں۔ پہلے زمانہ میں ایسا ہوتا تھا کہ کسی قافلہ کو سفر کرکے جہاں جانا ہوتا تھا، تو کچھ لوگ پہلے ہی وہاں پہنچ جاتے تھے، اور قیام کی تیاریاں کرلیتے تھے، خیمے لگادیتے تھے، پانی وغیرہ کا انتظام کرلیتے تھے، تاکہ بعد میں آنے والوں کو دشواری پیش نہ آئے۔ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) فرماتے ہیں: مَیں بھی پہلے جارہا ہوں، تاکہ تم بعد میں آؤ تو وہاں تیاریاں ہوجائے۔

بہر حال! حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو اپنی وفات کی اطلاع دی اور حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تمام ازواجِ مطہرات وہاں بیٹھی ہوئی تھیں، اور کسی بھی عورت کے لیے اپنے شوہر کی موت کا تصور سوہانِ روح ہوتا ہے، اس لیے حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) اس چیز کو ان کے سامنے ظاہر کرنا نہیں

چاہتے تھے،اوریہ بات حضور (ﷺ)نے رازدارانہ انداز میں صرف حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو بتلائی۔ اور ظاہر ہے وہ بیٹی تھی اور ایک بیٹی کے لیے بھی اپنے باپ کی جدائی بڑی تکلیف دہ ہوا کرتی ہے ،تواس پروہ روپڑیں ،ان کی تسلی کے لیے حضور (ﷺ) نے دوسری بات ارشاد فرما کر اپنی وفات کی اطلاع دینے سے ان کو جو رنج وتکلیف ہوئی تھی اس کی تلافی فرمادی۔

بعض بھید ہمیشہ کے لیے بھید ہوتے ہیں :

حدیث ۶۸۸ :-

وعن ثَابِتٍ عن أنس رضی اللہ عنہ قَالَ: أَتَى عَلَيَّ رسول الله (ﷺ) وَأَنَا أَلْعَبُ مَعَ الغِلْمَانِ، فَسلمَ عَلَيْنَا، فَبَعَثَنى إِلَى حاجَةٍ، فَأَبْطَأْتُ عَلَى أُمِّي. فَلَمَّا جِئْتُ، قالت: مَا حَبَسَكَ؟ فقلتُ: بَعَثَنى رسولُ الله (ﷺ) لِحَاجَةٍ، قالت: مَا حَاجَتُهُ؟ قُلْتُ: إِنَّهَا سِرٌّ. قالت: لا تُخْبِرَنَّ بِسِرِّ رسول الله (ﷺ) أحداً. قَالَ أَنَسٌ: وَاللهِ لَوْ حَدَّثْتُ بِهِ أحداً لَحَدَّثْتُكَ بِهِ يَا ثَابِتُ. (رواہ مسلم وروی البخاری بعضہ مختصراً)

ترجمہ:-(حضرت ثابت بنانی رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت اَنس رضی اللہ عنہ کے خاص شاگرد اور خادمِ خاص تھے اور حضرت اَنس رضی اللہ عنہ حضورِ اکرم (ﷺ) کے خادمِ خاص تھے)تو حضرت اَنس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:ایک مرتبہ جب کہ میں بچہ تھا اور بچوں کے ساتھ کھیل رہا تھا، نبیِ کریم (ﷺ) میرے پاس تشریف لائے،سلام کیا اور مجھے ایک کام کے لیے بھیجا۔چوں کہ میں ایک کام سے گیا تھا اس وجہ سے گھر پر والدہ کے پاس دیر سے پہنچا،تو میری والدہ نے پوچھا: دیر سے کیوں آئے؟میں نے کہا: حضور (ﷺ) نے ایک کام کے لیے بھیجا تھا۔ کہا: کس کام کے لیے بھیجا تھا؟مَیں نے کہا:وہ راز کی بات ہے، حضور (ﷺ) کا ایک بھید

ہے،اس لیے مَیں نہیں بتاؤں گا۔اس پر والدہ نے بھی کہا: ٹھیک ہے، حضور (ﷺ) کا بھید کسی کو بھی مت بتانا۔بعدمیں جب اس واقعہ کو حضرت ثبات بنانی رحمۃ اللہ علیہ نقل فرمارہے تھے اس وقت کہا کہ حضرت اَنس رضی اللہ عنہ نے مجھ سے فرمایا: اے ثابت!اگروہ بات مَیں کسی سے کہتاتوتم سے کہتا (لیکن میں نے کسی سے نہیں کہی، اورنہ کبھی کسی کو کہوں گا)

افادات:-اس روایت کولاکریہ بتاناچاہتے ہیں کہ بعض بھیداور راز ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جو کبھی بھی کسی کونہیں بتائے جاتے۔دیکھو!اوپر آیاکہ حضور اکرم (ﷺ)نےاپنی وفات کی خبر دی تھی، توحضور (ﷺ) کی وفات کے بعد وہ بات بھید نہیں رہی اس لیے اگراس کا اظہار کیا جاتا ہے کہ فلاں وقت حضور(ﷺ) نے یہ فرمایاتھاتو یہ نہیں کہا جاسکتاکہ بھید کھولا۔یاجیسے حضور(ﷺ) نے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہاسے نکاح کا ارادہ فرمایا تھا توجب تک کہ نکاح نہیں ہواتھاوہاں تک وہ بھید کی بات تھی،لیکن جب نکاح ہوگیاتو اب وہ بات بھید کی نہیں رہی،بلکہ ساری دنیا کے سامنے آگئی۔اب اگرکوئی کہے کہ پہلے مجھ سے حضور(ﷺ) نے یہ کہاتھاتواس میں کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔لیکن بعض بھید اوررازایسے ہوتے ہیں کہ جوہمیشہ کے لیے ہی بھید ہوتے ہیں۔اس روایت کویہاں لاکریہی بتاناچاہتے ہیں کہ دیکھو!حضور (ﷺ) کی وفات کے بعد حضرت اَنس رضی اللہ عنہ حضرت ثبات بنانی رحمۃ اللہ علیہ سے یہ کہتے ہیں کہ اگروہ بات کسی سے کہتاتووہ تم سے کہتا، لیکن میں کسی کونہیں کہوں گا۔

اس سے معلوم ہوا کہ بعض راز ایسے ہوتے ہیں جو ہمیشہ کے لیے راز اور بھید کی ہی حیثیت رکھتے ہیں۔اب وہ کون سے بھید ہوتے ہیں ؟ تو یہ ہر آدمی کی اپنی اپنی سمجھداری کی بات ہے ،آدمی اپنی عقل سے اس کا فیصلہ کر سکتا ہے۔

الوفاء بالعهد وإنجاز الوَعد

عہد وپیمان اور وعدہ پورا کرنا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قال اللہ تعالیٰ:﴿وَأَوْفُوا بِالعَهْدِ إِنَّ العَهْدَ كَانَ مَسْئُولاً . (الاسراء:۳۴)﴾

قال اللہ تعالیٰ:﴿وَأَوْفُوا بِعَهْدِ اللهِ إِذَا عَاهَدْتُمْ . (النحل:۹۱)﴾

وقال تعالیٰ :﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَوْفُوا بِالْعُقُودِ. (المائدۃ:۱)﴾

وقال تعالیٰ:﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لِمَ تَقُولُونَ مَا لاَ تَفْعَلُونَ كَبُرَ مَقْتاً عِنْدَ اللهِ أَنْ تَقُولُوا مَا لاَ تَفْعَلُونَ. (الصف:۲،۳)﴾

عہد و پیمان کو پورا کرنے کا اہتمام :

عنوان قائم کیاہے:عہد و پیمان(جس کو گجراتی میں قرار (કરાર) اور انگریزی میں ایگریمنٹ(Agreemant) کہتے ہیں)اور کسی بھی طرح کے وعدہ کو پورا کرنے کا اہتمام کرنا۔

اسلام نے جن اخلاق اور اعمالِ صالحہ کی تعلیم دی ہے ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ آدمی کسی کے ساتھ جو بھی عہد وپیمان اور وعدہ کرے اس کو پورا کرنے کا اہتمام کرے ،یہ ایک ضروری چیز ہے اور قرآنِ کریم اور نبیٔ کریم (ﷺ) کے ارشادات میں اس کی بڑی تاکید ہے۔ اس سلسلہ میں چند آیتیں پیش کی ہیں :-

باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:﴿وَأَوْفُوا بِالْعَهْدِ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولاً (الاسراء:۳۴)﴾ جو عہد وپیمان، قرار (ڪرار)اور ایگریمنٹ(Agreemant)تم کسی کے ساتھ کرو؛ اس کو پورا کرو۔اس لئے کہ جو عہد و پیمان کیا جاتا ہے،اس کے متعلق کل کو قیامت میں سوال ہوگا اور پوچھا جائے گا کہ جو عہد وپیمان تم نے کیا تھا اس کو پورا کیا یا نہیں؟مطلب یہ ہے کہ اگر اس کو پورا کرنے میں کوتاہی کا ارتکاب کیا ہے یا اس کو پورا نہیں کیا ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر سزا دی جائے گی۔

کامیاب اہلِ ایمان کی نشانیوں میں سے یہ ہے:

قرآنِ پاک میں ایک اور جگہ ارشاد ہے:﴿قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ (المؤمنون:۱)﴾ کامیاب ہونے والے اہلِ ایمان کے کچھ اوصاف،نشانیاں اور علامتیں بتلائی گئی ہیں،ان میں ایک وصف یہ بھی بیان کیا ہے:﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ لِأَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُونَ(۸)﴾ جو اپنی امانتوں اور عہد وپیمان کی رعایت کرتے ہیں،اس کا خیال رکھتے ہیں۔جو عہد و پیمان کسی کے ساتھ کیا گیا ہے اس کو نبھانے کی کوشش کرتے ہیں،اس میں اپنی طرف سے ذرّہ برابر بھی کوتاہی کا ارتکاب نہیں کرتے۔جب یہ ایسی چیز ٹھہری کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کے متعلق سوال ہوگا تو ظاہر ہے کہ اس کا اہتمام کرنا بھی ضروری ٹھہرا۔

اسی کو دوسری جگہ فرمایا:﴿وَأَوْفُوا بِعَهْدِ اللهِ إِذَا عَاهَدْتُمْ (النحل:۹۱)﴾جب تم نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ عہد وپیمان کرلیا تو اس کو پورا کرنے کا اہتمام کرو۔

قرآنی ایک اصول:

فقہاء نے لکھا ہے کہ قرآنِ پاک اور احادیث سے جو احکام ثابت ہوتے ہیں ان کی اصولی چیزوں میں سے یہ بھی ہے کہ جس چیز کا حکم امر کے صیغہ کے ساتھ دیا جائے اس کا کرنا ضروری ہوتا ہے ،الاّیہ کہ اگر اسی کلام میں کوئی ایسا قرینہ ،یا دلیل موجود ہو جس سے وجوب کے علاوہ دوسرا کوئی حکم ثابت ہوتا ہو۔لیکن اگر ایسا نہیں ہے تو اس صورت میں اس پر عمل کرنا ضروری اور واجب ہوتا ہے۔

یہاں بھی امر کا صیغہ استعمال کیا گیا یعنی حکم دیا جارہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نام پر جو تم عہدوپیمان کرتے ہو؛ اس کو پورا کرو، اس میں تمہاری طرف سے کوئی کوتاہی نہیں ہونی چاہیے۔لہٰذا ان احکام پر عمل کرنا ضروری اور لازم ہے۔

زندگی کے معاملات عہد وپیمان ہیں :

﴿یَاأَیُّھَا الَّذِینَ آمَنُوْا أَوْفُوْا بِالْعُقُودِ(المائدۃ:۱)﴾ اے ایمان والو! وہ عقد جو آپس میں کرتے ہو؛ ان کو پورا کرو۔ آپس میں جو عقد اور معاملات کئے جاتے ہیں وہ بھی ایک طرح کا عہد وپیمان ہے۔جیسے :آدمی کسی کے ساتھ اجارہ کا معاملہ کرتا ہے، بیع وشراء یعنی خرید وفروخت کا معاملہ کرتا ہے؛ یہ بھی ایک طرح کا عہد وپیمان ہے۔خرید وفروخت میں جب سب باتیں طے ہوگئیں،

اس کے بعد ان میں سے کوئی ایک آدمی اپنے اس کئے گئے وعدہ اور عہد وپیمان سے پھر جائے، جیسے: دیکھا کہ دوسرا آدمی زیادہ پیسے دے رہا ہے، تو پہلے والے کو انکار کر دیا کہ اب میں تیرے ساتھ معاملہ نہیں کرنا چاہتا، حالاں کہ شرائط کے خلاف کوئی ایسی بات پائی نہیں گئی ہے، محض اس لئے کہ اس کو قیمت زیادہ مل رہی ہے اور دنیوی اعتبار سے کچھ زیادہ فائدہ نظر آرہا ہے، یا اس سودے کو مکمل کرنے کی صورت میں بظاہر اپنا کچھ نقصان نظر آرہا ہے، جیسے: اس مال کا بھاؤ گھٹ گیا اس لئے سودے سے پھر رہا ہے؛ ایسی بہت ساری صورتیں ہیں جو اس حکم میں داخل ہیں

اس آیت "أَوْفُوا بِالْعُقُودِ" میں باری تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ وہ عقد جو آپس میں کرتے ہو: ان کو پورا کرو۔ خرید وفروخت اور اجارہ وغیرہ کے بھی جتنے معاملات آپس میں کئے جاتے ہیں وہ سب اس حکم میں داخل ہیں، یہاں تک کہ نکاح کا معاملہ بھی اس میں داخل ہے۔ ایک مرد جب کسی عورت کے ساتھ نکاح کرتا ہے، تو عقدِ نکاح کے ذریعہ گویا وہ اس بات کی گارنٹی (Guarantee) دیتا ہے کہ میں بیوی کے حقوق کو ادا کروں گا۔ اب اگر شوہر کی طرف سے اس کے حقوق کی ادائیگی میں کمی آئے گی تو اِس عہد کے تقاضوں کو پورا کرنے کا جو حکم اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے دیا گیا تھا اس میں اس کی طرف سے کوتاہی پائی گئی، تو اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کی پوچھ ہوگی۔

اس آیت میں گویا آدمی کی پوری زندگی کو سمیٹ لیا گیا ہے، اس لئے آدمی یہ نہ سمجھے کہ زندگی کا میرا کوئی حصہ اور پارٹ(Part) ایسا ہے جو اس میں داخل نہیں ہے؛ بلکہ زندگی کی تقریباً ساری چیزیں اس حکم میں آجاتی ہیں۔

یہ بڑی خطرناک چیز ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ﴾ اے ایمان والو! ایسی بات کیوں کہتے ہو جس کو کرتے نہیں؟ یعنی آپ نے جب کسی کے ساتھ کوئی معاملہ کیا، عہد وپیمان ، عقد اور وعدہ کیا، اب اگر اس کو آپ پورا نہیں کرتے تو اسی حکم میں آگئے کہ ایک بات جو تم نہیں کرتے تو پھر کہتے ہی کیوں ہو! اللہ تعالیٰ کے یہاں یہ بات بڑی ناراضگی کی اور اللہ کے غضب کو جوش میں لانے والی ہے۔ تم نے کسی سے وعدہ کیا اور اس کو پورا نہیں کیا تو یہ بڑی خطرناک چیز ہے۔ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جن چیزوں کی خاص طور پر تعلیم دی ہے، جو اخلاق اپنی اُمت کو سکھلائے ہیں ، جن چیزوں کی طرف متوجہ کیا ہے، اس میں ایک یہ بھی ہے کہ وعدہ کو پورا کرو، عہد و پیمان کو بجالاؤ، اس عہد وپیمان کے خلاف کوئی چیز نہ کرو۔

معاشرہ میں ہونے والی کوتاہیاں:

جیسے: ایک آدمی کسی کے یہاں ملازم ہوا، تو ملازمت اور سروس کے لئے جو اگریمنٹ کیا جاتا ہے، اس میں دونوں طرف سے معاملات کئے جاتے ہیں اور ساری باتیں طے ہوتی ہیں، مثلاً: آپ کو اپنا اتنا وقت دینا ہے، اور سامنے والے کی طرف سے کہہ دیا جاتا ہے کہ اتنی تنخواہ دی جائے گی۔ اِس کو یوں کرنا ہے، اور اس کے بدلہ میں اُس کو یوں کرنا ہے۔ یہ ایک معاملہ اور معاہدہ ہوا، اب دونوں کے لئے اس کو پورا کرنا ضروری ہے۔

آج کل عام طور پر ہمارے معاشرہ میں ایسا مزاج بنتا جارہا ہے کہ دونوں طرف سے کوتاہیاں برتی جارہی ہیں، اِدھر جس کے ذمہ کچھ کام دیئے گئے وہ بھی اپنے کام کو انجام دینے میں کوتاہی کا ارتکاب کرتا ہے، اس کو جو وقت دینا چاہیے وہ پورا وقت نہیں دیتا، اس میں کمی کرتا ہے، تو یہ اس کے عہد وپیمان کے خلاف ہوجائے گا۔ اُدھر سامنے والی جو پارٹی (Party) اور فریق ہے اس کی طرف سے یہ ہوتا ہے کہ اس نے اگر کام پورا کردیا، تو وہ پورا (Paymant) نہیں کرتا، پوری تنخواہ نہیں دیتا، اس میں سے کچھ کاٹ لیتا ہے، یا وقت پر نہیں دیتا۔ جب آپ نے کسی ٹھیکیدار کو کوئی کام سونپا اور پورا معاملہ طے کرلیا اور کام پورا ہوگیا؛ تو پھر اسے پیسے کیوں نہیں دیئے جارہے ہیں؟ ٹال مٹول کی جارہی ہے کہ کل دیں گے، بعد میں دیں گے، لیٹ (Late) کرتے جارہے ہیں، تاخیر ہوتی جارہی ہے، یہاں تک کہ اگر کسی مزدور سے کوئی مزدوری کروائی جاتی

ہے تو اس کی مزدوری ادا کرنے تک میں سخت کوتاہی اور حق تلفی کا ارتکاب کیا جاتا ہے۔اس کی داستانیں ہیں کہ جب ہم سنتے ہیں تو ہمیں حیرت ہوتی ہے۔اور ایسا بھی نہیں کہ آدمی کے پاس پیسے نہ ہوں،بلکہ پیسے موجود ہوتے ہوئے بھی مزدور کی مزدوری نہیں دیتے،حالاں کہ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے تاکید فرمائی ہے کہ مزدور کا پسینہ سوکھے اس سے پہلے اس کی مزدوری ادا کردو۔اور حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) فرماتے ہیں کہ جس نے کسی مزدور کی مزدوری ادا نہیں کی،تو کل کو قیامت میں مَیں اس کی طرف سے دعویٰ دائر کروں گا اور مدعی بنوں گا۔قیامت میں حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) جس کے وکیل بن کر آجائیں اور اس کی طرف سے دعویٰ دائر کردیں ؛تو اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یہ کتنا اہم معاملہ ہے !

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ چند آیتیں نمونہ کے طور پر پیش کی ہیں،ورنہ قرآنِ پاک میں اس سلسلہ میں بہت ساری آیتیں ہیں۔آگے روایتیں پیش کررہے ہیں۔

منافق کی نشانی اور ہمارا معاشرہ:

حدیث ٦٨٩:-

وعن أبي هريرة رضی اللہ عنہ أن رسول الله (صلی اللہ علیہ وسلم) قال: آيَةُ المُنَافِقِ ثَلَاثٌ: إِذَا حَدَّثَ كَذَبَ، وَإِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ، وَإِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

زَادَ في روايةٍ لمسلم: وإِنْ صَامَ وَصَلَّى وَزَعَمَ أَنَّهُ مُسْلِمٌ.

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبیٔ کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: منافق کی نشانیاں تین ہیں: جب بات کرے تو جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے تو وعدہ خلافی کرے، جب اس کے پاس کوئی چیز امانت کے طور پر رکھی جائے تو اس میں خیانت کا ارتکاب کرے

مسلم شریف کی روایت میں ہے:- وہ آدمی چاہے نماز پڑھتا ہو، روزہ رکھتا ہو، اور یہ سمجھتا ہو کہ میں مسلمان ہوں۔

افادات:- جس آدمی میں یہ علامتیں پائی جائیں گویا اس کو خالص مؤمن نہیں کہہ سکتے، اس میں نفاق والی صفات پائی جاتی ہیں۔ مؤمن کی شان یہ ہے کہ اپنے آپ کو ایسی چیزوں سے بچانے کا پورا اہتمام کرے۔ ہمارے اس عنوان اور موضوع سے تعلق رکھنے والی چیز دوسری ہے: "وَإِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ" جب وعدہ کرے تو وعدہ خلافی کرے۔

"وعدہ" میں یکطرفہ معاملہ ہوتا ہے کہ ایک آدمی سامنے والے سے کہے۔ اور "عہد وپیمان" میں دونوں طرف سے وعدے ہوتے ہیں۔ تو جہاں دونوں طرف سے وعدہ ہو؛ اس کو "عہد" سے تعبیر کرتے ہیں، اور جہاں ایک طرف سے عہد ہوتا ہے اس کو "وعدہ" کہا جاتا ہے، دونوں میں کوئی زیادہ فرق نہیں ہے۔ جہاں دونوں طرف سے وعدہ کیا گیا ہے وہاں دونوں کے لئے ضروری ہے کہ اس کی پابندی کریں ، اور جہاں ایک طرف سے وعدہ کیا گیا ہو تو وہاں اس ایک کے لئے ضروری ہے کہ اس کی پابندی کرے، تو وعدہ کرنے کے بعد وعدہ خلافی کرنا منافق کی

علامت قرار دی گئی ہے، ایک مؤمن کے لئے ضروری ہے کہ اپنے آپ کو ایسی بری باتوں سے بچانے کا اہتمام کرے۔

اب وعدہ کے سلسلہ میں یہ تفصیل ہے کہ اگر آدمی نے وعدہ کیا، اس وقت تو دل میں پختہ ارادہ تھا کہ میں اس کو پورا کروں گا، لیکن اس کے بعد حالات کچھ ایسے بدلے کہ اب اُس وعدہ میں جو چیز کی ذمہ داری لی تھی اس کو ادا کرنے کی اس میں طاقت نہیں رہی، اس کے خلاف صورتیں پیدا ہو گئیں، تو اس صورت کے اندر شرعاً اس کو معذور سمجھا جاسکتا ہے۔ لیکن اگر ایسی صورت نہیں ہے، یا یہ ہے کہ جس وقت وعدہ کیا تھا اسی وقت دل میں چور تھا، جیسے بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اسی وعدہ خلافی کو نفاق کی علامت قرار دیا گیا جس میں وعدہ کرتے وقت ہی آدمی کے دل میں یہ ہوتا ہے کہ اس وعدہ کو پورا نہیں کرنا ہے؟

آج کل یہ چیزیں عام ہوتی جارہی ہیں کہ جب کہہ رہا ہوتا ہے اسی وقت دل میں خیال ہوتا ہے کہ یہ بات پوری نہیں کرنی ہے۔ بعض مرتبہ کہتے ہیں کہ سوچو! کیا کہہ رہے ہو؟ تو وہ کہتا ہے: مولوی صاحب! آپ کیوں فکر کرتے ہو، یہ تو ایسے ہی کہنے کی باتیں ہیں، جو کہہ رہا ہوں اس کو کرنا کہاں ہے؟ تو یہ پورے نفاق کی علامت ہے جس پر نبی کریم ﷺ نے بڑی سخت وعیدیں ارشاد فرمائی ہیں۔

مسلم شریف کی روایت میں ہے: "وإِنْ صَامَ وَصَلَّى وَزَعَمَ أَنَّهُ مُسْلِمٌ " وہ آدمی چاہے نماز پڑھتا ہو اور روزہ رکھتا ہو اور یہ سمجھتا ہو کہ میں مسلمان ہوں، پھر بھی حضور (ﷺ) فرماتے ہیں کہ جس میں یہ تین باتیں پائی جاتی ہیں تو وہ منافق ہے۔ کتنی سخت وعید ہے ! اس لیے ایسی بری باتیں جن کو نبی کریم (ﷺ) نے نفاق کہا ہے، ان سے اپنے آپ کو بچانے کی ضرورت ہے۔

باطن کچھ ،اور ظاہر کچھ:

نفاق کیا ہے؟ نبی کریم (ﷺ) کے زمانہ میں ایک گروہ اور جماعت تھی جو اپنے آپ کو اپنی زبان سے مؤمن اور مسلمان ظاہر کرتے تھے، لیکن دل میں وہ بات نہیں تھی دل میں ان کا عقیدہ اس کے خلاف تھا۔ گویا باطن کچھ تھا اور ظاہر کچھ اور کرتے تھے؛ ایسے لوگ منافق کہے جاتے تھے۔ تو یہ آدمی بھی جب اپنے آپ کو کہتا ہے کہ میں مسلمان ہوں تو اس کو چاہیے کہ ایمان کے تقاضوں کو پورا کرتا رہے، اور ایمان کے تقاضوں میں سے یہ ہے کہ آدمی جو وعدہ اور عہد وپیمان کرے؛ اس کو پورا کرے۔ جب وہ وعدہ کو پورا نہیں کررہا ہے تو گویا مؤمن والی شان اور مؤمن والی بات نہیں ہے، بلکہ منافقوں والا عمل اور خصلت ہوگئی۔ اسی لئے حضورِ اکرم (ﷺ) فرماتے ہیں کہ یہ آدمی منافق ہے؛ گویا ایسا آدمی مخلص مؤمن نہیں کہا جائے گا۔

منافق کی چار علامتیں:

حدیث ۰ ۶۹:-

وعن عبد الله بن عمرو بن العاص رضی الله عنهما: أَنَّ رسول الله (صلى الله عليه وسلم) قَالَ: أَرْبَعٌ مَنْ كُنَّ فِيهِ كَانَ مُنَافِقاً خَالِصاً، وَمَنْ كَانَتْ فِيهِ خَصْلَةٌ مِنْهُنَّ كَانَتْ فِيهِ خَصْلَةٌ مِنَ النِّفَاقِ حَتَّى يَدَعَهَا: إِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ، وَإِذَا حَدَّثَ كَذَبَ، وَإِذَا عَاهَدَ غَدَرَ، وَإِذَا خَاصَمَ فَجَرَ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: جس آدمی میں چار باتیں ہوں گی وہ خالص منافق ہوگا، اور جس میں ان میں سے کوئی ایک بات ہوگی گویا اس میں نفاق کی ایک بات پائی جاتی ہے، یہاں تک کہ اس کو چھوڑ دے (جب تک کہ چھوڑے گا نہیں وہاں تک گویا یہ برائی اس میں موجود ہے) جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو اس میں خیانت کرے۔ جب بات کرے تو جھوٹ بولے۔ جب کوئی عہد وپیمان کرے تو اس کو توڑ دے، اس کی خلاف ورزی کرے۔ اور جب کسی کے ساتھ جھگڑا کرے تو گالی گلوچ پر اتر آئے۔

افادات:- گویا منافق کی چار علامتیں بتلائی ہیں۔ اس روایت کو یہاں اس جزو "وَإِذَا عَاهَدَ غَدَرَ" کی وجہ سے لائے ہیں، کہ جب کوئی عہد وپیمان کرے تو اس کی خلاف ورزی کرے، اس کو توڑ دے؛ یہ نفاق کی ایک علامت ہے۔

وعدہ پورا کرنے کا عجیب وغریب واقعہ:

دیکھو !وعدہ کو پورا کرنے کا نبیٔ کریم (ﷺ) نے کتنا زیادہ اہتمام فرمایا۔غزوۂ بدر کا واقعہ ہے۔حضرت حذیفہ بن یمان اوران کے والد حضرت یمان رضی اللہ عنہما دونوں اپنے گھر پر مسلمان ہوئے،اسلام لانے کے بعد ہجرت کر کے وہ مدینہ منورہ جارہے تھے، ابو جہل مشرکین کا لشکر لے کر مسلمانوں کے مقابلہ اور اپنے تجارتی قافلہ کی حفاظت کے لئے جارہا تھا۔غزوۂ بدر اسی لئے تو پیش آیا تھا۔راستہ میں یہ دونوں باپ بیٹا حضرت حذیفہ اور حضرت یمان رضی اللہ عنہما کو ابو جہل کے لشکر نے گرفتار کرلیا، ان کو ابو جہل کے پاس لایا گیا۔اس نے پوچھا: کہاں جارہے ہو؟ کہا : مدینہ منورہ جارہے ہیں۔پوچھا: کیوں؟ کہا: نبیٔ کریم (ﷺ) کی ملاقات و زیارت اوران کی خدمت میں حاضری دینے کے لئے۔اس نے کہا: وہ تو لشکر لے کر ہمارے مقابلہ کے واسطہ نکلے ہیں، اس لئے تم دونوں کو ہم نہیں چھوڑیں گے ،اپنی تحویل ہی میں رکھیں گے،اس لئے کہ اگر ہم نے تم کو چھوڑ دیا تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ اپنے دشمن کے لشکر میں ہم نے دو سپاہیوں اور لڑنے والوں کا اضافہ کر دیا،اس لئے ہم تم کو جانے نہیں دیں گے۔ان دونوں باپ بیٹوں نے وعدہ کیا کہ ہم کو چھوڑو، تمہارے مقابلہ میں لڑنے کے لئے ہم نہیں آئیں گے،ہم تو خالص ملاقات اور زیارت کرنے جارہے ہیں ،چناں چہ اس وعدہ پر ان دونوں کو چھوڑ دیا گیا، اب یہ دونوں حضرات نبیٔ کریم (ﷺ) سے جاکر ملے، آپ (ﷺ) لشکر لے کر نکل رہے تھے ،انہوں نے اپنا پورا قصہ سنایا کہ ایسی صورت پیش آئی۔اس کے بعد انہوں عرض کیا: اے اللہ کے

رسول! آپ مشرکین اور کفار کے مقابلہ کے لئے تشریف لے جارہے ہیں؛ ہمیں بھی ساتھ چلنے کی اجازت دیجئے۔

اس وقت حالات یہ تھے کہ مسلمانوں اور کفار کے درمیان یہ پہلی جنگ تھی جس کو قرآنِ پاک نے یوم الفرقان، فیصلہ کے دن سے تعبیر کیا گیا۔ گویا یہ وہ جنگ ہے جس نے کفر اور اسلام کے درمیان امتیازی خط کھینچ دیا اور فیصلہ کر دیا۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) ایسی جنگ کے لئے تشریف لے جارہے ہیں، اور پھر حالات ایسے تھے کہ اُدھر مشرکین کا لشکر ہر طرح کے سازوسامان سے لیس تھا، تمام ہتھیار ان کے پاس موجود تھے، تعداد کے اعتبار سے دیکھا جائے تو ایک ہزار کی تعداد تھی۔ اور اِدھر مسلمان صرف تین سو تیرہ تھے اور سازو سامان کے اعتبار سے دیکھا جائے تو صرف ستر (۷۰) اونٹ، دو (۲) گھوڑے اور آٹھ (۸) تلواریں تھیں۔ تلواریں بھی سب کے پاس نہیں تھیں، کسی کے پاس ڈنڈا تھا، کسی کے پاس نیزہ تھا، تو کسی کے پاس اور کچھ تھا۔ ایسے موقع پر ظاہر ہے کہ جتنے آدمی زیادہ بڑھیں؛ اتنی ہی قوت اور طاقت بڑھے گی۔ جنگی حکمتِ عملی اور وقتی مصلحت کا تقاضہ بھی یہی تھا کہ اپنے کسی ایک آدمی کو بھی کھویا نہ جائے، بلکہ اپنے ساتھ رکھنے کی کوشش کی جائے۔ اور ادھر یہ باپ بیٹے دونوں نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) سے درخواست کررہے ہیں کہ اللہ کے رسول! ہمیں اجازت دیجئے کہ ہم بھی آپ کے ساتھ شریک ہوں۔ لیکن حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: نہیں! تم ان سے وعدہ کر چکے ہو۔ انہوں نے کہا: اللہ کے

رسول! وہ تو گردن پر تلوار رکھ کرلیا گیا وعدہ تھا۔ آپ (ﷺ) نے فرمایا: نہیں! جب تم نے وعدہ کر لیا ہے، تو اب تم کو ہم شریک ہونے کی اجازت نہیں دیتے۔

دیکھو! آدمی کے عمل کی پختگی کا پتہ ایسے موقع پر ہی چلتا ہے جب حالات ناسازگار اور ناموافق ہوں، ایسے حالات میں کوئی آدمی شریعت پر عمل کر کے بتلائے تو سمجھا جاسکتا ہے کہ یہ شریعت پر عمل کے معاملہ میں پختہ ہے۔ حالات کی سازگاری کے موقع پر تو ہر آدمی آسانی سے عمل کرلیتا ہے۔ یہاں ان کی طرف سے اصرار ہورہا تھا لیکن نبیٔ کریم (ﷺ) نے عملی طور پر ان کے وعدہ کو پورا کر کے بتلادیا۔ ہم اور آپ ہوتے تو تاویلیں کرلیتے کہ دشمن کے مقابلہ کا وقت ہے، اسلام اور کفر کا سوال ہے، اسلام کو قوت پہنچانا ضروری ہے، ایسے موقع پر یہ سب تھوڑا ہی دیکھا جاتا ہے، اور معلوم نہیں کیا کیا تاویلیں کی جاتیں، لیکن نبیٔ کریم (ﷺ) نے ان کو اجازت نہیں دی اور وہ شریک نہ ہوپائے۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اسلام میں وعدہ اور عہد وپیمان کو پورا کرنے کا کتنا زیادہ اہتمام اور کتنی سخت تاکید ہے کہ نبیٔ کریم (ﷺ) نے ایسے موقع پر بھی ان کو اپنے ساتھ جنگ میں شریک ہونے کی اجازت نہیں دی۔

عہد پورا کرنے کا بے مثال نمونہ:

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے متعلق بعض حضرات اعتراض کی باتیں کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ اس سے ہماری حفاظت فرمائے۔ ان کے حالات میں لکھا ہے کہ ان کے زمانۂ خلافت میں چوں کہ

ان کا پایۂ تخت شام میں تھا اور رومی سلطنت کی سرحدیں اس وقت شام کے ساتھ ملی ہوئی تھیں، تو رومیوں کے ساتھ ان کا مقابلہ ہوتا رہتا تھا۔ ایک موقع پر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے رومی بادشاہ کے ساتھ ایک مدت تک کے لئے صلح کرلی کہ اتنی مدت تک ہم اور آپ آپس میں جنگ اور لڑائی نہیں کریں گے۔ جب صلح کی وہ مدت ختم ہونے جارہی تھی اور کچھ دن باقی تھے، تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے سوچا کہ ابھی کچھ دن باقی ہیں، مَیں اپنے لشکر کو لے جاکر سرحدوں (Boarder) پر بٹھادوں، ان کو یہ اندازہ ہی نہیں ہوگا کہ صلح کی مدت پوری ہوتے ہی یہ لوگ حملہ کردیں گے، وہ تو سمجھ رہے ہوں گے کہ صلح کی مدت پوری ہوگی اس کے بعد معلوم نہیں کیا ہوتا ہے؟ اس لئے انہوں نے ایک تدبیر سوچی کہ اپنا لشکر وہاں لے جاکر لگادوں، چناں چہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے سرحد پر اپنا لشکر لگا دیا۔ ابھی صلح کا زمانہ چل رہا تھا اور صلح کے زمانہ کے درمیان لڑائی شروع کرنے کا ارادہ بھی نہیں تھا، بلکہ ارادہ یہ تھا کہ جہاں صلح کی مدت پوری ہوگی- جیسے آج بارہ بجے ٹائم ختم ہوگا اور بارہ بج کر ایک منٹ پر- فوراً حملہ کردیں گے۔ چناں چہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ پہلے سے وہاں لشکر بٹھادیا گیا تھا اور اچانک ایسا کیا گیا جس کا رومیوں کو وہم وگمان اور خیال بھی نہیں تھا اس لیے انہوں نے دفاع کی کوئی تدبیر بھی نہیں کی تھی۔ جب اس طرح حملہ کیا گیا تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا لشکر دشمن کے علاقہ میں آگے بڑھتا ہی چلا گیا اور بہت سارا علاقہ فتح کرلیا، اور برابر آگے بڑھ رہے تھے کہ دیکھا پیچھے سے ایک گھوڑے سوار آرہا ہے اور کہہ رہا ہے: "أَللّٰهُ أَكْبَر، أَللّٰهُ أَكْبَر! وَفَاءٌ لَا غَدَرًا، وَفَاءٌ لَا غَدَرًا" اے

ایمان والو! ٹھہر جاؤ، مؤمن کا شیوہ عہد و پیمان کو پورا کرنا ہے، اس کی خلاف ورزی کرنا نہیں ہے۔ یہ سن کر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ رک گئے۔ جب وہ قریب آئے تو دیکھا وہ حضرت عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ تھے، انہوں نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے کہا: میں نے نبیٔ کریم (ﷺ) کا ارشاد سنا ہے: مَنْ كَانَ بَيْنَهُ وَبَيْنَ قَوْمٍ عَهْدٌ، فَلَا يَحُلَّنَّ عُقْدَةً، وَلَا يَشُدَّنَّهَا، حَتَّى يَنْقَضِيَ أَمَدُهَا أَوْ يَنْبِذَ إِلَيْهِمْ عَلَى سَوَاءٍ. (تفسیر ابن کثیر، الانفال، آیت نمبر: ۵۸) جب کسی قوم کے ساتھ صلح کے لئے کوئی عہد وپیمان کیا ہو، تو نہ اس کی گرہ کو کھولے، اور نہ اس کو سخت مضبوط کرے، جب تک کہ اس کی مدت پوری نہ ہو، یا یہ ہے کہ ان کو پہلے سے کھلم کھلا بتلادیا جائے کہ ہمارا اور آپ کے درمیان عہد و پیمان باقی نہیں ہے۔

ان کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ جب صلح کا زمانہ چل رہا ہے اس میں آپ کا اپنے لشکر کو لے جاکر سرحدوں کے اوپر بٹھا دینا، جب کہ وہ یوں سمجھ رہے ہیں کہ ابھی کوئی ایسی تدبیر کی نہیں جائے گی، یہ آپس کی صلح کے تقاضہ کے خلاف ہے، یہ کاروائی بھی آپ کو صلح کی مدت کے پوری ہونے کے بعد کرنی چاہیے تھی، صلح کی مدت چل رہی ہے اور آپ یہ کاروائی کر رہے ہیں، یہ ٹھیک نہیں ہے، اس لئے آپ نے یہ جو کیا ہے وہ ایک طرح کی عہد شکنی ہے۔ یہ سن کر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے لشکر کو واپسی کا حکم دیا اور دشمن کا وہ پورا علاقہ جو فتح کرلیا گیا تھا خالی کردیا اور اپنے لشکروں کو واپس بلا لیا گیا۔

تاریخ کی کتابوں میں لکھاہے اور علماء فرماتے ہیں کہ مذاہب کی تاریخ میں کوئی دوسرا مذہب ایسا نمونہ پیش نہیں کرسکتا جس میں فتح شدہ علاقہ اس طرح واپس کردیا گیا ہو۔

آج کے حالات کا موازنہ:

دشمن کے معاملہ میں تو آج کی تہذیب یافتہ دنیا جو اپنے آپ کو حقوقِ انسانی کی علمبردار کہتی ہے، وہ کیاکچھ دھندے نہیں کرتی ہے؛وہ ہم اورآپ سب جانتے ہیں۔ آپ لوگ بھی اخبارات پڑھتے ہیں اس میں دیکھتے ہیں کہ یہ لوگ کیسی کیسی حرکتیں کرتے ہیں۔ لیکن یہاں دیکھئے کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ماننے والے ،آپ پر ایمان لانے والے ،آپ کے گرویدہ لوگوں نے دنیا کو یہ نمونہ بتا دیا کہ فتح کیا ہوا علاقہ بھی محض اس شک کی وجہ سے واپس کردیا کہ کہیں ہمارایہ عمل حضورِاکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اس ارشاد کے خلاف نہ ہوجائے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے انصاف کی ایک جھلک:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جس زمانہ میں بیت المقدس کو فتح کیا تو وہاں جو غیر مسلم یہود و نصاریٰ وغیرہ آباد تھے، ان کے ساتھ عقدِ جزیہ کامعاملہ کیا گیا،یعنی ان کو معاہِدبنایا گیااوران کے ساتھ عہد کیا گیا۔اسلامی حکومت میں رہنے والے غیر مسلم جن کو اس بات کی گارنٹی دی جاتی ہے کہ تمہاری جان ومال کی ہماری طرف سے حفاظت کی جائے گی، لیکن اس کے معاوضہ

میں تم سے ایک مخصوص مقدار رقم جزیہ اور ٹیکس کے طور پر لی جائے گی، جن کے ساتھ اس طرح کا معاہدہ ہوتا ہے اس کو عربی زبان میں "مُعَاهِدْ" کہتے ہیں کہ ان کے ساتھ عہد اور عقدِ ذمہ کیا گیا ہے، اسی لیے ان کو ذمی بھی کہا جاتا ہے

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں دشمن کے مقابلہ کے لئے ایک موقع پر زیادہ لشکر کی ضرورت پیش آئی، تو مشورہ میں یہ بات آئی کہ وہ لشکر جو بیت المقدس والے علاقہ کی حفاظت کے لئے رکھا گیا ہے، اس کو وہاں سے ہٹا کر سرحد (Boarder) پر بھیج دیا جائے، اس لئے کہ وہاں اس وقت شدید ضرورت ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ٹھیک ہے، اس لشکر کو وہاں سے بلا کر اس جگہ بھیجا تو جائے گا، لیکن چوں کہ یہ لشکر ہم نے وہاں غیر مسلموں کی جان ومال کی حفاظت کے لئے رکھا تھا، اور ہم نے ان سے حفاظت کا عہد کیا ہے اور اسی پر ہم جزیہ بھی لیتے ہیں، اس لئے اس سال کا جو جزیہ ان سے لیا ہے وہ ہم واپس کریں گے۔ چناں چہ اعلان کیا گیا اور جو رقم ان سے جزیہ کے طور پر وصول کی گئی تھی ان کو واپس کی گئی کہ ہم اپنے اس لشکر کو یہاں سے ہٹا رہے ہیں اور ہم نے تم سے تمہارے تحفظ کا وعدہ کیا تھا، اسی تحفظ کے لئے یہ لشکر یہاں رکھا تھا، لیکن جب اس لشکر کو یہاں سے ہٹا رہے ہیں تو تمہاری وہ رقم بھی واپس کی جا رہی ہے۔ یہی وہ اخلاق تھے جن کو دیکھ کر غیر مسلم اسلام قبول کرتے تھے۔

آج ضرورت ہے اس بات کی...:

آج اس زمانہ میں بھی کوئی مسلمان اگر نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی انہی ساری تعلیمات کو اپنا کر زندگی گزارے گا، تو اس گئے گزرے دور میں بھی اس کا وہ عمل لوگوں کے لئے ایمان کی دعوت کا ذریعہ بنے گا۔ دعوت صرف زبانی چیز نہیں ہے، بلکہ اصل دعوت تو عمل کی ہے۔ آپ دیکھئے کہ جاوا سُماٹرا اور چین کے علاقہ میں اسلام کہاں سے پہنچا! وہاں کیا کوئی داعی پہنچے تھے؟ نہیں! بلکہ وہاں تجارت کرنے والے پہنچے تھے، لیکن انہوں نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بتلائے ہوئے طریقہ کے مطابق تجارت کی، تو نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں کے لوگوں نے اسلام قبول کرلیا۔ اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تعلیمات کو اپنی زندگی میں اپنائیں۔

آج ہمارا اسلام مسجدوں تک محدود ہو کر رہ گیا ہے، ہم یوں سمجھتے ہیں کہ پانچ وقت نماز پڑھ لی، بس کافی ہے۔ نماز اپنی جگہ پر بہت اہم چیز ہے، بلکہ ساری ہی عبادتیں اہم ہیں، لیکن اسلام صرف عبادات کا نام نہیں ہے، بلکہ جیسا کہ میں بار بار بتلا چکا ہوں کہ اسلام کئی شعبوں کا نام ہے، اس میں اخلاق بھی ہیں، معاملات بھی ہیں، معاشرت بھی ہے، اور عبادات بھی ہیں۔ اس لئے ہمیں ہر چیز کو درست کرنے کی ضرورت ہے۔ بلکہ لوگوں کے ساتھ جن چیزوں کا واسطہ پڑتا ہے وہ تو معاشرت ، معاملات اور اخلاق ہے۔ آپ بازار میں جائیں گے تو بازار والوں کو معلوم نہیں ہے کہ آپ نماز کیسی خشوع و خضوع والی پڑھتے ہیں۔ جس کے ساتھ آپ سودا اور

خرید وفروخت کررہے ہیں اس کو یہ معلوم نہیں ہے کہ آپ کتنی لمبی نماز پڑھتے ہیں،اور نماز میں کتنی تلاوت کرتے ہیں ،یہ سب وہ نہیں جانتا، وہ آپ کی نماز نہیں دیکھتا،بلکہ آپ اس کے ساتھ جو سودا کریں گے اور اس میں امانت کے تقاضوں کوجب پورا کریں گے؛ تو یہی چیز اس پر اثرانداز ہوگی۔اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ان چیزوں کا اہتمام کریں۔

وعدہ پورا کرنے کا ایک اور نمونہ:

حدیث ۱۹۶:-

وعن جابر رضی اللہ عنہ **قَالَ قَالَ لی النبیُّ (ﷺ): لَوْ قَدْ جَاءَ مَالُ الْبَحْرَيْنِ أَعْطَيْتُكَ هكَذَا وَهكَذَا وَهكَذَا. فَلَمْ يَجِئْ مَالُ الْبَحْرَيْنِ حَتَّى قُبِضَ النَّبِيُّ (ﷺ). فَلَمَّا جَاءَ مَالُ الْبَحْرَيْنِ أَمَرَ أَبُو بَكْرٍ** رضی اللہ عنہ **فَنَادَى: مَنْ كَانَ لَهُ عِنْدَ رسول الله (ﷺ) عِدَةٌ أَوْ دَيْنٌ؛ فَلْيَأْتِنَا. فَأَتَيْتُهُ وَقُلْتُ لَهُ: إِنَّ النَّبِيَّ (ﷺ) قَالَ لی كَذَا وَ كَذَا. فَحَثَى لی حَثْيَةً فَعَدَدْتُهَا، فَإِذَا هِيَ خَمْسُمِئَةٍ، فَقَالَ لِي: خُذْ مِثْلَيْهَا.** (متفقٌ عليه)

ترجمہ:- حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی ٔکریم (ﷺ) نے مجھ سے وعدہ فرمایاکہ اگر بحرین کا مال آگیا تومیں تمہیں اتنادوں گا،اتنا دوں گا،اتنا دوں گا(لپ بھر کر تین مرتبہ فرمایاکہ اتنادوں گا۔نبی ٔ کریم (ﷺ) کی حیات ِطیبہ میں سب سے زیادہ خراج بحرین کے علاقہ سے آتا تھا اسی کے متعلق آپ (ﷺ)نے ان سے وعدہ کیا تھاکہ وہ جب آئے گا تو تم کومیں اتنا دوں گا)اب بحرین کا وہ خراج والا مال آئےاس سے پہلے حضورِ اکرم (ﷺ) کی وفات ہوگئی۔پھرجب بحرین کا مال آیا

تو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے-جو نبی کریم (ﷺ) کے جانشین بنائے گئے تھے - اعلان کرایا کہ حضورِ اکرم (ﷺ) نے کسی سے وعدہ فرمایا ہو، یا حضورِ اکرم (ﷺ) پر کسی کا کوئی مطالبہ باقی ہو تو وہ آئے اور اپنا مطالبہ، یا نبی کریم (ﷺ) نے ان سے جو وعدہ کیا ہو تو وہ میرے پاس سے وصول کر کے لے جائے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں گیا اور عرض کیا کہ مجھے نبی کریم (ﷺ) نے تین لپیں بھر کر یہ فرمایا تھا (کہ اگر بحرین کا مال آیا تو میں تمہیں اتنا اتنا اتنا دوں گا) حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ایک لپ بھر کر مجھے درہم دیئے، میں نے جب وہ گنے تو پانچ سو (۵۰۰) تھے، پھر مجھ سے کہا کہ ایسے ڈبل یعنی ایک ہزار اور لے لو (آپ (ﷺ) نے تین لپوں کا وعدہ فرمایا تھا تو اس طرح حضورِ اکرم (ﷺ) کے وعدہ کے مطابق کل پندرہ سو (۱۵۰۰) درہم دیئے۔)

افادات:-دیکھو! اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حضورِ اکرم (ﷺ) نے ایک حکمران ہونے کی حیثیت سے وعدہ فرمایا تھا، تو جب آپ (ﷺ) کے انتقال فرما جانے کے بعد آپ کی جگہ پر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ مقرر کئے گئے تو انہوں نے اس بات کا اہتمام کیا کہ مجھ سے پہلے اس جگہ پر حضور اکرم (ﷺ) تھے، اور آپ (ﷺ) نے بحیثیت حکمران کے جو جو وعدے کئے تھے وہ مجھے پورے کرنے ہیں۔

آج کل ہمارے یہاں تو یہ ہوتا ہے کہ کوئی پیڑھی (نسل) چل رہی ہے، اس کے ذمہ دار نے کسی کے ساتھ کوئی معاملہ کیا، اب وہ نہیں رہا اور اس کی جگہ پر کوئی دوسرا آیا، جیسے بیٹا آیا، تو وہ کہتا ہے کہ انہوں نے کہا تھا، ہم نہیں جانتے۔ ارے بھائی! یہ کوئی بات ہوئی؟ اس طرح دنیا

میں زندگی گزاری جاتی ہے؟ یہ غلط طریقہ ہے، اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا۔ آپ جب اس کے ذمہ دار ہونے کی حیثیت سے آئے ہیں تو آپ اسی طرح کا معاملہ کیجئے۔ بہر حال! یہ عہد و پیمان بہت اہم چیز ہے۔

یہ عملی عہد وپیمان ہے:

اب عہد وپیمان اور وعدہ کے متعلق ایک اہم چیز یاد رکھیے۔ وعدہ اور عہد و پیمان کبھی صرف زبان سے ہوتا ہے، کبھی تحریر سے ہوتا ہے، اور کبھی زبان سے تو نہیں بولا جاتا، لیکن عملی طور پر عہد وپیمان ہوتا ہے، جیسا کہ ہم اس ملک میں اس ملک کے شہری ہونے کی حیثیت سے رہتے ہیں تو گویا ہم نے اس ملک کے ساتھ یہ عہد وپیمان کر رکھا ہے کہ یہاں کے قوانین کی ہم پابندی کریں گے، الاّ یہ کہ کوئی قانون ایسا ہو جو شریعت کے خلاف ہو، اور جس پر عمل کرنے کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی لازم آئے؛ تو وہاں پھر قاعدہ یہ ہے: لَاطَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِيْ مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ، خالق کی نافرمانی میں مخلوق کی بات مانی نہیں جائے گی۔ اگر کوئی مسلمان حکمران ہوتا اور وہ کوئی حکم شریعت کے خلاف دیتا تو اس کو بھی ہم بجا نہیں لاتے، گناہ کے کام میں کسی کی بھی فرمانبرداری نہیں کی جاتی، یا ظلم کی کوئی بات ہے تو ظلم کی بات میں تو اپنے بچاؤ کے لئے کچھ کیا جاسکتا ہے، لیکن ایسی کوئی بات نہیں ہے تو پھر ان قوانین کی پابندی ضرور کرنی چاہیے، اُس میں اپنی طرف سے کوتاہی نہیں ہونی چاہیے، مثلاً ٹرافک (Traffic) کے قانون ہیں، تو ان کا بھی

لحاظ کرنا چاہیے، جو لوگ اس کی خلاف ورزی کرتے ہیں ان کے بارے میں علماء نے لکھا ہے کہ وہ گناہِ کبیرہ کے مرتکب ہوتے ہیں ،اس لئے اس کی خلاف ورزی نہیں کرنی چاہیے، تمام قوانین کی رعایت ہونی چاہیے۔ اگر آپ یوں سمجھ کر کریں گے کہ میں اکیلا کروں گا تو اس سے کیا نقصان ہو جائے گا؟ تو آپ کا یہ سوچنا صحیح نہیں ہے ،اس لیے کہ جب آپ نے خلاف ورزی کی تو اس کو دیکھ کر دوسرے نے بھی کی،اس طرح یہی چیز قانون شکنی اور لوگوں کی جان ومال کے غیر محفوظ ہونے کا ذریعہ بنے گی۔اس لئے ایسے تمام امور میں اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ اسی طرح اگر ٹرین (Train) میں سفر کر رہے ہیں تو یہ صحیح نہیں ہے کہ بغیر ٹکٹ کے سفر کریں ،ہر حال میں ٹکٹ (Ticket) لے کر ہی سفر کرنا چاہیے۔

اسی طرح آپ نے جب الیکٹرسٹی والوں کے پاس سے لائن لی ہے تو آپ کے یہاں اس کا میٹر بھی لگایا گیا ہے،اب اس میں ذرّہ برابر بھی کمی نہ کیجئے،بلکہ اس کا بل پورا پورا دیجئے اور اس عہد وپیمان کی حفاظت کیجئے،ورنہ اس حکم کی خلاف ورزی لازم آئے گی۔اور بھی بہت سی چیزیں اس حکم میں آجاتی ہیں۔

الامر فی المحافظة علیٰ ما اعتادہ من الخیر

نیک کاموں کی عادت کو باقی رکھنا

۲۱/ذی الحجہ ۱۴۲۱ھ بسم اللہ الرحمن الرحیم ۱۷/مارچ ۲۰۰۱ء

معمولات کی پابندی کیجئے:

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ باب قائم کیا ہے اس میں بتلانا چاہتے ہیں کہ شریعت نے جن آداب کی ہمیں تعلیم دی ہے ان میں ایک یہ بھی ہے کہ کسی آدمی نیکی کے نیکی کے جو کام شروع کئے ہیں اور جن کاموں کا اپنے آپ کو عادی بنایا ہے، جو اچھے معمولات اور نیکی کے مختلف کام اپنا رکھے ہیں؛ تو اب اس کو چاہیے کہ ان پر پابندی سے عمل کرتا رہے۔ شریعت یہ چاہتی ہے کہ اس سلسلہ کو باقی رکھو، بلاوجہ اس کو چھوڑ مت دو۔

مطلب یہ ہے کہ فرائض اورواجبات تو وہ ہیں کہ جو شریعت نے آدمی کے اوپر ضروری قرار دیئے ہیں، ان کو تو کرنا ہی کرنا ہے، اگر نہیں کرے گا تو وہ اللہ تعالیٰ کا نافرمان اور گنہگار قرار دیا جائے گا۔ ان کے علاوہ ایسے اچھے کام جو اس نے اپنے طور پر اپنا رکھے ہیں، مثلاً: ہر مہینہ، یا ہر سال میں ایک مرتبہ، یا عید کے موقع پر یا رمضان میں دو سو، پانچ سو، ہزار روپے کسی کو دینے کا معمول بنایا ہے، تو اب شریعت یہ تعلیم دیتی ہے کہ یہ سلسلہ ختم نہ کرو، بلکہ جاری رکھو۔ کسی بھی نیکی کے کام کو شروع کرنے کے بعد چھوڑ دینا شریعت کو پسند نہیں ہے، شریعت یہ چاہتی ہے کہ وہ سلسلہ جاری رہنا چاہیے۔ یہ تو گویا ایک پودا ہے جو آپ نے لگایا ہے، اب جب لگا ہی چکے ہیں

تو اس کو پانی دیتے رہو، اس کی حفاظت کرتے رہو، تاکہ وہ پلے اور بڑھے ، پھل پھول لائے، اور اس سے آپ کو بھی اور دوسروں کو بھی فائدہ پہنچے۔

اللہ تعالیٰ نے بھی ان کو معمول چھوڑنے نہیں دیا:

پہلے بھی کئی مرتبہ یہ قصہ گزر چکا ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اپنے ایک عزیز اور رشتہ دار حضرت مسطح بن اثاثہ رضی اللہ عنہ جو ان کی خالہ زاد بہن کے بیٹے تھے اور غریب تھے، مہاجر تھے اور نیک آدمی تھے، اصحابِ بدر میں سے تھے ان-کی مدد کرتے تھے اور یہ سلسلہ انہوں نے جاری رکھا تھا۔ ایک موقعہ ایسا آیا کہ منافقین کی طرف سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر تہمت لگائی گئی، تو یہ بھی منافقین کے جھانسے میں آ گئے، اور آزمائش میں پھنس گئے، ان کی زبان سے بھی وہی چیزیں نکل گئیں۔ بعد میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی براءت نازل ہوئی، معاملہ صاف اور واضح ہو گیا کہ ان پر جو تہمت لگائی گئی تھی وہ غلط تھی۔ تو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بلاوجہ نہیں، بلکہ اس وجہ سے کہ انہوں نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے گھر والوں پر لگائی گئی تہمت والے معاملہ میں حصہ لیا تھا-یوں سوچا کہ میں ان کی جو مدد کیا کرتا تھا وہ نہیں کروں گا۔

بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ آدمی اپنے رشتہ داروں کے ساتھ بھلائی کا کوئی سلوک کرتا رہتا ہے، پھر کبھی موقع آتا ہے کہ اسی رشتہ دار نے کوئی نادانی کر لی، کوئی غلط کام کر لیا، تو اب یہ سوچتا ہے کہ اس نے ایسا کام کر لیا؟ اب اس کو نہیں دیں گے۔ اسی طرح حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ

نے بھی قسم کھالی کہ اب ان کو نہیں دوں گا اور وہ سلسلہ بند کر دیا، اس پر باری تعالیٰ نے مستقل آیت نازل فرمائی: ﴿وَلَا يَأْتَلِ أُولُوا الْفَضْلِ مِنكُمْ وَالسَّعَةِ أَن يُؤْتُوا أُولِي الْقُرْبَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا أَلَا تُحِبُّونَ أَن يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ﴾ ایسی قسم کوئی کھاتا ہے کہ میں نیکی کا کام نہیں کروں گا؟ اللہ تعالیٰ نے تعلیم دی کہ ایسی قسمیں نہیں کھانی چاہئیں۔ بھائی! نیکی کے یہی کام تو تمہاری نجات کا ذریعہ ہیں۔ کون سا نیکی کا کام اللہ تعالیٰ کو پسند آجائے، اور کل قیامت میں ہماری نجات کا ذریعہ بن جائے؛ یہ ہمیں معلوم نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی چھوٹے سے چھوٹا کام ہی ہماری نجات اور ہمارے گناہوں کو بخشوانے کا ذریعہ بن جائے، اسی کو باری تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿أَلَا تُحِبُّونَ أَن يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ﴾ کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے گناہوں کو معاف کرے؟ فوراً حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اپنی بات سے رجوع کر لیا۔

بتلانا یہ ہے کہ ہر نیکی کے کام کے لیے یہی طرز ہے، حالاں کہ وہ کام کوئی فرض اور واجب نہیں تھا، لیکن شریعت یہ کہتی ہے کہ آپ نے اپنے آپ کو جب ایک بھلائی کے اوپر ڈالا ہے، تو سیدھی سادی بات یہ ہے کہ اب اس راستہ سے اپنے آپ کو ہٹانے کی ضرورت نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کو یہ بات پسند نہیں ہے۔

اس سے نقصان پہنچتا ہے:

کسی کے ساتھ آپ نے دوستی کی، اس کے پاس آتے جاتے ہیں، اُٹھتے بیٹھتے ہیں، ایک زمانہ تک یہ سلسلہ چلتا رہا، اور پھر ایک دم سے جانا بند کر دیا؛ تو صحیح نہیں ہے۔ ارے بھائی! پہلے سے دوستی ہی نہ کرتے تو کوئی بات نہیں تھی، لیکن جب دوستی کی اور تعلقات بڑھائے، پھر اچانک سے کٹ کر دئے؛ تو یہ کوئی اچھی بات ہے؟ یہ ناپسندیدہ ہے، اور اس سے نقصان پہنچتا ہے۔

معمولات کا ایک ادب یہ بھی ہے:

تو نیکی اور بھلائی کے جتنے بھی کام ہیں وہ سب اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق پیدا کرنے اور رشتہ استوار کرنے کا ذریعہ ہیں، اور ایسے تمام کاموں سے متعلق یہ ایک ادب ہے کہ کوئی بھی معمول ہو، اس کو بلاوجہ نہ چھوڑیئے، مثلاً: روزانہ قرآنِ پاک کے ایک پارہ کی تلاوت کا آپ نے معمول بنایا، تو اب بلاوجہ اس کو نہ چھوڑیئے۔ یا آپ کسی کلمہ کی تسبیح پڑھتے ہیں، تو اب پڑھتے رہیے، یا کوئی نیکی کا کام کرتے ہیں، تو کرتے رہیے۔ چوں کہ علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ آداب سکھلا رہے ہیں تو نیکی کے معمولات کا ایک ادب یہ بھی ہے کہ آپ اس کی محافظت اور پابندی کیجئے، اگرچہ کوئی فرض اور واجب نہیں ہے لیکن آپ نے بھلائی کا ایک سلسلہ شروع کیا ہے تو اس کو جاری رکھیے، نیکی اور

بھلائی کا کوئی بھی سلسلہ ایسا نہیں ہے کہ اس کو شروع کرنے کے بعد چھوڑ دیا جائے بلکہ اس کو ترقی دینی چاہیے۔

اس آیت کے ساتھ ایک ظلم ہوا:

چناں چہ پہلی آیت پیش کی ہے:﴿إِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ﴾ اس آیت کے ساتھ ایک ظلم یہ ہوا کہ لوگ اس کو علامہ اقبال کے ایک شعر کے ساتھ جوڑ کر۔جو انہوں نے اپنی جگہ کہا ہے۔اس آیت کا مطلب بھی وہی بیان کرتے ہیں ، حالاں کہ وہ مطلب بیان کرنا بالکل غلط ہے۔اس آیت کی تفسیر اپنی جگہ پر ہے۔وہ شعر یہ ہے :-

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
جسے نہ ہو خیال خود اپنی حالت کے بدلنے کا

پھر اس کے ساتھ یہ آیت بھی اٹیچڈ (Atteched) کر دیتے ہیں جو بالکل غلط ہے۔اس آیت کا مطلب الگ ہے، آپ قرآنِ پاک کی کسی بھی تفسیر کو اُٹھا کر دیکھ لیجئے اس میں وہ مطلب نہیں ملے گا۔

اس آیت کا صحیح مطلب:

اس آیت کا مطلب تو یہ ہے کہ کوئی قوم وخاندان، کوئی جماعت و کمیونٹی نے نیکی کا راستہ اپنے لیے چن لیا اور اس راہ پر وہ چل رہی ہے، اور اس نیکی کے راستہ پر چلنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے بھی اس پر اپنی نعمتوں کا سلسلہ جاری کر دیا ہے۔ اس لیے کہ ظاہر ہے کہ کوئی خاندان کسی نیکی کا سلسلہ شروع کر دے، مثلاً: نمازوں کا اہتمام، زکوٰۃ کی ادائیگی کا اہتمام، غریبوں کی مدد، مسکینوں اور بیواؤں کے حال پر توجہ، لوگوں کے ساتھ سخاوت وغیرہ، اور بھی نیکی کے جتنے سلسلے ہیں، ان کو اگر کوئی خاندان اپنا لے، ان پر عمل شروع کر دے؛ تو ظاہر ہے کہ اس کی برکتیں بھی تو ظاہر ہوں گی۔ نیکی کے ان کاموں کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی ان کے ساتھ اسی جیسا معاملہ کیا جائے گا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی برکتوں کے سلسلے شروع ہوں گے، اسی کو اس آیت میں بتلایا گیا ہے: ﴿إِنَّ اللهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ﴾ کسی قوم کے نیک راہ پر چلنے کی وجہ سے، بھلائی کے راستہ پر لگنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنے انعامات کا جو سلسلہ شروع کیا ہے، اس کو اللہ تعالیٰ کبھی ختم نہیں کریں گے جب تک کہ وہ قوم خود اپنا راستہ نہ بدل دے، اور نیکی کا وہ راستہ نہ چھوڑ دے۔ جیسے نیکی کے کاموں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس قوم کو تندرستی دے رکھی ہے، عزت ودولت بھی دے رکھی ہے، تو اللہ تعالیٰ

اپنی یہ نعمتیں اس وقت تک نہیں چھینیں گے جب تک کہ نیکی کا اختیار کردہ راستہ وہ خود نہ بدلے گی، لیکن جہاں اس نے اپنا راستہ بدل دیا تو اب وہ نعمتیں بھی باقی نہیں رہتیں۔

نعمتوں کے سلسلے اس وقت تک بند نہیں ہوتے:

عام طور پر ہوتا ایسا ہی ہے کہ کسی خاندان اور قوم کے بڑوں نے، اسلاف اور (વડીલો) نے کوئی نیک سلسلہ شروع کیا جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی خاص نعمتیں بھی اس خاندان کو شاملِ حال ہوتی ہیں ،اور وہ خاندان ترقی پر آتا ہے،وہ جماعت و کمیونٹی ایک طرح کی ترقی پر آتی ہے، لیکن اس خاندان و قوم کی اور اس جماعت و کمیونٹی کی بعد میں آنے والی نسل کو یہ پتہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی یہ نعمتیں ہمارے بڑوں کی کن نیکیوں اور اچھے کاموں کی وجہ سے ملی ہیں ،وہ اچھے کام جو ان کے بڑے کرتے تھے اور وہ سلسلہ جو اس خاندان میں جاری تھا، جیسے: نمازوں کا اہتمام، زکوٰۃ کی ادائیگی کا اہتمام ،نیکی کے کاموں کا اہتمام ،غریبوں کے ساتھ بھلائی؛ یہ سارے سلسلے جاری تھے، انہیں کی وجہ سے یہ نعمتیں بھی اللہ تعالیٰ نے جاری کر رکھی تھیں۔ تو باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ: ہم نے نعمتوں کے یہ سلسلے جو ان کے ساتھ جاری کئے ہیں وہ ہم بند نہیں کریں گے ﴿لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ﴾ اللہ تعالیٰ کسی قوم کو جو نعمتیں دیتا ہے وہ ان سے ہٹاتا نہیں ہے، واپس لیتا نہیں ہے۔ کب تک؟ ﴿حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنفُسِهِمْ﴾ یہاں تک کہ وہ خود اپنی حالت کو نہیں بدلتے۔ ان کی نیکی والی حالت بدل گئی ،تو پھر نعمتوں والی حالت بھی بدل جائے گی۔ اللہ تعالیٰ نے نیکی کی

وجہ سے عزت دی تھی، اب دوسری پیڑھی (نسل) آئی اور نیکی و بھلائی کے راستہ پر قائم نہیں رہی، انہوں نے دیکھا کہ دولت کی ریل پیل ہے، تو یہ نہیں سوچا کہ یہ ریل پیل اللہ تعالیٰ نے کیوں دی تھی (وہ تو بڑوں کی نیکی کی وجہ سے دی تھی) اب دولت کی ریل پیل میں آکر وہ گناہوں میں مبتلا ہوگئے، نیکی کا راستہ چھوڑدیا، بھلائی کے وہ کام جوان کے بڑوں کی طرف سے کئے جاتے تھے اور ایک سلسلہ جاری تھا وہ سلسلہ باقی نہیں رہا، تو پھر دھیرے دھیرے نعمتیں بھی ان سے چھنتی جائے گی اور ایک دن آئے گا کہ وہ سب ختم ہوجائے گا۔ اس آیت کا صحیح مطلب یہی ہے۔

اس آیت سے ثابت ہوا کہ کسی آدمی نے کسی نیکی کا راستہ اختیار کیا ہو تو اس کو چھوڑنا نہیں چاہیے، چوں کہ نیکی کے راستہ کو اختیار کرنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی نعمتوں کا سلسلہ شروع ہوا ہے، اگر نیکی کا راستہ چھوڑدوگے تو نعمتوں کا سلسلہ بھی ختم ہوجائے گا۔ باقی اس کا وہ جو مطلب لیتے ہیں کہ ”خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی“ وہ بالکل صحیح نہیں ہے، اس آیت کی صحیح تفسیر تو وہی ہے جو ابھی میں نے آپ کے سامنے بیان کی۔

حضرت مولانا سعید احمد خانصاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک سوال:

ایک بات لطیفہ کے طور پر سناتا ہوں، ہمارے اکابر میں حضرت مولانا سعید احمد خانصاحب رحمۃ اللہ علیہ تھے جن کا قیام ایک طویل مدت تک مدینہ منورہ میں رہا اور حضرت وہاں جانے والے حجاج

کے ساتھ بڑی شفقتیں فرمایا کرتے تھے ، جنہوں نے ان کی وہ شفقتیں دیکھی ہیں وہ جانتے ہیں۔ میرا جب بھی جانا ہوتا تھا تو حضرت کے پاس جاکر بیٹھا کرتا تھا، حضرت ہماری دعوت بھی کیا کرتے تھے۔ حضرت مولانا کی عادت یہ تھی کہ کوئی مولوی اور عالم ملاقات کے لیے آتے تو کچھ سوالات بھی فرماتے تھے ان سوالات میں ایک سوال اس آیت کی تفسیر کے متعلق بھی فرماتے تھے﴿إِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّى يُغَيِّرُوْا مَا بِأَنْفُسِهِمْ﴾ مولوی صاحب! اس آیت کا کیا مطلب ہے؟ عام طور پر مولوی صاحبان وہی "خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی" والی بات چلا دیتے تھے، حالاں کہ اس آیت کی وہ تفسیر صحیح نہیں ہے۔ وہ ایک الگ بات ہے جو کہی گئی ہے ، اور اس آیت کا مطلب تو یہی ہے جو میں نے ابھی بیان کیا۔ آپ کسی بھی تفسیر کی کتاب کو اُٹھا کر دیکھ لیجئے، اس میں یہی وضاحت ملے گی، اور اسی مطلب کی بنیاد پر امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت کو اس عنوان کے تحت ذکر کیا ہے۔

تم اس پگلی بوڑھیا کی طرح نہ بنو:

دوسری آیت پیش کی ہے:﴿وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّتِيْ نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ أَنْكَاثًا﴾ اے لوگو! تم اس پگلی بڑھیا کی طرح نہ بنو، جو محنت سے سوت کاتتی، پھر اس کو ٹکڑے ٹکرے کر ڈالتی۔

مکہ مکرمہ کے اندر ایک مجنونہ عورت تھی، اس کی عادت یہ تھی کہ دن بھر سوت کاتتی تھی، اور دن پورا ہونے پر اپنا کاتا ہوا سوت توڑ پھوڑ کر ختم کر دیتی تھی، پھر دوسرے دن پھر سے سوت

کاتتی تھی۔ گویا دن بھر جو محنت کرتی وہ ضائع کردیتی۔ اسی کو باری تعالیٰ نے مثال کے طور پر پیش فرماکر ایک نصیحت کی کہ: تم اپنے اعمال کے معاملہ میں ایسامت کرنا کہ نیکی کے کام کرو اور پھر کوئی ایسی حرکت کر بیٹھو کہ تمہارے وہ سارے کام ضائع وبرباد ہوجائیں۔

معمولات چھوڑنے سے دل میں سختی پیدا ہوتی ہے:

﴿وَلَا يَكُونُوا كَالَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِن قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْأَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوبُهُمْ﴾ یہ ایک آیت کا ٹکڑا ہے، اس سے پہلے یہ ہے ﴿أَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِينَ آمَنُوا أَن تَخْشَعَ قُلُوبُهُمْ لِذِكْرِ اللَّهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ﴾ ایمان والوں کے لیے کیا وہ وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ تعالیٰ کی یاد کی طرف جھکیں؟ اور اللہ تعالیٰ نے جو احکام اتارے ہیں ان کی اطاعت وادائیگی کے لیے اوران پر عمل کرنے کے لیے متوجہ ہوں ؟ اور ایمان والوں کو چاہیے کہ ان لوگوں کی طرح نہ بنیں جن کو ان سے پہلے کتاب دی گئی۔ یعنی امتِ محمدیہ سے پہلے جو اہلِ کتاب (یہود و نصاریٰ) آئے جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے احکام کو چھوڑدیا اور ایک زمانہ تک نافرمانیوں میں مبتلا رہے، توبہ کی توفیق نصیب نہیں ہوئی اور نافرمانیوں کا زمانہ ان پر طویل ہوگیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے دل سخت ہوگئے۔

اس سے معلوم ہوا کہ آدمی اگر طویل زمانہ تک نیکیوں کا سلسلہ چھوڑے رہتا ہے تو اس کی وجہ سے دل میں سختی آجاتی ہے، پھر اس نیکی کا دوبارہ شروع کرنا بھاری اور مشکل ہوجاتا ہے۔

رہبانیت کیسے شروع ہوئی:

﴿وَجَعَلْنَا فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّرَحْمَةً وَّرَهْبَانِيَّةَ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ إِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا﴾ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ماننے والوں کے متعلق باری تعالیٰ نے فرمایا کہ ان کے دلوں میں ہم نے شفقت اور رحمت کا مادہ بھر دیا، اور رہبانیت (یعنی دنیا کو چھوڑ چھاڑ کر اللہ کی عبادت میں مشغولی) والا طریقہ ان لوگوں نے اختیار کیا (باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ) وہ طریقہ ہم نے ان پر لازم نہیں کیا تھا۔ ''رُہبان ''کا اصلی ترجمہ تو ''اللہ کا ڈر اور خوف '' ہے۔

بنی اسرائیل کے اندر ہوا یہ تھا کہ جب ایسے بادشاہ آئے جو دنیا کے اندر ایسے منہمک ہوئے جس کے نتیجہ میں انہوں نے اللہ تبارک وتعالیٰ کے احکامات کو توڑنا شروع کیا، تو دین دار طبقہ جو اللہ تعالیٰ کے احکام پر چلنے والا تھا انہوں نے ان کو ان غلط حرکتوں سے باز رکھنے کی کوشش کی، لیکن چوں کہ ان کے پاس حکومت کی طاقت تھی، حکومت و پیسے کی طاقت ہی کی وجہ سے وہ نافرمانی میں مبتلا ہوئے تھے، تو انہوں نے ان روکنے والوں کو قتل کر دیا۔ پھر دوسرا طبقہ آیا، انہوں نے دیکھا کہ اگر ہم ان کو روکنے جائیں گے تو یہ ہمیں بھی قتل کر دیں گے۔ گویا انہوں نے اپنے اندر ان کو روکنے کی طاقت نہیں پائی اور ان کو یہ بھی ڈر لگا کہ اگر ہم ان کے ساتھ رہیں گے تو ہم بھی ایسے ہی بن جائیں گے، تو اپنے دین کی حفاظت کی نیت سے انہوں لوگوں سے علاحدگی اختیار کر لی اور جنگلوں میں اور ایسے علاقوں میں چلے گئے جہاں زیادہ لوگ نہ بستے ہوں تا کہ

وہاں رہ کر اللہ تعالیٰ کے احکام پر چلنا ان کے لیے آسان ہو جائے اور سنسان علاقوں میں بند مکان بنا کر عبادتوں میں مشغول ہو گئے اور لوگوں سے میل جول بالکل ختم کر لیا۔ یہی رہبانیت والا طریقہ کہلایا۔ اللہ تعالیٰ کے ڈر سے یہ طریقہ اختیار کیا کہ اس طرح آدمی اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے احکام پر باقی اور قائم رکھ سکے۔

اسلام میں رہبانیت نہیں ہے:

ویسے شریعتِ محمدیہ میں رہبانیت نہیں ہے، بلکہ اصل تو یہ ہے کہ آدمی لوگوں میں مل جل کر رہے اور اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل کرے، لیکن اگر کسی آدمی کے لیے اپنے دین کو بچانا سوائے اس کے ممکن ہی نہ ہو کہ لوگوں سے علاحدگی اختیار کر لے، تو جیسا کہ حدیث کی کتابوں میں ہے اور بخاری شریف میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس پر مستقل باب قائم کیا ہے: "إِنَّ مِنَ الدِّيْنِ اَلْفِرَارُ مِنَ الْفِتَنِ" فتنوں سے اپنے آپ کو بچانے کے لیے لوگوں سے دوری اختیار کر سکتے ہیں۔ اس لیے کہ ایک زمانہ آئے گا کہ فتنے ایسے عام ہو جائیں گے کہ لوگوں کے درمیان میں رہتے ہوئے آدمی کے لیے اپنے دین کی حفاظت مشکل ہو جائے گی، اس وقت بعض لوگ ایسے ہوں گے جو بکریاں وغیرہ مویشی لے کر پہاڑ کی ایسی چوٹیوں پر چلے جائیں گے کہ جہاں گھاس پانی ملتا ہو گا، وہاں بکریاں چَراتے رہیں گے اور اپنے دین کی حفاظت کریں گے۔

دینداروں کے لیے بھی یہی وقت آزمائش کا ہوتا ہے:

بہر حال! ان لوگوں نے بھی رہبانیت والا طریقہ اختیار کر لیا۔ باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے ان کو ایسا طریقہ اختیار کرنے کے لیے کہا نہیں تھا، بلکہ انہوں نے اپنے طور پر اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لیے اور دین پر قائم رہنے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا تھا۔ جب اس نیت سے یہ طریقہ اختیار کیا تھا تو پھر چاہیے تھا کہ اس کا اہتمام کرتے رہتے اور اس کو نہ چھوڑتے، لیکن جب ان کی توجہ الی اللہ، دینداری، تقویٰ و پرہیز گاری، ان کی نیکوکاری کو دیکھ کر لوگ ان کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور عام طور پر ایسا ہی ہوتا ہے کہ آدمی جب تقویٰ اختیار کرتا ہے تو پھر لوگوں کا رجحان و میلان بھی ادھر ہوتا ہے۔ تو پھر یہ لوگ اپنے دین پر اور جس احتیاط پر ان کو قائم رہنا چاہیے تھا اس پر قائم نہیں رہے اور دنیا کی طلب میں پڑ گئے۔ تو رہبانیت والا طریقہ اصل میں تو اپنے آپ کو بے دینی اور دنیا طلبی سے بچانے کے لیے شروع کیا تھا، لیکن اسی کے نتیجہ میں جب لوگوں کا اُدھر رجوع ہوا تو دنیا طلبی میں پڑ گئے۔

آج بھی جب آدمی دین کی محنت کرتا ہے اور دین کے لیے قربانیاں دیتا ہے، تو لوگ اس کی نیکی اور تقویٰ کی وجہ سے عقیدت مندی کے ساتھ اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں ، اور یہی اس کے لیے زیادہ آزمائش کا وقت ہوتا ہے، اگر لالچ میں آکر شریعت والے طریقہ کو چھوڑ کر دنیا طلبی میں پڑ جائے گا تو پھر ناس مار لے گا اور اپنا نقصان ہی نقصان کر لے گا۔ اسی کو باری تعالیٰ

فرماتے ہیں :﴿فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا﴾ جو طریقہ اختیار کیا تھا اس کی پوری حفاظت اور رعایت نہیں کر سکے۔یعنی اللہ تعالیٰ نے تو واجب نہیں کیا تھا لیکن جب انہوں نے اس طریقہ کو اپنے دین کی حفاظت کے لیے شروع کیا تھا تو پھر چاہیے تھا کہ اس کی پابندی کرتے، لیکن انہوں نے پابندی نہیں کی۔

اس آیت میں ان کی جو مذمت اور برائی کی گئی ہے ،وہ ان کے اس طریقہ کو اختیار کرنے پر نہیں کی گئی ہے، بلکہ اس راہ کو اختیار کرنے کے بعد چھوڑ دینے پر کی گئی ہے۔اس سے معلوم ہوا کہ ہر وہ عمل جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے واجب نہیں کیا گیا، لیکن کوئی آدمی اپنے طور پر نیکی اور بھلائی کا کام سمجھ کر اس کو شروع کر رہا ہے تو پھر اس کو چاہیے کہ اس کو نہ چھوڑے، بلکہ اس کی پوری پابندی کرے؛یہی شریعت کی نگاہوں میں مطلوب ہے۔ اس آیت کو یہاں لا کر یہی بتلایا چاہتے ہیں۔

اے عبد اللہ! فلاں جیسے مت بنیو:

حدیث ۶۹۲:-

وعن عبد الله بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما قَالَ قَالَ لی رسول الله (صلی اللہ علیہ وسلم) : يَا عَبْدَ الله، لَا تَكُنْ مِثْلَ فُلَانٍ كَانَ يَقُومُ اللَّيْلَ فَتَرَكَ قِيَامَ اللَّيْلِ.

ترجمہ:-حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حضورِ اکرم (ﷺ) نے (کسی کی طرف اشارہ فرما کر) مجھ سے فرمایا: اے عبداللہ! فلاں جیسے مت بنو کہ وہ راتوں کو اُٹھا کرتا تھا (تہجد پڑھتا تھا) پھر اس نے رات کو اُٹھنا چھوڑ دیا۔

افادات:-دیکھئے! تہجد پڑھنا فرض اور واجب نہیں ہے، لیکن جب کسی نے یہ عمل شروع کیا تو شریعت یہ چاہتی ہے کہ اس کو چھوڑا نہ جائے، اب تو ہر حال میں اس کو باقی رکھنا ہی چاہیے۔

آج کل ہمارے طبقہ میں یہ مزاج عام ہو گیا ہے کہ جوش میں آکر ایک دو مہینہ تک کچھ معمولات:-تہجد، اوابین یا چاشت شروع کرتے ہیں، اور یہ صرف عبادتوں کے ساتھ ہی خاص نہیں ہے، بلکہ نیکی کا کوئی بھی کام ہو، جیسے: کسی کے ساتھ بھلائی کرنے کا سلسلہ شروع کیا؛ پھر اس کو چھوڑ دیتے ہیں۔ گویا ہماری طبیعتوں میں تلوّن مزاجی ہے یعنی ہماری طبیعت ایک طرح کی نہیں ہے بلکہ رنگ بدلتی رہتی ہے۔ اگر نیک بن گئے تو جنید بغدادی کو بھی شکست دینے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ پھر برائی پر آتے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیطان کو بھی ہرا دیں گے۔ بھائی! ایسا نہیں ہونا چاہیے، بلکہ کوئی بھی طریقہ ہو، اس میں اعتدال ومیانہ روی سے چلئے۔ شریعت یہ چاہتی ہے کہ آپ اعتدال کو اختیار کریں، جیسا کہ پہلے بھی آچکا کہ نیکی کے جس کام پر مداومت کی جائے وہی اللہ تعالیٰ کو زیادہ پسند ہے، چاہے وہ چھوٹا سا ہی کیوں نہ ہو۔

پانی کا صرف ایک قطرہ اگرایک زمانہ تک برابر ٹپکتا رہتا ہے تو پتھر کے اندر بھی سوراخ کر دیتا ہے، لیکن اگر پانی کا ایک ٹینک بھی ایک ساتھ بہاڈالو، تو اس سے کچھ فرق پڑنے والا نہیں ہے۔

مداومت کا نتیجہ:

انگلینڈ میں ہمارے ایک ملنے والے دوست ہیں ، انہوں نے ایک مولوی صاحب کا مقولہ میرے سامنے نقل کیا۔پاکستان کے ایک مولانا صاحب آئے ہوئے تھے،انہوں نے ایک پتھریلی زمین میں جہاں صرف پتھر ہی ہوتے ہیں ،اس میں کسی جگہ کچھ سبزہ نکلا ہوا دیکھ کر مجھ سے بہت اچھی بات کہی کہ: دیکھو! پتھر بھی جب ایک جگہ پڑا رہا اور اس نے جگہ نہیں بدلی اور اس کے آس پاس تھوڑی سی مٹی تھی تو اس پر بھی سبزہ نکل آیا۔لیکن اگر کسی جگہ مٹی ہی مٹی ہو اور اس کی بار بار کھدائی کرتے رہو،الٹ پلٹ کرتے رہو؛ تو کبھی اس میں گھاس کا ایک تنکا بھی اُگنے والا نہیں ہے۔حالاں کہ پتھر کی خاصیت یہ ہے اس میں کچھ بھی نہیں اُگتا ،لیکن وہ بھی جب ایک جگہ پڑا رہا تو اس میں نمو اور اُگانے کی کچھ صلاحیت آگئی ،اور مٹی میں نمو کی خاصیت ہے لیکن اس میں جب الٹ پلٹ ہوتی رہی تو اس میں کچھ بھی نہیں اُگتا۔ معلوم ہوا کہ درحقیقت کسی بھی عمل کو اثر انداز ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اس پر مداومت ہو۔

ساری خرابی یہیں سے آتی ہے:

ہمارا مزاج تو ایسا ہے کہ ہم دو روز تہجد پڑھتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ تیسرے دن جبرئیل آنے ہی چاہئیں ، تب کچھ بات بنے گی۔ نہیں بھائی! ایسا نہیں ہونا چاہیے، بلکہ کرتے رہو، کرتے رہو، اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس نیکی کے کام کی توفیق دی ہے، یہی بہت بڑی بات ہے ، اب آپ اور کیا چاہتے ہیں؟ دوسرا کوئی بدلہ چاہو ہی مت۔ دراصل ساری خرابی یہیں سے آتی ہے کہ ہم دوسرے بدلے چاہنے لگتے ہیں۔ ارے بھائی! یوں سوچو کہ ہم اپنی زبان سے ”اللہ“ کا جو نام لے رہے ہیں ؛ یہی اتنی بڑی نعمت ہے کہ اس کا مقابلہ اور کوئی چیز نہیں کر سکتی، اگر اس پر جنت نہ بھی ملے تب بھی ”اللہ“ کا نام لینا خود جنت سے بڑی نعمت ہے؟ پھر اس پر ہی کیوں خوش نہ ہوؤں ؟ دوسرا کوئی بدلہ کیوں چاہوں ؟

ہم لوگ ذکر اسی لیے چھوڑ دیتے ہیں کہ ہم اپنے جی میں ایسا سوچتے ہیں کہ جب ہم نے ذکر شروع کیا تو پھر ہمارے کاروبار میں برکت کیوں نہیں ہوتی؟ ہماری آمدنی (આવક) بڑھ کیوں نہیں گئی؟ ابھی تک تین ہزار کا نفع ہوتا تھا، اب چار ہزار کا نفع کیوں نہیں ہو رہا ہے؟ میں کئی سال سے چلّہ دے رہا ہوں، برابر نماز پڑھ رہا ہوں ، اب تو تہجد، اشراق وچاشت بھی شروع کر دی ہے، پابندی سے درس میں حاضری دیتا ہوں ، اتنا سب کر رہا ہوں ، لیکن کوئی ”Response“ نہیں مل رہا ہے۔ گویا یہ سب کر کے کیا ہم اللہ تعالیٰ پر احسان کر رہے ہیں ؟ ارے بھائی! اللہ تعالیٰ نے

اس سب کی توفیق دی اور ہم نے اپنی زبان سے اس کا نام لیا؛یہی بہت بڑی اور اصل نعمت ہے، اب اس کے بدلہ میں اور کیا مانگتے ہو !

ذکر میں دل نہیں لگتا، پریشان کیوں ہوتے ہو؟:

سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک آدمی آیا اور کہا: حضرت !میں ذکر کرتا ہوں لیکن اس میں جی نہیں لگتا؟ حضرت نے فرمایا: بھائی ! اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو کہ اس نے ایک عضو یعنی زبان کو اپنی یاد میں لگایا ہے۔ در حقیقت یہ بھی بہت بڑی نعمت ہے۔اس لیے کہ ایسا بھی ہو سکتا تھا کہ یہی زبان اللہ کا نام لینے کے بجائے گالیاں بکتی، یا اور کوئی گناہ کا کام کرتی، اللہ تعالیٰ نے اس کو گناہ سے بچا کر اپنی یاد میں لگایا؛یہی کتنی بڑی نعمت ہے۔اب اس پر اس کا شکر ادا کرو، تو قاعدہ ہے﴿لَئِن شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ﴾ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ اگر تم شکر ادا کرو گے تو میں نعمتوں میں اضافہ کروں گا، اس لیے اگر اس پر شکر کرو گے تو پھر آگے چل کر دل بھی لگے گا۔پریشان کیوں ہوتے ہو کہ دل نہیں لگتا، زبان سے ذکر کرنے پر بھی ثواب تو ملتا ہے۔

خلاصۂ باب:

اگر آپ نماز پابندی سے پڑھتے ہیں ،تو بس! پڑھتے رہیے، یہ نہ سوچیے کہ میں پابندی سے نماز پڑھتا ہوں ،پھر بھی مجھے بخار کیوں آیا؟ اللہ تعالیٰ نے آپ کو پانچ وقت کی نماز پابندی سے

پڑھنے کی توفیق عطا فرمائی یہ اس کی بہت بڑی نعمت ہے۔ کسی کو کروڑ ہا کروڑ روپے مل جائیں اور وہ نماز سے محروم ہے، اس کے مقابلہ میں آپ جو پنج وقتہ نماز پڑھتے ہیں؛ یہ اتنی بڑی نعمت ہے کہ اس کے کروڑ ہا کروڑ روپے اس کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔ اگر آپ کا ایمان یہ ہے تو پھر آپ دوسرے کسی چکّر میں کیوں پڑتے ہیں؟ اس لیے اس کا اہتمام کرتے رہیں۔

یہ ساری باتیں ہیں، ان کو ذہن میں بٹھالیجیے، اور دوسرے کسی چکّر میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ توفیق عطا فرمائے۔

استحباب طيب الكلام وطلاقة الوَجه عند اللقاء

خوش کلامی اور ملاقات کے وقت چہرے کو مسکراتا ہوا رکھنے کا پسندیدہ ہونا

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

قال اللہ تعالیٰ:﴿وَاخۡفِضۡ جَنَاحَكَ لِلۡمُؤۡمِنِيۡنَ﴾ (الحجر:۸۸)

وقال تعالیٰ:﴿وَلَوۡ كُنۡتَ فَظًّا غَلِيۡظَ الۡقَلۡبِ لَانۡفَضُّوۡا مِنۡ حَوۡلِكَ﴾ (آل عمران:۱۵۹)

ہر کس و ناکس کو مسخر کرنے والا نسخہ:

آداب کا بیان چل رہا ہے، اسی سلسلہ میں ایک عنوان قائم کیا ہے: خوش کلامی اور ملاقات کے وقت چہرے کو مسکراتا ہوا رکھنے کے پسندیدہ ہونے کا بیان۔

یہ بھی ایک ادب ہے کہ آدمی جب کسی کے ساتھ ملاقات کرے، اس وقت اپنا چہرہ ہنستا ہوا رکھے، اور جب بات کرے تو اچھے طریقہ سے بات کرے۔ بھائی! اس میں توجیب میں سے کچھ پیسے بھی خرچ نہیں ہوتے ہیں۔ یہ ایسا عجیب وغریب نسخہ اور عمل ہے جو ہر کس و ناکس، دشمنوں اور دوستوں، اپنوں اور پرایوں کو مسخر کرنے والا ہے جو لوگ اس قسم کا مزاج رکھتے ہیں ان سے لوگ بھی متاثر ہوتے ہیں۔ اور آج کل تو تجارت میں یہ بہت ہی بنیادی اصول سمجھا جاتا ہے کہ لوگوں کا بڑی خوش دلی کے ساتھ چہرہ ہنستا رکھتے ہوئے استقبال کیا جائے، بلکہ اب تو یہ ایک مستقل فن ہو چکا ہے جس کی تربیت دی جاتی ہے، لوگ اس طرز کو سیکھ کر سلیس مین شپ (Sales Man Ship) کرتے ہیں اور اسی پر سروس اور ملازمتیں ملتی ہیں۔ حالاں کہ

شریعت نے ہمیں یہ تعلیم دی ہے کہ جب بھی آپ کسی سے ملیں تو ملاقات کے وقت دو چیزوں کا خیال رکھئے، ایک یہ کہ بات چیت اچھے انداز سے کیجئے، جس کو خوش کلامی کہا جاتا ہے، اور دوسرا یہ کہ چہرہ ہنستا ہوا رکھئے۔ اور کمال تو یہ ہے کہ اس کو نیکی کا کام قرار دیا، گویا آپ اس عمل کو کریں گے تو اللہ تعالیٰ بھی خوش ہو گا اور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سنت بھی ادا ہو گی۔

یہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا طریقہ ہے:

حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا طریقہ تو یہ تھا کہ ایسے لوگ جو واقعۃً اپنے غلط رویے اور اپنی بد عملی کی وجہ سے لوگوں کے ساتھ اچھی طرح سے پیش نہیں آتے تھے، اور ان کا معاملہ ٹھیک نہیں ہوتا تھا، جس کی وجہ سے وہ اس قابل نہیں ہوتے تھے کہ ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے؛ اس کے باوجود بھی نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں جب ایسے لوگ حاضر ہوتے تو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) ان سے بھی نرم گفتگو فرماتے اور ہنس کر بات فرماتے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا طریقہ یہی تھا۔

مدارات؛ جس کو دل جوئی کرنا کہتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی کے ساتھ خوش خُلقی سے اور ظاہری طور پر اچھے انداز سے پیش آنا۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے بخاری شریف میں ایک عنوان قائم کیا ہے: "بَابُ الْمُدَارَاةِ مَعَ النَّاسِ" اس میں حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کا مقولہ نقل کیا ہے کہ: بہت سے لوگوں کے سامنے ہم مسکراتے ہیں، حالاں کہ ہمارے دل ان پر لعنت کر رہے ہوتے

ہیں ({ २३२८ [illegible] })یعنی ان کے اعمال کی وجہ سے دل ان سے خوش نہیں ہوتے، لیکن اس کے باوجود جب ہم ان سے ملتے ہیں تو ہم ان کے ساتھ ہنستے ہوئے چہرہ سے ملاقات کرتے ہیں۔

اسلام نے جو آداب سکھائے ہیں ان میں سے یہ بھی ہے: "إِدْخَالُ السُّرُوْرِ" کسی کے دل میں مسرت داخل کرنا۔ کوئی بھی ہو، جب آپ اس سے ہنس کر ملاقات کریں گے، اور نرم طریقہ سے اچھی بات کریں گے، تو اس کا دل خوش ہو گا، یہ بھی بہت بڑی نیکی کا کام ہے۔ یہ ایک ایسا ادب اور شریعت کی ایسی تعلیم ہے کہ آج ہم اس کی طرف سے بہت غفلت اور بے پرواہی سے کام لیتے ہیں۔

آدمی کے لئے بڑی بری چیز ہے:

ایک مرتبہ ایک صاحب نے نبی کریم (ﷺ) کی خدمت میں حاضر ہونے کے لئے آپ کے گھر کے باہر سے اجازت مانگی کہ میں اندر آسکتا ہوں۔ نبی کریم (ﷺ) نے جب ان کی آواز سنی تو ان کو پہچان لیا اور فرمایا: "بِئْسَ ابْنُ الْعَشِيرَةِ" یہ آدمی اپنے قبیلہ کا بڑا برا آدمی ہے، اس کے بعد ان کو آنے کی اجازت دی۔ جب وہ آکر بیٹھے تو حضورِ اکرم (ﷺ) نے ان کے ساتھ بہت ہی نرمی سے گفتگو کی۔ جب وہ صاحب چلے گئے تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضورِ اکرم (ﷺ) سے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ نے ان کے متعلق تو یہ فرمایا تھا، لیکن جب وہ آپ کے پاس آئے تو آپ نے ان کے ساتھ بڑے نرم انداز میں گفتگو فرمائی؟ آپ (ﷺ) نے فرمایا: اے

عائشہ! آدمی کے لئے یہ بات بڑی بری ہے کہ اس کی بد خلقی کی وجہ سے لوگ اسے چھوڑ دیں (بخاری شریف:باب الْمُدَارَاۃِ مَعَ النَّاسِ) مطلب یہ ہے کہ میں نے اس کے متعلق جو کہا تھا کہ یہ اپنے قبیلہ کا بڑا برا آدمی ہے،وہ ان حالات کی وجہ سے کہا تھاجو اس میں تھے ،لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ میں بھی اس کے ساتھ برائی سے ہی پیش آؤں ؟مجھے تو اپنے اخلاق کو باقی رکھنا ہیں۔

میں اپنے اخلاق کیوں خراب کروں !:

قاضی یحییٰ بن اکثم رحمۃ اللہ علیہ بڑے قاضی گزرے ہیں ، ایک مرتبہ ان کو ہارون الرشید کے یہاں رات گزارنے کا موقع ملا۔ہارون الرشید اپنے وقت کا بہت بڑا بادشاہ تھا۔پہلے بھی کسی موقع پر میں بتلا چکا ہوں کہ ان کی سلطنت اور حکومت اتنی بڑی تھی کہ ایک مرتبہ ایک بادل جارہا تھاجس کو خطاب کرتے ہوئے ہارون الرشید نے کہا تھا: اے بادل!تو کہیں بھی جاکر برس، تیرے پانی سے جو غلہ پیدا ہوگا، اس کا خراج میرے ہی خزانہ میں آنے والا ہے۔خیر! قاضی یحییٰ بن اکثم رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ رات میں بادشاہ سلامت کو پانی کی ضرورت پیش آئی تو کسی خادم کو آواز دی کہ ذرا پانی پلاؤ۔تو وہ نیند میں سے اُٹھا اور کہنے لگا: دن میں بھی چین نہیں ،رات میں بھی چین نہیں لینے دیتے،اوراس طرح بڑبڑاتے ہوئے پانی لاکر دیا،اپنے وقت کے اتنے بڑے بادشاہ کواس طرح کہہ رہاتھا، وہ تو اس کی گردن کٹوا سکتا تھا،لیکن اس نے کچھ نہیں کہا۔ قاضی یحییٰ بن اَکثم رحمۃ اللہ علیہ نے ان سے کہا: امیر المؤمنین!ایک زرخرید غلام (یعنی کوئی نوکر نہیں

تھا بلکہ غلام تھا جس کو آقا اپنی ملکیت میں رکھتا ہے) نے آپ کے ساتھ ایسا معاملہ کیا اور آپ نے اس کو کچھ بھی تنبیہ نہیں کی؟ اس پر کوئی ایکشن بھی نہیں لیا؟ تو ہارون الرشید نے کہا: بھائی! وہ بد خُلقی سے پیش آیا تو اس کی وجہ سے میں اپنے اخلاق کیوں خراب کروں؟ جیسے: کتے کی عادت کاٹنے کی ہے، تو اگر وہ آپ کو کاٹ لے؛ تو کیا آپ بھی اس کو کاٹ لیں گے؟ نہیں نا! سیدھی سی بات ہے۔ اس لئے حقیقت تو یہ ہے کہ کسی کی بد خلقی کی وجہ سے ہمیں اپنے اخلاق خراب کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ شریعت ہمیں یہی تعلیم دیتی ہے، اور سمجھ لیجئے کہ شریعت کی تعلیم کا خلاصہ یہی ہے۔

اندازہ لگایئے کہ کتنا اچھا ادب سکھایا ہے! آج اسی تعلیم کو اگر ہم اپنا لیں تو ہمارے سماج و معاشرہ کے بہت سارے مسئلے حل ہوسکتے ہیں، لیکن ہمارا حال تو یہ ہے کہ ذرا ذرا سی بات پر دوسروں سے بد گمان ہو جاتے ہیں اور اسی بدگمانی کی بنیاد پر بد خلقی کرتے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بہت ساری خرابیاں پیدا ہوتی ہیں، تعلقات میں کشیدگیاں آتی ہیں اور پھر بہت سارے لڑائی جھگڑے پیدا ہوتے ہیں۔ اگر شریعت کی اس تعلیم پر ہم عمل کرلیں تو معاملہ بہت ہی آسان ہو جائے۔

یہ ہمارا مزاج ہے:

پھر اپنے گھر کے لوگوں کے ساتھ تو اور زیادہ اس کا اہتمام کرنے کی ضرورت ہے۔ آج کل معاملہ الٹ گیا ہے، آدمی پرایوں کے ساتھ تو بہت ہنس بول کر باتیں کرتا ہے، لیکن جب گھر میں جاتا ہے تو اس کا موڈ ہی چینج (Change) ہو جاتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہ آدمی ہے ہی نہیں۔ چہرہ بھی بڑا بھیانک بنا کر جاتا ہے، گھر والے بھی اس کو دیکھ کر سہم جاتے ہیں کہ پتہ نہیں آج کیا بلا اور اُفتاد ہم پر آنے والی ہے، وہ بھی "یَارَبِّ سَلِّمْ سَلِّمْ" کا وظیفہ پڑھتے ہیں۔ ہمارا مزاج ایسا ہے، حالاں کہ آدمی کے اخلاق تو گھر والوں کے ساتھ ہی معلوم ہوتے ہیں۔ اگر کوئی پرایا آدمی آگیا اور اس کے ساتھ آپ نے ہنس بول کر باتیں کرلیں؛ تو یہ اخلاق نہیں ہیں۔ اخلاق تو یہ ہیں کہ ۲۴ر گھنٹے جن کو آپ سے واسطہ پڑتا ہے، وہ آپ کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں؟ آپ کے متعلق ان کا (Opinion) کیا ہے؟

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے ایک عورت کے متعلق آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے عرض کیا کہ: وہ نماز بھی خوب پڑھتی ہے، روزے بھی خوب رکھتی ہے، اور بڑی عبادت گزار ہے۔ حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے پوچھا: اس کا معاملہ پڑوسیوں کے ساتھ کیسا ہے؟ عرض کیا: ٹھیک نہیں ہے؛ تو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: وہ جہنمی ہے۔ دوسری عورت کے متعلق عرض کیا: وہ فرض نماز تو پڑھ لیتی ہے، لیکن

نوافل کا اہتمام نہیں کرتی۔ پوچھا: پڑوسیوں کے ساتھ معاملہ کیسا ہے؟ کہا: بہت اچھا ہے؛ تو آپ (ﷺ) نے فرمایا: وہ جنتی ہے۔ (مسند احمد۔ حدیث نمبر: ۹۶۷۳)

وہ اخلاق کس کام کے!:

حضرت مولانا مفتی محمد تقی صاحب عثمانی دامت برکاتہم فرماتے ہیں کہ آدمی کے اخلاق کا ساری دنیا میں خوب چرچہ ہو، اور اس کے گھر والے ہی اس سے خوش نہ ہوں؛ تو وہ اخلاق کس کام کے! جیسے: آپ کی سخاوت سے پوری دنیا فیض اُٹھا رہی ہو، اور گھر والے ہی بھوکے مرتے ہوں؛ تو ایسے آدمی کو کوئی سخی کہے گا؟ آپ کے اخلاق کی ساری دنیا تعریف کرتی ہو، اور گھر والوں کو شکایت ہو کہ وہ تو گھر میں آکر کبھی ہمارے ساتھ ہنس کر بات ہی نہیں کرتے۔ عام طور پر بیویوں کو شوہروں سے یہی شکایت رہتی ہے کہ ابھی باہر تو خوب ہنس بول رہے تھے، اور گھر میں جب آئے تو ان کا چہرہ ہی بدل گیا، گھر میں آکر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بالکل ہی بدل گئے۔ یہ مناسب طریقہ نہیں ہے۔ اگر کسی چیز پر تنبیہ کی تھی وہ اپنی جگہ پر ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اب ۲۴ر گھنٹے آپ منہ بسورے ہوئے، لیجیو دیجیو، اپنے آپ کو لئے دئے رہتے ہیں، ایسا نہیں ہونا چاہیے، بلکہ آدمی ہنس بول کر رہے۔ حدیثِ پاک میں تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ آدمی گھر والوں کے ساتھ کس طرح رہے، ان کے ساتھ بالکل بے تکلّف رہے، ان کے اوپر بوجھ بن کر نہ رہے کہ آپ جب گھر میں جائیں تو وہ یہی دعا کرتے رہیں کہ یہ مصیبت

یہاں سے کب ٹلے ،بلکہ گھر کے اندرایسے بن کر رہیے کہ وہ یہ چاہیں کہ یہ گھر میں سے نہ جائیں؛ تب کوئی بات ہے۔

بہرحال!بوقتِ ملاقات لوگوں سے ہنستے ہوئے ملنااوراچھے طریقہ سے بات کرنامستحب ہے، یہ شریعت کی نگاہوں میں پسندیدہ اور کارِ ثواب ہے، اور یہ نیکی ہم مفت میں حاصل کرسکتے ہیں ،اس کے لئے پیسے خرچ کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے، اور بہت ہی آسان بھی ہے۔

اپنے بازوؤں کو جھکائے رکھنا:

باری تعالیٰ کاارشاد نقل کیا:﴿وَاخۡفِضۡ جَنَاحَكَ لِلۡمُؤۡمِنِيۡنَ﴾ نبیٔ کریم(ﷺ)کو تاکید کی گئی: ﴿لَا تَمُدَّنَّ عَيۡنَيۡكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعۡنَا بِهٖۤ أَزۡوَاجًا مِّنۡهُمۡ وَلَا تَحۡزَنۡ عَلَيۡهِمۡ﴾ دنیا کے مختلف گروہوں (کفاراور مشرکین،یہودونصاریٰ)کو دنیا کی نعمتیں ہم نے برتنے کے لئے دی ہیں ، ان کے پاس دولت کتنے دنوں تک رہے گی؟جب تک دنیا میں ہیں وہاں تک ہے،پھر ان کے ہاتھ سے چھین لی جائے گی،اورپھران کے ساتھ جو معاملہ ہونے والاہے وہ ہوکر رہے گا ، اس لیےان کی طرف آپ اپنی آنکھیں بھی نہ اُٹھائیے۔اوراپنےلوگوں کےساتھ کیاکرناہے؟﴿وَاخۡفِضۡ جَنَاحَكَ لِلۡمُؤۡمِنِيۡنَ﴾ ایمان والوں کے سامنے اپنے بازوؤں کو جھکائے رکھیے۔

دیکھو! صحابۂ کرام رضی اللہ عنھم کے متعلق قرآنِ پاک میں کہا گیا ہے : ﴿أَشِدَّآءُ عَلَى ٱلْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ﴾ آپس میں رحمدل اور کفار کے معاملہ میں سخت تھے۔ آدمی کے دل میں ایمان جتنا زیادہ سرایت کرتا جاتا ہے، اتنا ہی یہ وصف آدمی کے اندر پیدا ہوتا جاتا ہے۔ معلوم ہوا کہ اپنوں کے ساتھ شفقت کا معاملہ ہونا چاہیے۔

اگر آپ بدخُلق اور سخت دل ہوتے :

باری تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿وَلَوْ كُنتَ فَظًّا غَلِيظَ ٱلْقَلْبِ لَٱنفَضُّوا۟ مِنْ حَوْلِكَ﴾ دیکھو! باری تعالیٰ حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) سے خطاب کرکے یہ فرمارہے ہیں کہ اگر آپ بدخلق اور سخت دل ہوتے؛ تو یہ لوگ (یعنی صحابۂ کرام) آپ کے پاس سے بکھر جاتے۔ حالاں کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنھم کو حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ جو محبت تھی وہ سب جانتے ہیں، اس کے باوجود باری تعالیٰ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کو فرماتے ہیں کہ: اے ہمارے رسول! اگر آپ ایسے ہوتے تو یہ آپ کے پاس سے کب سے بکھر جاتے، کوئی آپ کے پاس نہ ٹھہرتا۔

اس سے معلوم ہوا کہ اچھے اخلاق اور اچھا سلوک، لوگوں سے ہنس کر ملنا، اچھی طرح سے باتیں کرنا اور اچھے طریقہ سے پیش آنا؛ یہ لوگوں کو آدمی سے قریب کرتا ہے، اگر یہ طریقہ اپنایا جائے گا تو غیر بھی آپ سے قریب ہوجائیں گے، اور اگر اس کے برخلاف معاملہ کیا جائے گا تو اپنے بھی دور ہوجائیں گے۔ اس لئے شریعت نے ہمیں اس ادب کی تعلیم دی ہے۔

کم از کم اسی کی عادت ڈال لی جائے:

حدیث ۶۹۳:-

عن عدی بن أبي حاتم رضی اللہ عنہ قال: قال رسول اللہ (ﷺ): اتَّقُوا النَّارَ وَلَوْ بِشِقِّ تَمْرَةٍ، فَمَنْ لَمْ يَجِدْ فَبِكَلِمَةٍ طَيِّبَةٍ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت عدی بن اَبي حاتم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچاؤ؛ چاہے کھجور کے آدھے حصہ کے ذریعہ سے ہی ہو۔ اگر کسی کے پاس صدقہ کرنے کے لئے آدھی کھجور بھی نہیں ہے؛ تو اچھی بات کسی کو کہہ کر ہی سہی۔

افادات:- یعنی اگر آپ کے پاس کھجور کا آدھا دانہ ہے اور اس کا آپ نے صدقہ کردیا تو اس سے اللہ تعالیٰ کی جو خوشنودی حاصل کی جائے گی، وہ بھی آپ کو جہنم کے عذاب سے بچانے کا ذریعہ بنے گی۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی کے ساتھ اچھی طریقہ سے بات کرنا بھی اللہ تعالیٰ کی ایسی خوشنودی اور رضامندی عطا کرتا ہے کہ اس کے نتیجہ میں آدمی جہنم سے بچ جاتا ہے۔ کتنا آسان نسخہ ہے! دوسرے اعمال کے مقابلہ میں یہ بہت آسان عمل ہے، اگر کوئی آدمی کم از کم اسی کی عادت ڈال لے، تو دن بھر میں جتنے آدمیوں سے ہنس کر ملے گا اور اچھی طرح بات کرے گا، اتنی ہی نیکیاں اس کے نامۂ اعمال میں بڑھتی جائیں گی۔

اس پر بھی صدقہ کا ثواب:

حدیث ۶۹۴:-

وعن أبي هريرة رضی اللہ عنہ **أن النبي (ﷺ) قَالَ: وَالكَلِمَةُ الطَّيِّبَةُ صَدَقَةٌ**

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نبی کریم (ﷺ) کا ارشاد نقل فرماتے ہیں: اچھی بات بھی صدقہ ہے۔

افادات:- یعنی صدقہ کرنے سے جس طرح ثواب ملتا ہے، اسی طرح اگر آپ لوگوں سے اچھی طرح بات کریں گے، اس پر بھی اتنا ہی ثواب ملے گا۔ بھائی! صدقہ میں آپ نے پیسے خرچ کرکے ظاہری بھلائی کا معاملہ کیا، اور اس میں آپ نے اپنے اخلاق کے ذریعہ معنوی طور پر بھلائی کا معاملہ کیا، تو جو ثواب اس میں ملتا ہے، وہی ثواب اس میں بھی ملے گا۔ اس لئے اگر کسی کے پاس روپیہ پیسے نہیں ہیں کہ وہ خرچ کرکے صدقہ کا ثواب حاصل کرسکتا ہو، تو بھلی باتیں کہہ کر اور لوگوں سے اچھے طریقہ سے پیش آکر بھی صدقہ کا ثواب حاصل کرسکتا ہے۔

ہنستے چہرے سے ملاقات بھی نیکی ہے:

حدیث ۶۹۵:-

وعن أبي ذَرٍّ رضی اللہ عنہ **قَالَ قَالَ لي رسول الله (ﷺ): لاَتَحْقِرَنَّ مِنَ الْمَعْرُوفِ شَيْئاً، وَلَوْ أنْ تَلْقَى أخَاكَ بِوَجْهٍ طَلْقٍ.**

ترجمہ:- حضرت اَبوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھ سے نبیؐ کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: کسی بھی نیکی کے کام کو معمولی مت سمجھو، چاہے تم اپنے بھائی سے ہنستا ہوا چہرہ رکھ کر ملاقات کرو۔

افادات:- اس روایت میں ایک تعلیم تو یہ ہے کہ نیکی کا کام چاہے کتنا ہی چھوٹا کیوں ہو، اس کو معمولی نہ سمجھو۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک آدمی گنہگار ہے، برائیوں میں پھنسا ہوا ہے، نیکی کے کام نہیں کرتا، پھر کبھی اس کو چھوٹی سی نیکی کا کام کرنے کا موقع مل گیا، تو شیطان اس کے دل میں یہ وسوسہ ڈالتا ہے کہ تیری تو ساری زندگی گناہوں میں گزر رہی ہے، تو نماز تو پڑھتا نہیں، روزے تو رکھتا نہیں، دوسرے فرائض بھی ادا نہیں کرتا؛ اب یہ چھوٹی سی نیکی کرنے سے تجھے کیا فائدہ ملے گا؟ حضور (ﷺ) فرماتے ہیں کہ ایسا مت سوچو، کسی بھی نیکی کے کام کو حقیر نہ سمجھو۔ اس لئے کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی چھوٹا سا نیکی کا کام خلوصِ دل سے کرتا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں ایسا مقبول ہوجاتا ہے اور اس کام سے اللہ تعالیٰ ایسا خوش ہوجاتا ہے کہ اس کے نتیجہ میں پھر نیکی کے بڑے بڑے کام کرنے کی بھی توفیق دی جاتی ہے۔ وہاں تو شاہی معاملہ ہے، کبھی چھوٹی سی بات پر خوش ہوجائیں تو بخش دیں۔ اس لئے کسی بھی نیکی کے کام کو حقیر نہیں سمجھنا چاہیے، اور اسی طرح کسی بھی گناہ کو چھوٹا سمجھ کر کرنا بھی نہیں چاہیے۔

دوسری تعلیم یہ ہے کہ تم اپنے بھائی سے ہنستا ہوا چہرہ رکھ کر ملاقات کرو،یہ بھی ایک نیکی ہے،اس کی اپنے اندر عادت ڈالو، اس کو معمولی مت سمجھو،اگر اسی کا اہتمام کروگے؛ تو اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ دوسری نیکیوں کی توفیق دے گا۔

خلاصہ یہ ہے کہ ہنستے ہوئے چہرہ کے ساتھ ملاقات کرنا ،چاہے اندرونی طور پر حالات اور معاملات جو کچھ بھی ہوں ، لیکن کسی کے ساتھ جب ملاقات کرو تو اس طرح سے ملو کہ اس کی طبیعت پر کوئی کدورت نہ آئے۔ایسا نہ ہو کہ ہر وقت اپنا منہ ایسا رکھتے ہیں جیساکہ (اَرنڈی کا تیل) دِیوِیل(laa')پیا ہواہو۔نہیں بھائی !اپنا چہرہ ہمیشہ ہنستا ہوا رکھنا بھی ایک ادب ونیکی ہے۔

استحباب بیان الکلام وإیضاحه للمخاطب وتکریره لیفهم إذا لم یفهم

بات کو مخاطب کے سامنے صاف اور واضح انداز میں کرنا اور اگر بغیر تکرار کے نہ سمجھتا ہو؛ تو مکرر کرنا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

گفتگو کے آداب:

ایک اور عنوان قائم کیا ہے کہ: جو آپ کا مخاطب ہے یعنی جس سے آپ گفتگو کررہے ہیں اس کے سامنے آپ کا اپنی بات کو ایسے انداز سے واضح طور پر کرنا کہ وہ آپ کی بات سمجھ جائے۔ اوراگر آپ کا خیال یہ ہو کہ ایک مرتبہ کہنے سے آپ کی بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی ہے تو دوسری مرتبہ کہہ دیجئے، اوردوسری مرتبہ سے بھی وہ نہیں سمجھا تو تیسری مرتبہ کہئے۔ آپ کی طرف سے کوشش یہ ہو کہ اس کو سمجھانے کا اہتمام کریں ، خاص کرکہ جب استاذ پڑھاتاہے اور شاگرد کی طرف سے مطالبہ ہوتواس میں اس چیز کا خصوصی اہتمام کرنا چاہیے۔ دین کی کوئی بات آپ کسی کو بتلا رہے ہیں اور اسے سمجھ میں نہیں آئی تو دوبارہ بتلایئے، تیسری مرتبہ بھی سمجھایئے، جب تک کہ اس کی سمجھ میں نہ آئے آپ اس کو سمجھانے کی کوشش کیجئے۔ اوراگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میرے دو یا تین مرتبہ بولنے سے وہ سمجھ جائے گا تو پھر آپ کی طرف سے اس میں کوئی کمی نہیں ہونی چاہیے۔ نبی کریم ﷺ اس چیز کا اہتمام فرماتے تھے۔

کلام کا ایک ادب:

حدیث ٦٩٦:-

عن أنسٍ رضی اللہ عنہ أَنَّ النَّبِيَّ (ﷺ) كَانَ إِذَا تَكَلَّمَ بِكَلِمَةٍ أَعَادَهَا ثَلَاثاً حَتَّى تُفْهَمَ عَنْهُ، وَإِذَا أَتَى عَلَى قَوْمٍ فَسَلَّمَ عَلَيْهِمْ سَلَّمَ عَلَيْهِمْ ثَلَاثاً.

ترجمہ:- حضرت اَنس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ جب نبیِ کریم (ﷺ) کوئی بات ارشاد فرماتے تھے تو تین مرتبہ اس کو دوہراتے تھے تاکہ لوگ سمجھ جائیں۔اور جب سلام فرماتے تھے تو وہ بھی تین مرتبہ فرماتے تھے۔

افادات:- کبھی ایسا ہوتا ہے کہ پہلی مرتبہ بولنے میں سب تک آواز نہیں پہنچتی،اس لئے دوسری مرتبہ بولنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔یا کوئی جملہ کسی کے کانوں میں پورا نہیں پہنچ پایا، بولنے والا تو پورا بولا لیکن سامنے والے کے کانوں تک آواز نہیں پہنچی اس لئے دوسری مرتبہ بولنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔تو اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کو سمجھانے کے لئے اور ان کے کانوں تک پوری بات پہنچانے کے لئے دوسری مرتبہ کہنا پڑے گا؛تو پھر دوسری مرتبہ بولئے۔یا کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آپ مخاطب کے انداز اور اس کے چہرے سے یہ سمجھ جاتے ہیں کہ اس نے پوری بات سنی نہیں ہے اور آپ کو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ دوبارہ بولوں گا تو وہ سمجھ جائے گا؛تو پھر آپ کو اعادہ کرنا چاہیے۔حضور (ﷺ) کا یہی معمول تھا۔اسی طرح جب کوئی اہم بات ہوتی تھی تب بھی آپ (ﷺ) لوگوں تک پہنچانے کے لئے تین مرتبہ ارشاد فرماتے تھے۔

مطلب یہ ہے کہ اگر آپ کا خیال یہ ہے کہ دوسری یا تیسری مرتبہ بولنے سے سامنے والے تک آواز پہنچ جائے گی اور وہ سمجھ جائے گا تو پھر آپ کو اس کا اہتمام کرنا چاہیے۔ایسے موقع پر یہ نہ سوچئے کہ دوبارہ کون بولتا ہے ،خواہ مخواہ زحمت اٹھانی پڑے گی۔

اورآپ (صلی اللہ علیہ وسلم) جب سلام فرماتے تھے تب بھی تین مرتبہ فرماتے تھے۔اس کی تشریح علماء نے یہ لکھی ہے کہ کبھی بڑا مجمع ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ میں آواز سب تک نہیں پہنچتی تو تین مرتبہ سلام فرماتے کہ پہلے سامنے سلام کیا، پھر دائیں کیا، پھر بائیں کیا، تاکہ تمام لوگوں تک آواز پہنچ جائے۔

آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا کلام بھی ایسا ہی ہوتا تھا:

حدیث ۷۶۹:-

وعن عائشة رضی اللہ عنہا **قالت: كَانَ كَلَامُ رسول الله (صلی اللہ علیہ وسلم) كَلَاماً فَصْلاً، يَفْهَمُهُ كُلُّ مَنْ يَسْمَعُهُ.** (رواه أبو داود.)

ترجمہ:- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی گفتگو بالکل واضح اور الگ الگ ہوتی تھی، ہر سننے والا اس کو سمجھ جاتا تھا۔

افادات:- یعنی آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) اتنا جلدی نہیں بولتے تھے کہ ایک کلمہ دوسرے میں اس طرح جڑ جائے کہ سننے والے کو سمجھنے میں دشواری پیش آئے، جیسے بعض لوگ جلدی جلدی بولتے

ہیں تو اس میں ایسا ہوتا ہے کہ ایک کلمہ دوسرے میں مل جانے کی وجہ سے سننے والوں کو سمجھ میں نہیں آتا، بلکہ آپ (ﷺ) اس طرح گفتگو فرماتے کہ ہر حرف آپ کی زبانِ مبارک سے اچھی طرح سے ادا ہوتا تھا۔ یہ بھی بولنے کے آداب میں سے ہے۔ متکبر لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ بات پوری نہیں بولتے ، ایک آدھ بات ادھوری چھوڑ دیتے ہیں۔ حضورِ اکرم (ﷺ) کی عادتِ شریفہ ایسی نہیں تھی، آپ اطمینان سے ہر کلمہ اور ہر لفظ الگ الگ کرکے ارشاد فرمایا کرتے تھے تاکہ ہر سننے والا اس کو سمجھ جائے۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ مضمون ہی دقیق اور باریک ہوتا ہے، بولنے والا الفاظ تو پورے بولتا ہے اور بات بھی پوری پہنچ جاتی ہے، لیکن سامنے والے کی عقل اس کو حل نہیں کرپاتی؛ وہ ایک الگ چیز ہے۔ اور ایک یہ ہوتا ہے کہ بات پورے طور پر کانوں تک نہ پہنچنے کی وجہ سے آدمی وہ بات سمجھ نہیں سکتا، یہاں اسی کو بتلانا مقصود ہے کہ آپ اس طرح بولو کہ بات ہر ایک تک پورے طور پر پہنچ جائے تاکہ کسی کو دشواری نہ ہو۔ یہ بھی زندگی گزارنے کے آداب میں سے ایک ادب ہے۔

باب إصغاء الجليس لحديث جليسه الذى ليس بحرام وإستنصات العالم والواعظ حاضرى مجلسه

اپنے ہم نشین کی بات کی طرف دھیان دینا اور عالم وواعظ کا حاضرین کو اپنی بات سنانے کے لئے خاموش کرنا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مجلس کے آداب:

ایک اور عنوان قائم کیاہے کہ ایک ہم نشین کااپنے دوسرے ہم نشین کی ایسی بات کی طرف کان دھرنا اور دھیان سے سنناجوبری نہیں ہے؛یہ بھی آداب میں سے ہے۔یعنی کوئی آدمی جب کوئی بات کہتاہے توآپ اس بات کودھیان سے سنیں۔

نبیِ کریم (ﷺ) کی مجلس کا جوحال حدیث ِ پاک میں بیان کیا جاتا ہےوہ شمائل میں موجود ہے کہ آپ کی مجلس میں جب کوئی آدمی بات کرتا تھا توسب لوگ خاموشی سے اس کوسنتے تھے اوردھیان دیتے تھے،ایسا نہیں ہوتاتھاکہ سب ہی بول رہے ہیں۔اس لیےایک آدمی جب اپنی بات سے فارغ ہوجائے ،پھردوسرا بولے۔ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ ایک کا کلام چل رہاہے، اسی درمیان میں دوسرااورتیسرا بھی بولناشروع کردے کہ اب کوئی بھی کسی کی بات صحیح طریقہ سے سن ہی نہیں پارہاہے۔

پھریہ بھی ہے کہ ہم نشین اورایک ہی مجلس میں پاس بیٹھنے والا آپ سے کوئی بات کرتا ہے تواس کی بات کی طرف دھیان دینااورغورسے سننا؛یہ بھی اس کاحق ہے۔ہاں ! اگروہ کوئی نامناسب اور غلط بات کررہاہے جو کرنی نہیں چاہیے، جیسے :کسی کی غیبت کررہاہے اور کوئی غلط

بات کررہا ہے؛تو پھر اس کو سننے کی ضرورت نہیں ہے،اس کی طرف سے آپ دھیان ہٹالیجئے۔ لیکن اگر وہ بات غلط نہیں ہے اور شرعاً کوئی ناجائز بھی نہیں ہے ،تو پھر آپ کواس کی بات کی طرف توجہ کرنی چاہیے۔

اور عالم وواعظ کا مجلس کے حاضرین کو خاموش کرنا،جیسا کہ کبھی ہوتا ہے کہ مجلس میں شورو شغب اُٹھ رہاہے،تواگر کوئی کہے کہ بھائی!چپ رہو، اور دھیان سے سنو۔تو اپنی بات سنوانے کے لیے خاموشی کا مطالبہ کرنااور چپ ہونے کے لیے کہنا؛یہ بھی جائز ہے،بلکہ یہ مجلس کے آداب میں سے ہے۔

لوگوں کو خاموش کردو:

حدیث ۶۹۸:-

عن جریر بن عبدِاللهِ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ لی رسول الله (ﷺ) فی حَجَّةِ الْوَدَاعِ: اسْتَنْصِتِ النَّاسَ. ثُمَّ قَالَ: لَا تَرْجِعُوا بَعْدِی کُفَّاراً یَضْرِبُ بَعْضُکُمْ رِقَابَ بَعْضٍ. (متفقٌ علَیْهِ)

ترجمہ:- حضرت جریر بن عبداللہ بجلی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حجۃ الوداع کے موقع پر نبی کریم (ﷺ) نے مجھ سے ارشاد فرمایا کہ: لوگوں کو خاموش کردو(ان کو خاموش رہنے کی تاکید کرو۔جب لوگ خاموش ہوگئے اور نبی کریم (ﷺ) کی طرف متوجہ ہوگئے اس کے بعد حضور (ﷺ) کو جو خطبہ دیناتھا وہ شروع فرمایا)اس میں ایک بات یہ بھی ارشاد فرمائی اور صحابۂ کرام کو تاکید فرمائی کہ میرے دنیاسے جانے

کے بعد کافروں جیسے مت بن جائیو کہ کافر آپس میں ایک دوسرے کی گردنیں مارتے ہیں ،ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوتے ہیں ،تم لوگ آپس میں ایسا معاملہ مت کرنا۔

افادات:- نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کچھ نصیحت اور وعظ فرمانا چاہتے تھے، اور لوگ اپنی اپنی باتوں میں مشغول تھے،اگر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) اسی حالت میں بولنا شروع فرما دیتے،تو بہت سی مرتبہ ایسی حالت میں پتہ بھی نہیں چلتا کہ کوئی بات کہی جارہی ہے،اس لیے بولنے والے کو بھی چاہیے کہ پہلے ان کو خاموش کرے،پھر جو کچھ کہنا ہو وہ کہے۔ دیکھو! حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بھی اس بات کا اہتمام فرمایا کہ حضرت جریر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ لوگوں سے کہو کہ خاموش ہو جائیں۔ چناں چہ حضرت جریر رضی اللہ عنہ نے اعلان کیا۔

جیسا کہ مائک میں کہا جاتا ہے کہ بھائیو! خاموش ہو جاؤ اور دھیان دو اور سنو،پھر بات کہی جاتی ہے۔ یہاں اس روایت کو لا کر یہی بتانا چاہتے ہیں کہ یہ طریقہ ثابت ہے،اور اسی طرح ہونا بھی چاہیے۔

باب الوعظ والاقتصاد فيه

وعظ و نصیحت میں میانہ روی

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شریعت کی ایک اہم تعلیم:

نیا عنوان قائم کیا ہے: وعظ کہنا، نصیحت کرنا اور اس میں میانہ روی سے کام لینا۔

یہ بھی شریعت کی ایک اہم تعلیم ہے۔ دیکھو! کوئی کام کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو، لیکن اس میں بھی شریعت یہ کہتی ہے کہ اعتدال سے کام لو۔ بڑے سے بڑا صاحبِ علم اور بڑے سے بڑا شیریں کلام اور نصیحت کی اچھی اچھی باتیں کہنے والا بھی اگر بار بار کہتا رہے گا تو لوگ تنگ آجائیں گے، اُکتا جائیں گے، اُوب جائیں گے، اکتاہٹ پیدا ہو جائے گی۔ اس لیے نصیحت کے معاملہ میں کوئی ایسا انداز اختیار کرنا کہ لوگ دین کی باتوں سے اُکتاہٹ محسوس کرنے لگیں؛ شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی۔ جیسے: اگر بریانی بھی روزانہ کھاتے رہیں گے تو کیا ہوگا؟ دو دن کے بعد طبیعت کہے گی کہ بس کرو، اب تو کچھ دال آجائے تو اچھا ہے۔

معلوم ہوا کہ کوئی چیز اپنی جگہ پر کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہو، لیکن ہر ایک چیز کے لیے موقع و محل ہوتا ہے۔ شریعت نے دین کی باتیں لوگوں تک پہنچانے اور وعظ و نصیحت اور تقریر کرنے کے معاملہ بھی یہی تاکید کی ہے کہ اس میں بھی آپ اتنا مبالغہ سے کام نہ لیں، اس کی اتنی کثرت نہ کریں کہ پھر لوگ آپ کو دیکھ کر ہی چھپنے لگیں۔ بعض لوگوں کا ایسا مزاج ہوتا ہے تو

پھر لوگ ان سے بھاگتے ہیں۔ اگر ان کو معلوم ہو جاتا ہے کہ آج فلاں مسجد میں فلاں صاحب گئے ہیں تو اس دن مسجد بدل ڈالیں گے، اس مسجد میں نماز پڑھنے جائیں گے ہی نہیں، ایسا اس لیے ہوا کہ اس نصیحت پر عمل نہیں کیا گیا، اس لیے اس بات کا بھی اہتمام ہونا چاہیے۔

باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿ادْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ﴾ اللہ تعالیٰ کے راستہ کی طرف لوگوں کو دانائی وحکمت کے ساتھ، بھلے طریقہ سے نصیحت کر کے اور سمجھا کر دعوت دیجیے۔ بھلے طریقہ سے جو نصیحت کی جاتی ہے اس کی بہت سی شکلیں ہیں، ان میں سے ایک شکل یہ بھی ہے کہ نصیحت کرنے کے معاملہ میں مبالغہ سے کام نہ لیا جائے، موقعہ بموقعہ، ہفتہ میں ایک یا دو مرتبہ ہو؛ بس۔ اس سے زیادہ نہیں، اور روزانہ تو بالکل بھی نہیں۔

حکمتِ تربیت یہی ہے:

حدیث ۶۹۹:-

وعن أَبي وائلٍ شقيقِ بن سَلَمَةَ، قَالَ: كَانَ ابنُ مَسْعُودٍ -رضی اللہ عنہ- يُذَكِّرُنَا في كُلِّ خَمِيسٍ، فَقَالَ لَهُ رَجُلٌ: يَا أَبَا عَبْدِ الرَّحمانِ! لَوَدِدْتُ أَنَّكَ ذَكَّرْتَنَا كُلَّ يَومٍ، فَقَالَ: أَمَا إنَّهُ يَمْنَعُنِي مِنْ ذَلِكَ أَنِّي أَكْرَهُ أَنْ أُمِلَّكُمْ، وَإنِّي أَتَخَوَّلُكُمْ بِالْمَوْعِظَةِ كَمَا كَانَ رسول الله (ﷺ) يَتَخَوَّلُنَا بِهَا مَخَافَةَ السَّآمَةِ عَلَيْنَا. (متفقٌ عَلَيْهِ)

((يَتَخَوَّلُنَا)): يَتَعَهَّدُنَا.

ترجمہ:- حضرت ابووائل شقیق بن سلمہ فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ (جو بڑے جلیل القدر صحابی ہیں، صحابہ میں ان کا علمی مقام بہت اونچا تھا) ہر جمعرات کو ہمیں نصیحت کرتے تھے۔ ایک آدمی نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے درخواست کی کہ: اے ابوعبدالرحمن! ہماری دلی خواہش اور تمنا یہ ہے کہ آپ روزانہ وعظ کہیں (معلوم ہوا کہ ایسا کہنے والے بھی ہوتے ہیں، اس کا مطلب یہ نہیں کہ ایک دو کے کہنے کی وجہ سے آپ یہ وطیرہ اختیار کرلیں) تو اس پر حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ بات اس چیز سے مجھے باز رکھتی ہے کہ میں تمہیں اکتاہٹ میں ڈال دوں (یعنی میں روزانہ نصیحت کرسکتا ہوں، لیکن اگر میں ایسا کروں گا تو میرا یہ عمل اور میرا یہ طریقہ وطرز تم لوگوں کو اکتاہٹ میں مبتلا کردے گا، پھر تم لوگ اکتا جاؤ گے) اس لیے میں موقع و محل اور وقت دیکھ کر تمہیں نصیحت کرتا ہوں (اور اس کی دلیل یہ بتلائی) جیسا کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) بھی موقع و محل دیکھ کر نصیحت فرماتے تھے، اس ڈر سے کہ کہیں ہم لوگ اکتاہٹ میں مبتلا نہ ہوجائیں۔

افادات:- "تَخَوُّل" کہتے ہیں کہ کسی کی تربیت اور نگرانی کے معاملہ میں سمجھ داری سے کام لینا۔ نصیحت وتقریر اور دین کی باتیں جو کہی جاتی ہیں اس کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کی دینی تربیت ہو۔

حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) سے بڑھ کر اچھی نصیحت کرنے والا اور کون ہو سکتا ہے؟ اور صحابہ سے بڑھ کر محبت اور توجہ سے سننے والے اور کون ہو سکتے تھے؟ اس کے باوجود حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) روزانہ نصیحت اس لیے نہیں فرماتے تھے کہ کہیں یہ لوگ اکتا نہ جائیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ بھی

تربیت کا ایک طریقہ ہے، اس چیز کا بھی اہتمام کرنا چاہیے۔ تربیت اور حکمتِ تربیت کے خلاف ہے کہ آدمی اس چیز کا اہتمام نہ کرے۔ اسی کا نتیجہ ہوتا ہے کہ جن لوگوں کی تربیت اور تعلیم مقصود ہوتی ہے جب وہ اکتاہٹ محسوس کرنے لگتے ہیں، پھر یا تو وہ اس کو چھوڑ جاتے ہیں، یا ساتھ رہتے ہیں تب بھی اس کی باتوں کا کوئی اثر قبول نہیں کرتے۔

فقاہت کی علامت:

حدیث ۷۰۰:-

وعن أبي اليقظان عمار بن ياسر رضی اللہ عنہما قَالَ: سَمِعْتُ رسول الله (ﷺ) يقول: إِنَّ طُوْلَ صَلاَةِ الرَّجُلِ، وَقِصَرَ خُطْبَتِهِ، مَئِنَّةٌ مِنْ فِقْهِهِ، فَأَطِيْلُوا الصَّلاَةَ وَأَقْصِرُوا الْخُطْبَةَ.

((مَئِنَّةٌ)) أيْ: عَلاَمَةٌ دَالَّةٌ عَلَى فِقْهِهِ. (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں نے نبیؐ کریم (ﷺ) کو فرماتے ہوئے سنا کہ: آدمی کی نماز کا لمبا ہونا اور خطبہ کا مختصر ہونا اس کی فقاہت اور سمجھ داری کی علامت اور نشانی ہے؛ اس لیے تم نماز کو لمبا کرو اور خطبہ کو مختصر کرو۔

افادات:- جیسے جمعہ کے دن نماز لمبی ہو اور خطبہ نماز کے مقابلہ میں مختصر اور (Short) ہونا چاہیے۔ آج کل معاملہ بالکل اُلٹ گیا ہے، خطبے لمبے لمبے ہوتے ہیں اور نمازیں مختصر ہوتی ہیں،

حالاں کہ نبی کریم (ﷺ) فرماتے ہیں کہ نماز کا لمبا ہونا اور خطبہ کا مختصر ہونا آدمی کی سمجھ داری کی علامت ہے۔

وعظِ مختصر، مگر پُر اثر:

حدیث ۱۰۷:-

وعن مُعاوِيَة بن الحكم السُّلَمى رضی اللہ عنہ قَالَ: بَيْنَا أَنَا أُصَلِّى مَعَ رسول الله (ﷺ) إِذْ عَطَسَ رَجُلٌ مِنَ الْقَوْمِ، فَقُلْتُ: يَرْحَمُكَ اللهُ، فَرَمَانِي الْقَوْمُ بِأَبْصَارِهِمْ. فَقُلْتُ: وَاثُكْلَ أُمِّيَاهُ، مَا شَأْنُكُمْ تَنْظُرُونَ إِلَيَّ؟ فَجَعَلُوا يَضْرِبُونَ بأيديهم عَلَى أَفْخَاذِهِمْ فَلَمَّا رَأَيْتُهُمْ يُصَمِّتُونَنِي لكِنِّي سَكَتُّ، فَلَمَّا صَلَّى رسول الله (ﷺ)، فَبِأَبِي هُوَ وَأُمِّي، مَا رَأَيْتُ مُعَلِّماً قَبْلَهُ وَلَا بَعْدَهُ أَحْسَنَ تَعْلِيماً مِنْهُ، فَوَاللهِ مَا كَهَرَنى، وَلَا ضَرَبَنِي، وَلَا شَتَمَنِي. قَالَ: إِنَّ هذِهِ الصَّلَاةَ لَا يَصْلُحُ فِيهَا شَيْءٌ مِنْ كَلَامِ النَّاسِ، إِنَّمَا هِيَ التَّسْبِيحُ وَالتَّكْبِيرُ وَقِرَاءَةُ الْقُرْآنِ، أَوْ كَمَا قَالَ رسول الله (ﷺ). قلتُ: يَا رسول الله! إِنِّي حَدِيثُ عَهْدٍ بِجَاهِلِيَّةٍ، وَقَدْ جَاءَ اللهُ بِالْإِسْلَامِ، وَإِنَّ مِنَّا رِجَالاً يَأْتُونَ الْكُهَّانَ قَالَ: فَلَا تَأْتِهِمْ. قُلْتُ: وَمِنَّا رِجَالٌ يَتَطَيَّرُونَ؟ قَالَ: ذَاكَ شَيْءٌ يَجِدُونَهُ فِى صُدُورِهِمْ فَلَا يَصُدَّنَّهُمْ.

(رواہ مسلم)

ترجمہ مع تشریح:- حضرت معاویہ بن حکم سُلَمی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں حضور (ﷺ) کے ساتھ جماعت سے نماز پڑھ رہا تھا (یہ نئے نئے اسلام لائے تھے) نماز کے دوران ہی ایک آدمی کو چھینک آئی (چھینکنے والے نے الحمدللہ نہیں کہا تھا، لیکن ان کو یہ معلوم تھا کہ چھینک کھانے والے کو جواب میں یرحمک اللہ کہنا چاہیے) تو میں نے نماز ہی میں یرحمک اللہ کہہ دیا (دراصل ان کو یہ پتہ ہی

نہیں تھا کہ نماز میں بولنے کی ممانعت ہے،اور صحابہ نماز میں ہونے کی وجہ سے کچھ کہہ نہیں سکتے تھے،اس لیے)لوگ میری طرف گھورنے لگے،تومیں بول پڑا کہ میری ماں مجھے روئے، تم لوگ مجھے گھور گھور کر کیوں دیکھ رہے ہو؟جب میں یہ بولا تو لوگ اپنی رانوں پر اپنے ہاتھ مارنے لگے۔یعنی اس طرح وہ ان کو یہ بتلانا چاہتے تھے کہ بھائی!تم خاموش رہو۔تو مَیں سمجھ گیا کہ یہ مجھے چپ کرانا چاہتے ہیں (" لٰکِنِّیْ سَکَتُّ" شرّاح فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ)مجھے جوش تو بہت آیا کہ ان کو کچھ کہوں لیکن پھر بھی مَیں خاموش رہا اور کچھ بولا نہیں (یہ پورا قصہ تو نماز کے دوران پیش آیا تھا اور جماعت سے نماز ہو رہی تھی۔آگے جو بات آرہی ہے اسی کی تعلیم دینا چاہتے ہیں) حضرت معاویہ بن حکم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نماز سے فارغ ہوئے،میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں ،مَیں نے کسی سکھانے والے کو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے اچھا سکھانے والا آپ سے پہلے یا آپ کے بعد نہیں دیکھا۔اللہ کی قسم!حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے نہ مجھے ڈانٹا،نہ مجھے مارا،نہ مجھے لتاڑا، بلکہ اپنے قریب بلا کر فرمایا: بھائی!یہ تو نماز ہے،اور نماز کے باہر جس طرح باتیں کرتے ہیں ، نماز کی حالت میں ایسی باتیں کرنے کی گنجائش نہیں ہے (بلکہ نماز میں خاموش رہنا چاہیے)نماز میں تو سبحان اللہ، اللہ اکبر کہا جاتا ہے، قرآنِ پاک کی تلاوت کی جاتی ہے(نماز میں ایسی باتیں نہیں ہوتی جو تم نے کیں۔انہوں نے حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نصیحت کرنے کا جو انداز دیکھا اور حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان کو جس محبت سے سمجھایا،اس سے ان کا حوصلہ بڑھا،اور انہوں نے موقع غنیمت سمجھ کر ایک بات پوچھ لی کہ حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی توجہ میری طرف منعطف ہے تو چلو!ایک بات پوچھ لوں)انہوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول!ہم تو اسلام سے دور تھے،اللہ تعالیٰ نے ہمیں اسلام عطا فرمایا، ہمارے یہاں کچھ لوگ ایسے ہیں جو کاہنوں کے پاس جاتے

ہیں۔ حضور (ﷺ) نے ان سے فرمایا: تم ان کے پاس مت جائیو(اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا۔اس پر انہوں نے یہ نہیں پوچھا کہ کیوں نہ جاؤں، بلکہ بس حضور(ﷺ) نے فرمادیا تو اب بات خلاص ہوگئی)پھرپوچھا:ہم میں بعض لوگ وہ ہیں جو بدشگونی لیتے ہیں۔تو حضور (ﷺ) نے فرمایا: وہ ایک کھٹکا سا ہے جو اس کی وجہ دل میں پیدا ہوجاتا ہے، لیکن پھر بھی اس کی وجہ سے اس کام کو چھوڑنہ دے (بلکہ اپنا کام پورا کرڈالے)

افادات:- ”نماز میں ایسی باتیں نہیں ہوتی جو تم نے کیں“ نصیحت کے طور پر آپ (ﷺ) نے بس اتنی ہی بات ارشاد فرمائی۔ کہنے کی بات اتنی ہی تھی،وہ کہہ دی، دوسرا کوئی ردِّعمل آپ (ﷺ) نے نہیں کیا۔اگر ہم اور آپ ہوتے تو پہلے زیادہ وقت تو مارپٹائی میں لیتے، اور کام کی جو چیز ہے اس میں تو ایک منٹ لگاتے۔لیکن حضور (ﷺ) اپنے عمل سے اس بات کی تعلیم دے رہے ہیں کہ جو اصل چیز ہے اس کی طرف دھیان دو،دوسری چیزیں چھوڑو۔جب کوئی آدمی ایسا کرے گا تو اس کا اثر سامنے والے پر زیادہ اچھا پڑے گا،ہم یوں سمجھتے ہیں کہ مارپٹائی میں زیادہ اثر پڑے گا۔ہاں ! اگر پہلے سے بتادیا ہے اور وہ آدمی ان باتوں سے واقف ہے، اس کے باوجود وہ قصداًایسا کرتا ہے،تو وہ الگ بات ہے۔

کاہن نہیں تو عامل!:

کاہن وہ لوگ ہوتے ہیں جو آئندہ پیش آنے والے معاملات کے متعلق خبر دینے کا دعویٰ کرتے ہیں، جن کو ”جوتشی“ کہا جاتا ہے۔ آج کل بھی بہت سے لوگوں کا مزاج ایسا بن گیا ہے۔ جو مسلمان ہیں وہ جوتشیوں کے پاس تو کم ہی جاتے ہوں گے، لیکن عاملوں کے پاس جاتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں کہ آئندہ کا کیا معاملہ ہے ؟اس کے بارے میں دیکھ کر کچھ بتاؤ، حالاں کہ وہ غیب تھوڑا ہی جانتا ہے۔ یہ مزاج دھیرے دھیرے اسی طرف ڈھلتا جارہا ہے، اس لیے ایسی چیزوں سے اپنے آپ کو بچانے کی ضرورت ہے۔

غلط عقیدہ:

بدشگونی کا مطلب یہ ہے کہ کسی کام کو کرنے سے پہلے کسی چیز کو دیکھ کر اس کام سے رک جانا۔ زمانۂ جاہلیت میں کسی آدمی کو سفر درپیش ہوتا ، یا کسی کام کے لیے گھر سے باہر نکلتا؛ تو دیکھتا کہ کوئی پرندہ بیٹھا ہوا ہے یا نہیں ، اگر کوئی پرندہ بیٹھا ہوا ملتا، وہ اس کی طرف کنکر پھینکتا، اگر وہ پرندہ اُڑ کر دائیں طرف جاتا تو سمجھتا کہ اس کام میں کامیابی ہوگی، اور اگر وہ بائیں طرف جاتا تو سمجھتا کہ ناکامی ہوگی اور واپس ہو جاتا تھا۔

آج کل ہمارے سماج میں بھی بہت سے لوگ ایسا سمجھتے ہیں ، جیسے: باہر نکلے اور بلّی سامنے سے گزر گئی، تو کہتے ہیں کہ سارا معاملہ خراب ہو گیا،اور پھر جس کام کے ارادہ سے گھر سے نکلے تھے اس کو چھوڑ کر واپس آجاتے ہیں کہ بلّی راستہ کاٹ گئی،اب معاملہ مشکل ہے،اس کام میں کامیابی نہیں ہو گی۔اچھا بھائی! بلّی کا سامنے سے گزرنا اتنا زیادہ موئثر ہے کہ اس نے آپ کے کام پر ہی اثر ڈال دیا؟ یہی بد شگونی ہے،اسلام ایسا عقیدہ رکھنے کی اجازت نہیں دیتا۔

اگر ایسا کھٹکا پیدا ہو گیا:

اور ایک بات یہ بھی یاد رہے کہ بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ آدمی واپس تو نہیں ہوتا، لیکن دل میں کھٹکا سارہ جاتا ہے۔ویسے ایک آدمی شریعت کے مسئلہ کو جانتا ہے کہ اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے، لیکن پھر بھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ پرانا مزاج ہونے کی وجہ سے دل میں وسوسہ سا پیدا ہو جاتا ہے کہ اب کیا ہو گا۔یعنی اپنا ارادہ ترک نہیں کرتا اور اس کام کو چھوڑ بھی نہیں دیتا، گھر واپس بھی نہیں ہو جاتا، بلکہ اپنے کام کے لیے آگے تو بڑھتا ہے، لیکن دل میں ایک کھٹکا سا رہتا ہے،تو اس کے لیے حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ اگر ایسا کھٹکا پیدا ہو گیا ہو تب بھی اپنا کام کر ڈالے،اس کام چھوڑ نہ دے۔بس ! اس طرح اس نے شریعت کے حکم پر عمل کر لیا،اب اس کے بعد بھی وہ کام نہ ہو تو یہ نہ سمجھے کہ اس کی وجہ سے نہیں ہوا ،بلکہ اللہ تعالیٰ کو منظور نہیں تھا اس وجہ سے وہ کام نہیں ہوا۔

بہر حال! یہاں تو یہ روایت یہی بتانے کے لیے لائے ہیں کہ نبیٔ کریم (ﷺ) کی تعلیم وتربیت کا طریقہ کیسا تھا۔

حدیث ۷۰۲:-

وعن العِرْباض بن ساريَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ: وَعَظَنَا رسول الله (ﷺ) مَوْعِظَةً وَجِلَتْ مِنْهَا الْقُلُوبُ، وَذَرَفَتْ مِنْهَا الْعُيُونُ...وَذَكَرَ الحَدِيثَ وَقَدْ سَبَقَ بِكَمَالِهِ فِى باب الأمْرِ بِالْمُحَافَظَةِ عَلَى السُّنَّة.

افادات:- اس حدیث کو اس باب میں لاکر نبیٔ کریم (ﷺ) کے وعظ کا ایک نمونہ پیش کرنا چاہتے ہیں کہ آپ (ﷺ) کے وعظ کی کیفیت کیا ہوا کرتی تھی۔

(یہ حدیث پہلے بھی کئی ابواب میں گزر چکی ہے، اور اس کی تفصیل باب الامر بالمحافظة علیٰ السنة۔ حدیث کے اصلاحی مضامین، جلد:۳/ حدیث نمبر: ۱۵۷/ صفحہ ۲۰۸ تا ۲۱۰ پر گزر چکی ہے۔ مرتب)

باب الوقار والسکینة

سنجیدگی اور اطمینان کی عادت

بسم اللہ الرحمن الرحیم

﴿وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْأَرْضِ هَوْنًا﴾

جیساکہ آپ کو معلوم ہے کہ آداب کا بیان چل رہا ہے جس میں زندگی گزارنے کی تمیز اورآداب سکھائے جارہے ہیں۔حضرت علامہ انورشاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کتاب الادب کے متعلق فرماتے ہیں کہ ایک مؤمن کی زندگی کس طرح ہونی چاہیے اور زندگی کے ہر شعبہ اور ہرہرقدم پر مؤمن کوکس طرح کا سلوک کرناچاہیے،اسی سلیقہ اور تمیز کوادب سے تعبیر کیا جاتا ہے۔نبی کریم (ﷺ) نے اس سلسلہ میں مختلف ہدایتیں ارشاد فرمائی ہیں۔باب کا عنوان قائم کیا ہے: ’’الوقاروالسکینۃ‘‘وقاراوراطمینان کا بیان

زندگی کا اہم ادب:

وقاریعنی سنجیدگی اور طبیعت کے اندر جماؤاور ٹھیراؤ کا ہونا۔کسی آدمی کے سامنے جب کوئی ایسا معاملہ پیش آئے جواس کی طبیعت میں بے صبری پیداکرنے والا ہو، تواس سے متاثر ہوکر بے صبری کااظہارنہ کرے؛بلکہ تحمل اور بردباری سے کام لے۔کوئی ایسی بات پیش آئی جو آدمی کی طبیعت میں اشتعال اورغصہ وجوش دلانے والی ہے،تواس سے متاثرہوکر مشتعل نہ ہو،جوش وغصہ میں نہ آجائے،بلکہ اپنےاوپر کنٹرول اور قابو رکھے۔مجلس کے اندراورلوگوں کے سامنے

آدمی کو اپنے مزاج اور طبیعت پر قابو رکھتے ہوئے اس طرح رہنا چاہیے کہ سامنے والے کی طرف سے کی جانے والی بدسلوکی یا نامناسب برتاؤ سے متاثر ہوئے بغیر سنجیدگی اور اطمینان کا اظہار کرنا چاہیے؛ اسی کو وقار اور سکینہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ آدمی کسی حال میں بھی وقار اور سنجیدگی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑے۔ کسی کی بھی طرف سے آپ کے ساتھ کیسا ہی معاملہ کیوں نہ کیا جائے جس کے نتیجہ آپ کی طبیعت میں اشتعال پیدا ہو سکتا ہے، طبیعت میں بے صبری آسکتی ہے، جوش اور غصہ آسکتا ہے، لیکن آپ اپنے اوپر قابو رکھتے ہوئے ان ساری چیزوں سے متاثر ہوئے بغیر وقار اور سنجیدگی کا معاملہ کریں۔

"وَقَرَ" کا معنیٰ کسی چیز کا کسی جگہ پر ٹھیر جانا اور جم جانا۔ گویا آپ کی طبیعت میں ایسا ٹھیراؤ اور جماؤ ہو کہ سامنے والا آپ کو اپنی اصل جگہ سے ہٹا نہ سکے، اشتعال دلانے والی چیز آپ کو مشتعل نہ کر سکے، جوش دلانے والی چیز آپ کو جوش میں نہ لائے؛ اسی کو "وقار" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ بھی شریعت کی ایک اہم تعلیم ہے کہ آدمی ہمیشہ وقار کا مظاہرہ کرے اور سنجیدگی سے رہے۔

ہر معاملہ میں تواضع :

اس سلسلہ میں آیتِ کریمہ پیش کی ہے: ﴿وَعِبَادُ الرَّحْمَنِ الَّذِيْنَ يَمْشُونَ عَلَى الْأَرْضِ هَوْنًا﴾ اللہ تعالیٰ نے سورۂ فرقان میں اپنے مخصوص بندوں کی کچھ صفات بیان کی ہیں، ان میں سے ایک صفت یہ ہے کہ رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو زمین پر عاجزی سے چلتے ہیں، گویا ان کی ہر

حرکت اور معاملہ سے تواضع ظاہر ہوتی ہے،ان کی چال میں بھی تواضع ہوتی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آدمی بیماروں کی طرح بالکل آہستہ آہستہ چلے،بلکہ آدمی اپنی رفتار سے چلے،خود نبی کریم ﷺ کی رفتار میں تیزی تھی جیسا کہ حدیث پاک میں آتا ہے:"کَأَنَّمَا الْأَرْضَ تُطْوىٰ لَهٗ" آپ اس طرح چلتے تھے کہ گویا زمین آپ کے لیے لپیٹی جارہی ہے۔ معلوم ہوا کہ عاجزی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بیماروں کی طرح چلے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک نوجوان کو دیکھا کہ وہ بالکل آہستہ آہستہ بیماروں کی طرح چل رہا ہے،اس سے پوچھا: کیا بات ہے؟ تم بیمار ہو؟ اس نے کہا: نہیں۔ تو ایک کوڑا مارا اور کہا: نوجوان ہو کر اس طرح چلتے ہو؟ اس طرح مت چلو۔ اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ آدمی کی چال میں تکبر،بڑائی اور اتراہٹ ہو،اس سے بھی شریعت نے منع کیا ہے،آدمی کی ہر ادا اور طریقہ سے تواضع ٹپکنی چاہیے،ہر معاملہ میں فروتنی ظاہر ہونی چاہیے۔

رحمٰن کے بندوں کی صفت:

﴿وَإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُونَ قَالُوا سَلَامًا﴾ اور جہالت کا برتاؤ کرنے والے لوگ جب ان سے مخاطب ہوتے ہیں تو وہ جواب میں کہتے ہیں: صاحب سلامت رہو۔ "جاہلون" سے مراد "اَن پڑھ" نہیں ہے،بلکہ کبھی پڑھا لکھا آدمی بھی جہالت بھرا سلوک کرتا ہے،اور کبھی بے پڑھا لکھا آدمی بھی بڑا باتمیز اور اچھا سلوک کرتا ہے۔ تو یہاں "جاہلون" کہہ کر ایسے لوگ مراد ہیں جو کسی کے

ساتھ جیسا مناسب، انسانیت والا، مروت و شرافت والا برتاؤ کرنا چاہیے، ویسا برتاؤ نہ کریں، بلکہ نادانی اور جہالت بھرا برتاؤ کریں؛ جس کو ہم اپنی زبان میں ''اُلٹی بات کرنے والا'' کہتے ہیں۔ تو ایسا آدمی جب گفتگو کرے تو اس کے جواب میں مشتعل نہ ہو جائے، جوش اور غصہ میں نہ آجائے، بلکہ سلامتی والی ایسی بات کہے کہ سامنے والا اپنی حرکت سے اس کو جو الجھانا چاہتا ہے وہ الجھا نہ سکے۔ یہاں ﴿سَلٰمًا﴾ سے مراد ''السلام علیکم'' کہنا نہیں ہے، بلکہ مفسرین نے لکھا ہے کہ اپنے آپ کو اس سے بچالے۔ سامنے والے کے سلوک کا تقاضہ تو یہ تھا کہ یہ اس سے الجھ جاتا، اور اس کے ساتھ لڑ بھڑ جاتا، لیکن وہ ایسا نہیں کرتا بلکہ صبر و تحمل اور بردباری سے کام لیتا ہے، اور وقار و سنجیدگی سے پیش آتا ہے۔

اس آیت کے دوسرے جزو ﴿وَإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُونَ قَالُوا سَلَامًا﴾ کا تعلق وقار اور سنجیدگی سے ہے، اس لیے کہ ظاہر ہے کوئی آدمی کسی کے ساتھ جب جہالت بھرا سلوک کرتا ہے تو طبیعت میں جوش پیدا ہوتا ہے، بے چینی اور بے صبری ہوتی ہے، آدمی کی طبیعت چاہتی ہے کہ سامنے والا ہمارے ساتھ جو معاملہ کر رہا ہے تو اس کو اینٹ کا جواب پتھر سے دینا چاہیے، لیکن ایسے ہی وقت پر وہ اپنے اوپر قابو رکھتا ہے، اور ضبطِ نفس سے کام لیتا ہے، اور سامنے والے کے جہالت بھرے سلوک کے جواب میں یہ جہالت والا معاملہ نہیں کرتا، بلکہ ایسی حرکتوں سے اپنے آپ کو بچالے جاتا ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ کے مقبول و مخصوص بندوں کی جو صفات و خوبیاں ہیں ان میں سے ایک خوبی یہ بھی ہے؛ اسی کو ''وقار'' سے تعبیر کرتے ہیں۔

وقار کا ایک پہلو یہ بھی ہے:

حدیث ۷۰۳:-

وعن عائشة رضی اللہ عنہا قالت: مَا رَأَيْتُ رسول الله (صلی اللہ علیہ وسلم) مُسْتَجْمِعاً قَطُّ ضَاحِكاً حَتَّى تُرَى مِنهُ لَهَوَاتُهُ، إِنَّمَا كَانَ يَتَبَسَّمُ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

((اللَّهَوَاتُ)) جَمْعُ لَهَاةٍ: وَهِيَ اللَّحْمَةُ الَّتي في أقْصى سَقْفِ الْفَمِ.

ترجمہ:- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو کبھی کھِل کھِلا کر اور خوب جم کر اس طرح ہنستے ہوئے نہیں دیکھا کہ آپ کے منھ کے اندر کا کوّا نظر آتا ہو، اگر کبھی کوئی بات ہنسی کی ہوا کرتی تھی تو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) صرف مسکراتے تھے۔

افادات:- یہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے وقار کی بات تھی۔ یہاں علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ وقار کے ایک دوسرے پہلو کو اجاگر کرتے ہیں۔ حلق کے اندر گوشت کا ایک ٹکڑا لٹکا ہوا ہوتا ہے، جب آدمی کھِل کھِلا کر زور سے ہنستا ہے، تو سامنے والے کو وہ نظر آتا ہے؛ اسی کو ہم اپنی زبان میں کوّا کہتے ہیں۔ مسکرانے کا مطلب یہ ہے کہ صرف ہونٹ کھلیں، آواز بھی پیدا نہ ہو، اور آدمی کے دندان نظر آئیں، جس کو تبسم کہتے ہیں۔ بہت سی مرتبہ ہنسانے والے ہنساتے ہیں، مگر یہ اپنے آپ پر ایسا ضبط اور کنٹرول رکھتا ہے، اور اس کا ایسا اثر نہیں لیتا کہ بے قابو ہو جائے، لوٹ پوٹ ہو جائے، اور خوب زور زور سے ہنسنے لگے، اس لیے کہ یہ طریقہ بھی وقار کے خلاف ہے۔

وقار کا ایک پہلو وہ بھی بتایا تھا کہ غصہ دلانے والا جہالت بھری بات کرتا ہے تو اس کے جواب میں کوئی ایسی ویسی بات نہیں کرتا، بلکہ اپنے آپ کو بچالیتا ہے۔ اور وقار کا ایک پہلو یہ بھی بتایا کہ ہنسانے والا ہنسانے کی بات کرتا ہے، یا کوئی ایسی بات پیش آگئی جس سے آدمی ہنسنے میں بے قابو ہو جائے، تب بھی یہ اپنے آپ کو بے قابو ہونے سے بچاتا ہے۔ وقار کا ایک طریقہ اور انداز یہ بھی ہے۔

خلاصہ یہ ہوا کہ وقار کے اندر دونوں چیزیں ملحوظ رکھنی چاہئیں، جوش و غصہ والی بات سے اتنا زیادہ غصہ بھی نہ ہو جائے، اور ہنسانے والی بات پر اتنا بے قابو ہو کر ہنسنا بھی شروع نہ کر دے، بلکہ اپنے آپ پر ضبط اور کنٹرول رکھے، اسی کا نام وقار اور سنجیدگی ہے، اور شریعت نے اس کی تعلیم دی ہے۔

الندب الى اتيان الصلاة والعلم ونحوهما من العبادات بالسكينة والوقار

نمازاور علمی مجالس میں سکون و وقار سے آنا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وقار کو چھوڑنے کی اجازت نہیں:

نماز، علم کی مجلس ،یاعبادات کے قبیل کی کوئی چیز؛جس میں آدمی حاضری دیا کرتا ہے،وہاں بھی آدمی ایسی عجلت نہ دکھائے کہ طبیعت بے قابو ہو جائے،بلکہ ایسی جگہوں پر بھی وقار،اطمینان وسکون کے ساتھ پہنچے۔شریعت کسی بھی حال میں وقار کو چھوڑنے کی اجازت نہیں دیتی۔

تقویٰ کی علامت:

اس سلسلہ میں ایک آیت پیش کی ہے:﴿وَمَن يُعَظِّمْ شَعَائِرَ اللهِ فَإِنَّهَا مِن تَقْوَى الْقُلُوبِ﴾ جو آدمی اللہ تعالیٰ کے دین کی نشانیوں کاادب کرتاہے؛یہ اس کے دل کے اندر اللہ تعالیٰ کے خوف اورڈر کی علامت ہے۔"شعائر"یعنی کسی بھی مذہب اوردین کی علامتیں اورنشانیاں جن کودیکھ کروہ مذہب والے پہچانے جاتے ہیں ، جیسے: نماز اسلام کے شعائر میں سے ہے،اس لیے اس کے ادب کالحاظ رکھنا ضروری ہے اوراس کے ادب میں سے یہ بھی ہے کہ آدمی اتنی جلدبازی اور عجلت نہ کرے کہ بھاگنے دوڑنے کی نوبت آئے،بلکہ اطمینان وسکون کے ساتھ نماز کے لیے مسجد میں آئے۔ دوسری کسی بھی علمی ودینی مجالس میں حاضری دیتےوقت اطمینان وسکون کادامن ہاتھ سے نہ چھوڑے۔

گویاوقاراور سنجیدگی کی جو تعلیم ہمیں دی گئی ہے اس کالحاظ یہاں تک کیا گیاکہ عبادات کی حاضری کے موقع پر بھی اس کوملحوظ رکھا گیا ہے۔چوں کہ عبادات وہ طریقے ہیں جن سے آدمی اللہ تعالیٰ کوراضی کرتا ہے،توان کے بارے میں کسی کویہ خیال ہوسکتا تھاکہ جلدبازی اور عجلت سے کام لینا شاید مطلوب وپسندیدہ ہو۔تو یہ روایت لاکریہ بتلارہے ہیں کہ ایسانہیں ہے،بلکہ وقار اورسنجیدگی کے متعلق شریعت کی جو تعلیم ہے اس کو کہیں بھی ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہیے، اس کالحاظ تو وہاں بھی ہوناچاہیے۔

دوڑنا؛وقاراور سنجیدگی کے خلاف ہے:

حدیث ۷۰۴:-

وعن أبي هريرة رضی اللہ عنہ **قَالَ : سَمِعْتُ رسولَ الله (ﷺ) يقول : إِذَا أُقِيمَتِ الصَّلاَةُ، فَلاَ تَأْتُوهَا وَأَنْتُمْ تَسْعَونَ،وَأْتُوهَا وَأَنْتُمْ تَمْشُونَ،وَعَلَيْكُمُ السَّكِينَةُ، فَمَا أَدْرَكْتُم فَصَلُّوا ،وَمَا فَاتَكُمْ فَأَتِمُّوا.** (متفقٌ عَلَيْهِ)

زادمسلِمٌ فی روايةٍ لَهُ: فَإِنَّ أَحَدَكُمْ إِذَا كَانَ يَعْمِدُ إِلَى الصَّلاَةِ فَهُوَ فی صَلاَةٍ.

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم (ﷺ) کو ارشاد فرماتے ہوئے سناکہ :جب نماز کے لیے اقامت کہہ دی جائے ،یانمازشروع ہوچکی ہو؛ تو اس میں شریک ہونے کے لیے دوڑتے ہوئے نہ آؤ،بلکہ چلتے ہوئے اور سکون کے ساتھ آؤ۔اب امام کے ساتھ نماز کاجتناحصہ مل گیاوہ امام کے ساتھ پڑھ لو،اورجتنا چھوٹ گیا اس کوبعدمیں پورا کرلو۔

مسلم شریف کی روایت میں یہ ہے کہ: تم میں کوئی آدمی جب نماز کے ارادہ سے چلتا ہے تو وہ نماز ہی کے حکم میں ہے۔

افادات:–مثلاً: مسجد میں آئے اور دیکھا کہ جماعت شروع ہوچکی ہے اور امام صاحب رکوع میں ہیں، تو بعضوں کی عادت ہوتی ہے کہ رکعت پانے کے لیے دوڑتے ہیں۔اس روایت میں یہی فرمایا کہ دوڑنے کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ عام رفتار سے آؤ، اگر اس میں معمولی تیزی ہو تو کوئی حرج کی بات بھی نہیں ہے، لیکن جس رفتار کو دوڑنے سے تعبیر کیا جاتا ہے اس کی اجازت نہیں ہے۔ دوڑنا؛ وقار اور سنجیدگی کے خلاف ہے، اس لیے کہا گیا کہ دوڑ کر نہ آؤ بلکہ چل کر آؤ۔یعنی نماز میں شریک ہونے کے لیے اپنی عام چال میں کوئی فرق آنا نہیں چاہیے، وقار و سنجیدگی والی چال کے ساتھ ہی نماز میں شریک ہونا بھی نماز کے آداب میں سے ایک ادب ہے۔

حاصل شدہ کے لیے بھاگنا لاحاصل:

اب یہ سوال کہ سکون کے ساتھ آنے کی صورت میں ہوسکتا ہے کہ کوئی رکعت چھوٹ جائے؟ تو کہا گیا کہ آپ تو اطمینان ہی سے آیئے، امام کے ساتھ نماز کا جتنا حصہ مل جائے وہ امام کے ساتھ پڑھ لیجئے، اور جتنا چھوٹ جائے اس کو بعد میں پورا کرلیجئے۔ مسلم شریف کی روایت میں جو زیادتی ہے اس کے ذریعہ ایک اشکال کا جواب دیا ہے کہ آدمی دوڑتا اس لیے ہے کہ میں جلدی سے نماز میں شریک ہو کر نماز کا ثواب حاصل کرلوں، تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ: کوئی

آدمی جب نماز کے ارادے سے چلتاہے تووہ نماز ہی کے حکم میں ہے۔گویا آپ گھر سے چلے تو آپ کا میٹر چالو ہوگیا، اب فکر کاہے کی ہے۔آپ اسی لیے دوڑتے تھے کہ نماز کا ثواب لیناہے، تو نماز کے ارادہ سے چلنے سے ہی نماز کے ثواب کا میٹر شروع ہوچکا ہے، اب آپ اطمینان رکھئے، اوراپنی پُروقار چال سے چلتے ہوئے نماز میں شریک ہویئے،بھاگنے دوڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔آپ کے دوڑنے کا مقصد ثواب کوحاصل کرناتھا،وہ تو نماز کے ارادہ سے چلنے سے ہی حاصل ہوچکاہے۔

جلدبازی نیکی نہیں ہے:

حدیث ۷۰۵:-

وعن ابن عباس رضی اللہ عنہما: أَنَّهُ دَفَعَ مَعَ النَّبِيِّ (صلی اللہ علیہ وسلم) يَوْمَ عَرَفَةَ فَسَمِعَ النبيُّ (صلی اللہ علیہ وسلم) وَرَاءهُ زَجْراً شَدِيداً وَضَرْباً وَصَوْتاً لِلإِبِلِ، فَأَشَارَ بِسَوْطِهِ إِلَيْهِمْ، وقال: يَاأَيُّهَا النَّاسُ! عَلَيْكُمْ بِالسَّكِينَةِ، فَإِنَّ الْبِرَّ لَيْسَ بالإِيضَاعِ.

((الْبِرُّ)): الطَّاعَةُ. وَ((الإِيضَاعُ)): الإِسْرَاعُ.

ترجمہ مع تشریح:- حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حجۃ الوداع کے موقع پر نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) عرفات کے دن (غروبِ آفتاب کے بعدمیدانِ عرفات سے مزدلفہ کی طرف) روانہ ہوئے۔جب آپ روانہ ہوئے توجولوگ حج میں شریک تھے وہ سب بھی آپ کے پیچھے پیچھے روانہ ہوئے۔ اب حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) تو آگے تشریف لے جا رہے تھے توآپ نے اپنے پیچھے سے محسوس کیا اورسنا کہ لوگ

اپنے جانوروں کو(تیز چلانے کے لیے) خوب جھڑک رہے ہیں اور ان کی پٹائی کررہے ہیں اوراونٹوں کو آوازدے رہےہیں۔تو آپ (ﷺ) نے اپنے کوڑے کے ذریعہ سے لوگوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:اے لوگو!سکون اور اطمینان کولازم پکڑو، اپنے جانوروں کوجھڑک کراوران کی پٹائی کرکے جلدی کرنے کی ضرورت نہیں ہے،اس لیے کہ جانوروں کو تیز دوڑانا کوئی عبادت اور نیکی نہیں ہے

باب اکرام الضیف

مہمان کا اعزاز واکرام کرنا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا عمل:

مہمان نوازی بھی آداب میں سے ہے۔باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿هَلْ أَتَاكَ حَدِيْثُ ضَيْفِ إِبْرَاهِيْمَ الْمُكْرَمِيْنَ﴾ کیا آپ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے باعزت مہمانوں کا قصہ پہنچا؟ جب وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس تشریف لائے تو انہوں نے حضرت کو سلام کیا، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی سلام کیا (اور دل میں سوچا) نئے لوگ معلوم ہوتے ہیں ،جانے پہچانے لوگ نہیں ہیں،شناسا نہیں ہیں۔پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام دھیرے سے اپنے گھر والوں کے پاس سرک گئے، اور تازہ بھنا ہوا بچھڑا لے کر آئے، اپنے مہمانوں کے سامنے پیش کیا اور فرمانے لگے : ﴿أَلَا تَأْكُلُوْنَ﴾ کھاتے نہیں ؟یہ آیتِ کریمہ لا کر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مہمان نوازی والا عمل بتلایا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوۃ والسلام کے پاس ان کے یہاں پیدا ہونے والے بچے کی بشارت دینے کے لیے تین فرشتے حضرت جبرئیل، حضرت میکائیل اور حضرت اسرافیل علیہم السلام کو انسانی شکلوں میں بھیجا تھا۔اس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اہلیہ محترمہ حضرت سارہ علیہا السلام بھی بوڑھی ہو چکی تھیں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام خود بھی بڑھاپے کی عمر کو پہنچ چکے تھے، مگر اللہ تعالیٰ کو ان دونوں کو بیٹا دینا منظور تھا جس کی بشارت دینے کے لیے ان تین فرشتوں کو بھیجا

اور یہ تینوں انسانی شکل میں ان کے گھر مہمان بن کر پہنچے، حضرت ابراہیم علیہ السلام ان کو پہچان نہیں پائے، بلکہ سمجھے کہ کوئی انسان ہیں جو ہمارے یہاں مہمان آئے ہیں۔ اس لیے کہ آنے والے دونوں قسم کے ہوتے ہیں، بعض ایسے ہوتے ہیں جن سے پہلے سے شناسائی اور جان پہچان ہوتی ہے، اور بعضوں سے پہلے سے جان پہچان نہیں ہوتی، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے دل میں سوچا کہ آنے والے نئے معلوم ہوتے ہیں۔

تب مجوسی ایمان لے آیا:

ویسے بھی مہمان نوازی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جاری فرمودہ سنت ہے، آپ کی عادتِ شریفہ یہ تھی کہ جب کھانے بیٹھتے تھے تو جب تک کوئی مہمان نہیں ہوتا تھا وہاں تک کھانا حلق سے نہیں اترتا تھا، اگر کوئی مہمان نہیں ہوتا تھا تو مہمان تلاش کرنے کے لیے باہر نکلتے تھے۔

علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں اسرائیلیات سے ایک قصہ نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ کوئی مہمان نہیں تھا تو اس کی جستجو اور تلاش میں نکلے، ایک مجوسی نظر آیا، اس کو ساتھ لے آئے، کھانے کے لیے ساتھ بٹھایا اور اس سے کہا: بسم اللہ کہو اور کھانا شروع کرو۔ اس نے کہا: کون اللہ؟ میں نہیں جانتا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کو اُٹھا کر روانہ کر دیا۔ جب وہ باہر نکلا تو اللہ تعالیٰ نے وحی بھیجی کہ: اے ابراہیم! ہم تو اس کو زندگی بھر کھلاتے رہے، اور تم سے ایک مرتبہ بھی کھلایا نہ گیا؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام فوراً دوڑے اور اس کو سمجھا بجھا کر ساتھ لے آئے

کہ میرے ساتھ ہی کھانا کھاؤ۔اس نے کہا: جب تک مجھے یہ نہیں بتلاؤ گے کہ مجھے نکالا کیوں تھا، پھر دوبارہ بلا کر کیوں لائے؛وہاں تک میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بتلایا:تو نے اس اللہ کا نام نہیں لیا جس نے ہمیں پیدا کیا اور روزی دی،اس کے بہت سارے انعامات و احسانات ہیں ،اسی کی نعمتیں ہم استعمال کرتے ہیں ، تجھے اس کا نام لینا چاہیے،لیکن میں نے جب بسم اللہ پڑھنے کو کہا تو تو نے یہ جواب دیا کہ کون اللہ؟میں نہیں جانتا،اس پر مجھے غصہ آیا اور میں نے تجھے روانہ کر دیا،لیکن پھر اللہ تعالیٰ نے مجھ پر وحی بھیجی کہ میں تو اس کو ابتدائے زندگی سے آج تک کھلا رہا ہوں،تو میں تجھے بلا کر لے آیا؛ اب کھانا شروع کر۔یہ سن کر وہ آدمی ایمان لے آیا۔

آیت سے مستفاد احکام:

یہاں یہ آیت لاکر بتلانا چاہتے ہیں کہ دیکھئے!حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے یہاں آنے والے ان مہمانوں کی میزبانی کا اتنا زیادہ اہتمام کیا کہ وہ آکر بیٹھے تو آہستہ سے ان کے پاس سے سرک گئے،اور بھونا ہوا تازہ بچھڑا لاکر ان کے سامنے پیش کیا۔

﴿فَرَاغَ﴾ کا مطلب ہے: آدمی کا آہستہ سے سرک جانا،اس طرح اُٹھنا کہ پاس والوں کو پتہ بھی نہ چلے۔اس سے معلوم ہوا کہ جب مہمان آئے تو فوری طور پر جو کچھ موجود ہو،اسی سے اس کا اکرام کرنا چاہیے،تکلّف میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔بعد میں مزید جو اہتمام ہو سکتا ہو وہ کرلے ۔

”انہوں نے مہمانوں کے سامنے لا کر کھانا پیش کیا“اس سے بعض حضرات یہ بھی استدلال کرتے ہیں کہ مہمانوں کو مکلّف نہیں کرنا چاہیے کہ آپ چلئے، بلکہ وہ جہاں بیٹھے ہوں وہیں کھانا لا کر پیش کیا جائے۔

چوں کہ وہ فرشتے تھے اس لیے انہوں نے کھانے کے لیے ہاتھ آگے نہیں بڑھائے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کو متوجہ کیا کہ کھاؤ، کیوں نہیں کھاتے؟ان کے نہ کھانے کی وجہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ذرا خوف بھی محسوس کیا، اس لیے کہ اُس زمانہ کا رواج یہی تھا کہ کوئی کسی کے یہاں کسی برے ارادہ سے جاتا تو اس کے یہاں کا کھانا نہیں کھاتا تھا(آج کل تو اسی کا کھا کر اسی کو تکلیف پہنچاتے ہیں۔ خیر!)انہوں نے کہا کہ: ہم تو فرشتے ہیں، ہم کھاتے پیتے نہیں۔

حضرت لوط علیہ السلام کا مہمانوں کا اکرام:

دوسری آیت پیش کی:﴿وَجَآءَهٗ قَوْمُهٗ يُهْرَعُوْنَ اِلَيْهِ﴾یہی فرشتے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس بیٹے کی بشارت دینے کے لیے آئے تھے، یہاں سے فارغ ہونے کے بعد حضرت لوط علیٰ نبینا وعلیہ السلام کے پاس پہنچے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام فلسطین میں قیام پذیر تھے، وہاں سے چند میل کے فاصلے پر حضرت لوط علیہ السلام کی آبادی تھی، فرشتے انسانی شکل میں بے ریش اور خوبصورت تھے، اور حضرت لوط علیہ السلام کی قوم لواطت کی برائی میں مبتلا تھی، ان خوبصورت شکل والے لڑکوں کو دیکھ کر وہ لوگ اپنے جذبات لے کر دوڑے ہوئے آئے۔ حضرت لوط علیہ السلام نے ان لوگوں سے

کہا کہ: تمہارے گھروں میں جو تمہاری بیویاں ہیں وہ میری بیٹیوں کا درجہ رکھتی ہیں ، وہ تمہارے لیے پاکیزہ اور حلال ہیں،ان سے اپنی ضرورت پوری کرو۔یہ میرے مہمان ہیں، ان کے معاملہ میں تم اللہ تعالیٰ سے ڈرو، اور مہمانوں کے معاملہ میں مجھے رسوانہ کرو۔کیاتم میں کوئی سمجھ دار آدمی نہیں ہے؟دیکھئے! حضرت لوط علیہ السلام نے اپنے مہمانوں کے اکرام کے معاملہ میں اتنا زیادہ اہتمام فرمایا اور قوم کی طرف سے کی جانے والی ناروا حرکت سے بچانے کی پوری کوشش کی، اس لیے اس آیت کو یہاں لائے ہیں۔

مہمان نوازی؛ایمان کا تقاضہ:

حدیث ٧٠٦:-

وعن أَبي هريرة رضی اللہ عنہ أَنَّ النبيَّ (ﷺ) قَالَ: مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلْيُكْرِمْ ضَيْفَهُ. وَمَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلْيَصِلْ رَحِمَهُ. وَمَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلْيَقُلْ خَيْرًا أَوْ لِيَصْمُتْ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا:تم میں سے جو آدمی اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو،اس کو چاہیے کہ اپنے مہمان کا اکرام کرے۔اور جو آدمی اللہ تعالیٰ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہو اس کو چاہیے کہ صلہ رحمی کرے (اپنے رشتہ داروں کے حقوق ادا کرے)

اور جو آدمی اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو وہ بھلی بات کہے یا خاموش رہے (یعنی اگر کچھ بولنا ہی ہو تو زبان سے بھلی بات بولے، ورنہ خاموشی اختیار کرے۔)

افادات:- مہمان نوازی ان صفات میں سے ہے جس کا اہتمام زمانۂ جاہلیت میں بھی کیا جاتا تھا، اور نبیٔ کریم (ﷺ) پر وحی کا سلسلہ شروع ہونے سے پہلے آپ جن کاموں کا خاص طور پر اہتمام فرماتے تھے؛ ان میں سے ایک کام یہ بھی تھا چناں چہ حدیثِ پاک میں ہے کہ جب نبیٔ کریم (ﷺ) پر غارِ حراء میں سب سے پہلی وحی نازل ہوئی، حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آپ سے تین مرتبہ کہا کہ پڑھیے، آپ نے کہا: میں پڑھا ہوا نہیں ہوں، تو انھوں نے آپ (ﷺ) کو دبوچا، اس کے بعد پھر آپ سے کہا تو آپ نے پڑھا، جب وہاں سے آپ (ﷺ) اپنے گھر پر واپس آئے تو چوں کہ زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ فرشتہ سے ملاقات ہوئی تھی، اس سے آپ کو اپنی جان کا اندیشہ لاحق ہوا، تو آپ نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے کہا: "اِنِّیْ خَشِیْتُ عَلٰی نَفْسِیْ" مجھے اپنی جان کا خطرہ محسوس ہو رہا ہے۔ اس وقت حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے تسلی کے لیے جو باتیں ارشاد فرمائیں، ان میں یہ فرمایا تھا: "کَلَّا! وَاللہِ لَا یُخْزِیْكَ اللہُ اَبَداً" ہر گز نہیں! آپ کو اپنی جان کے متعلق فکر رکھنے کی ضرورت نہیں ہے، اللہ تعالیٰ آپ کو کبھی رسوا نہیں کریں گے "اِنَّكَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ. وَتَحْمِلُ الْکَلَّ. وَتَقْرِی الضَّیْفَ" آپ صلہ رحمی کرتے ہیں، ناتوانوں کا بوجھ اُٹھاتے ہیں، مہمان نوازی کرتے ہیں (بخاری شریف) اس سے پتہ چلا کہ مہمان نوازی ان خوبیوں میں سے ہے جن کا قدیم زمانہ سے

اہتمام چلا آرہا ہے، خود نبی کریم (ﷺ) نے بھی اس کی تاکید اور تعلیم فرمائی ہے۔ گویا ایمان کی علامتوں میں سے ایک یہ ہے کہ آدمی اپنے مہمان کا اکرام کرے۔

آج کل تو لوگ ایسی مصیبتوں میں مبتلا ہو گئے کہ اب تو یہ سب کام بھی بوجھ پڑتے ہیں، جب سے ٹی وی کی مصیبت آگئی ہے تو مہمان کے آنے پر ناگواری کا اظہار کیا جاتا ہے، اگر آدمی ٹی وی دیکھنے بیٹھا ہو اور مہمان آجائے تو اُٹھ کر اس کی طرف توجہ کرنے کی بھی زحمت نہیں کرتا۔

مہمان اور میزبان کے لیے ہدایات:

حدیث ۷۰۷:-

وعن أبي شُرَيحٍ خُوَيلِدِ بن عمرو الخُزَاعِيّ رضی اللہ عنہ قَالَ: سَمِعتُ رسول الله (ﷺ) يقول: مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الآخِرِ فَلْيُكْرِمْ ضَيفَهُ جَائِزَتَهُ. قالوا: وَمَا جَائِزَتُهُ يَا رسول الله؟ قَالَ: يَوْمُهُ وَلَيلَتُهُ، وَالضِّيَافَةُ ثَلاَثَةُ أَيَّامٍ، فَمَا كَانَ وَرَاءَ ذٰلِكَ فَهُوَ صَدَقَةٌ عَلَيهِ. (متفقٌ عَلَيهِ)

وفي رواية لِمسلمٍ: لاَ يَحِلُّ لِمُسْلِمٍ أَنْ يُقِيمَ عِنْدَ أَخِيهِ حَتَّى يُؤْثِمَهُ. قالوا: يَا رسول الله! وَكَيفَ يُؤْثِمُهُ؟ قَالَ: يُقِيمُ عِنْدَهُ، وَلاَ شَيءَ لَهُ يُقْرِيهِ بِهِ.

ترجمہ مع تشریح:- حضرت ابو شریح خویلد بن عمرو خزاعی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم (ﷺ) کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: جو آدمی اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو وہ اپنے مہمان کا اکرام کرے، اور خصوصی اہتمام کرے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! خصوصی اہتمام کیا

ہے؟ آپ (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: ایک دن اور رات (گویا مہمان کی آمد پر دو وقت اس کے اکرام کے لیے کوئی مخصوص چیز (Special Item) بنانی چاہیے، اسی کو "جائزہ" سے تعبیر کیا گیا) ویسے میزبانی تین دن ہے (باقی دو دن کوئی خاص تکلّف کرنے کی ضرورت نہیں ہے، جو خود کھاتا ہے وہی مہمان کو کھلائے ہاں! ایک دن مہمان کے لیے اس کا اکرام کرتے ہوئے تکلّف بھی کرے) تین دن کے بعد مہمان کا کوئی حق نہیں ہے، اس کے بعد بھی میزبان اس کو کھلاتا پلاتا رہے، تو وہ اس کی طرف سے ایک طرح کا صدقہ سمجھا جائے گا۔

(اسی بات کو دوسری روایت میں اس طرح فرمایا گیا ہے کہ) کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے کہ اپنے بھائی کے یہاں اتنا ٹھہرے کہ اپنے بھائی کو گناہ میں ڈال دے (یعنی مہمان بن کر گئے تو واپس جانے کا نام ہی نہیں لیتے، بوریا بستر لے کر فیوی کول لگا کر وہیں جم کر پڑ گئے) صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! گناہ میں کیسے ڈالے گا؟ تو حضور (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: اس کے یہاں اتنا قیام کرے کہ اس کے پاس میزبانی کے لئے کچھ بھی نہ رہے، پھر وہ بے چارہ قرض لینے یا کوئی دوسری شکل اختیار کرنے پر مجبور ہو جائے۔

افادات:- اس سے معلوم ہوا کہ مہمان کو کسی کے یہاں زیادہ سے زیادہ تین دن قیام کرنا چاہیے، اس سے زیادہ نہیں۔ ہاں! صاحبِ خانہ یا جس کے یہاں آپ گئے ہیں اس کے ساتھ آپ کے مراسم ایسے ہیں کہ وہ خود اصرار بھی کرتا ہے، اور آپ کا اس کے یہاں ٹھہرنا اس

کوناگوار نہیں گزرتا بلکہ وہ خوش ہوتا ہے ؛تواس صورت میں حکم بدل جائے گا۔ورنہ اصل حکم تو یہی ہے کہ کسی کے یہاں زیادہ سے زیادہ تین دن قیام کرے، اس سے زیادہ نہیں۔

إستحباب التبشير والتهنئة بالخير

کسی کو مبارک باد دینے کا پسندیدہ ہونا

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

فَبَشِّرۡ عِبَادِ الَّذِیۡنَ یَسۡتَمِعُوۡنَ الۡقَوۡلَ فَیَتَّبِعُوۡنَ أَحۡسَنَهٗ

مبارک باد دینا پسندیدہ ہے:

کسی کے دل کو خوش کرنا دیکھنے میں ایک چھوٹی سی چیز ہے، لیکن شریعت کی نگاہوں میں بہت بڑی نیکی ہے۔اور آدمی جن مختلف طریقوں سے نیکی حاصل کر سکتا ہے ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کوئی ایسی خوش کن خبر جو سامنے والے کے لیے مسرت اور خوشی کا باعث ہو اس کو بشارت کے طور پر سامنے والے کو سنانا؛ تا کہ اس کا جی خوش ہو، اور کسی اچھی بات پر مبارک باد دینا؛ یہ بھی اسلام کی نگاہ میں محبوب اور پسندیدہ ہے۔

اگر اس پر عمل ہو جائے!:

آج کل دلوں میں حسد، بغض اور کینہ کے نتیجہ میں ہم لوگوں کا مزاج ایسا بنا ہوا ہے کہ ہمارے ساتھ رہنے والے کسی بھائی کے یہاں کوئی ایسی بات پیش آئے جو اس کے لیے باعثِ مسرت ہو، تو ہم اس کو مبارک باد دینے میں جھجک محسوس کرتے ہیں۔ حالاں کہ ایسے موقع پر اسلام ہمیں یہ تعلیم دیتا ہے کہ آپ خوشی کے موقع پر اس کو مبارک باد دیجیے، اور اگر یہ خوشی کی اطلاع اس

تک نہیں پہنچی ہے تو آپ جلدی سے اس اطلاع کو اس تک پہنچا کر اس کا جی خوش کیجئے۔ یہ بھی ایک مسلمان کا حق ہے، اور اسلام نے یہ تعلیم دی ہے، اگر ان تعلیمات پر عمل عام ہو جائے تو اس کی وجہ سے دلوں میں ایک دوسرے کے متعلق جو میل، عداوت، بغض اور کینہ ہوتا ہے وہ سب ختم ہو جائے۔

اسلامی معاشرے کو باہم جوڑنے والی:

قدیم زمانہ میں ہمارے یہاں اس کا رواج تھا اور آج بھی جہاں سادگی ہے وہاں اس بات کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ گھروں میں جہاں قریبی تعلق ہوتا ہے وہاں بھی اس بات کا اہتمام کیا جاتا ہے، مثلاً: کسی کے یہاں بیٹا پیدا ہوا تو لوگ کوشش کرتے ہیں کہ بچہ کے باپ کو جلدی سے خوشخبری سنا کر اس سے کچھ ہدیہ وصول کریں۔ خوشخبری سنانے والے کا جی خوش کرنا بھی ثابت ہے اور اس کی بھی تاکید آئی ہے، ایسا آج کل بھی ہوتا ہے، لیکن ہم نے اس کو صرف اپنے ہی گھر کے اندر محدود کر رکھا ہے، حالاں کہ ایسا نہیں ہے، بلکہ ایک مسلمان بھائی کا رشتہ دوسرے مسلمان بھائی کے ساتھ وہی ہے جو ایک انسان کا اپنے سگے بھائی کے ساتھ ہوا کرتا ہے۔ تو جیسے وہاں اس بات کی کوشش کی جاتی ہے، وہی معاملہ اپنے مسلمان بھائی کے ساتھ بھی ہونا چاہیے۔

جیسے کسی نے ملازمت کے لیے درخواست دے رکھی تھی، اور آپ کو پتہ چل گیا کہ اس کی ملازمت لگ گئی، تو آپ فوراً بھاگے دوڑے اس کے پاس جائیے اور اس کو خوشخبری سنایئے، اس

سے اس کا جی خوش ہو جائے گا، اور وہ یہ سمجھے گا کہ اس کی اس خوشی میں آپ بھی اس کے ساتھ شریک ہیں۔ یہ چیز اسلامی معاشرے کو آپس میں جوڑنے والی ہے۔

ہمارے آداب اہلِ یوروپ نے اپنالئے:

اسلام نے یہی سب آداب ہمیں سکھائے ہیں، لیکن ہم ان آداب کو بھول گئے اور یوروپین تہذیب میں وہ لوگ انہیں آداب کو اپناتے جارہے ہیں اور خوش کن خبر کو اس انداز سے پیش کرنے کا بڑا اہتمام کرتے ہیں، حالاں کہ وہ ایک نمائش ہوتی ہے۔ ایک صاحب اپنا قصہ سنانے لگے کہ وہ ایک ملک سے دوسرے ملک گئے، جب وہاں اترے اور امیگریشن کے اندر پارسپورٹ دیا، تو چوں کہ پارسپورٹ پر ولادت کی تاریخ (Birth date) لکھی ہوئی ہوتی ہے، تو اتفاق کی بات کہ وہ جس روز وہاں پہنچے وہی ان کی تاریخِ پیدائش تھی۔ کاؤنٹر پر جس نے ان کا پارسپورٹ لیا اس نے سب سے پہلے ان کو مبارک باد دی کہ آج آپ کا برتھ ڈے (Birth day) ہے، ہماری طرف سے مبارک باد قبول کیجئے، حالاں کہ اس کا اس سے نہ کوئی رشتہ تھا، نہ وہ اس کا پڑوسی تھا، اور نہ کوئی تعلق تھا، ایک نووارد اس ملک میں گیا تھا لیکن وہ لوگ ان چیزوں کا بڑا اہتمام کرتے ہیں۔ اور آج ہم الٹا کرتے ہیں، ہمارے یہاں ان چیزوں کا اہتمام تو دور کی بات رہی، بلکہ اس بات کی کوشش ہوتی ہے کہ کسی کی خوشی کی بات کو دبایا جائے، حالاں کہ اسلام نے ہمیں یہ تعلیم دی ہے کہ کسی کی خوشی کے موقع پر آدمی خوشی کا اظہار کرے تا کہ

اپنے مسلمان بھائی کے سامنے یہ ظاہر ہو کہ میری خوشی پر وہ بھی خوش ہے،اس سے اس کی خوشی دوبالا اور دوگنی ہو جائے گی،اس کی مسرت میں اضافہ ہو جائے گا۔ اور مقصد تو یہی ہے۔ یہی چیز اسلامی معاشرے اور سماج کو قوت پہنچانے والی ہے۔

اپنا بنانے کا گُر:

پھر اس طرزِ عمل کا نتیجہ یہ بھی ہو گا کہ ایک دوسرے کی مصیبت کے موقع پر بھی وہ آپس میں کام آئیں گے۔ آپ کسی کی خوشی کے موقع پر کسی کے ساتھ شرکت کریں گے تو یقیناً آپ کی غمی کے موقع پر وہ آپ کے ساتھ شریک ہونا پسند کرے گا۔ وہ یاد رکھے گا کہ فلاں خوشی کے موقع پر آپ نے مبارک باد دی تھی،تو اگر آپ پر کوئی آڑا وقت آگیا تو وہ دوڑا ہوا آئے گا،حالاں کہ وہ ایک معمولی بات تھی کہ آپ نے ذرا سا خوشی کا اظہار کیا تھا، لیکن اس عمل سے آپ نے اس کو اپنا بنالیا۔

قرآنی دلائل:

یہی تعلیمات اور زندگی کے آداب ہیں جو ہمیں سکھائے جارہے ہیں، انہی تعلیمات کو اس باب میں بتلاتے ہیں کہ کسی کو خوشی کے موقع پر بشارت سنانا مستحب و پسندیدہ ہے،اسلام کی نگاہوں میں یہ چیز اچھی ہے، اس کو انجام دینا چاہیے،اسی کی تلقین کی گئی اور ترغیب دی گئی ہے۔

اس موقع پر قرآنِ پاک کی بہت ساری آیتیں پیش کی ہیں، جن میں بشارت کا لفظ استعمال کیا گیا ہے: ﴿فَبَشِّرْ عِبَادِ الَّذِينَ يَسْتَمِعُونَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُونَ أَحْسَنَهُ﴾ باری تعالیٰ حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) سے فرماتے ہیں کہ میرے وہ بندے جو میرے کلام کو سن کر اس کی پیروی کرتے اور اس پر عمل کا اہتمام کرتے ہیں آپ ان کو بشارت سنا دیجئے کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے اس کے احکام پر عمل کرنے کی توفیق دی، اس پر اللہ تعالیٰ آپ کو اجر و ثواب اور جنت عطا فرمائے گا۔

﴿يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُم بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَجَنَّاتٍ لَّهُمْ فِيهَا نَعِيمٌ مُّقِيمٌ﴾ جنتیوں کو اللہ تعالیٰ بشارت سنائیں گے اپنی خاص رحمتوں اور رضامندی اور باغات کی، جن میں ان کو اور بھی نعمتیں ملیں گی اور ہمیشہ کا ٹھکانہ ملے گا۔ گویا یہ وہ کام ہے جس کو خود اللہ تعالیٰ بھی کریں گے کہ اپنے بندوں کو خوش کرنے کے لیے اپنی طرف سے خوشخبریاں سنائیں گے۔ جیسے کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بیٹے کے کامیاب ہونے کی اطلاع آئی تو باپ کہتا ہے کہ کوئی اس کو نہ بتائے، میں خود بتاؤں گا۔ اس کے دل میں بیٹے کی قدر ہوتی ہے، وہ اس کو خوش کرنا اور اس کو اعزاز دینا چاہتا ہے تو اپنی طرف سے اس کو اطلاع دینے کا اہتمام کرتا ہے۔ جب باری تعالیٰ اپنے بندوں کو اعزاز دینا چاہتا ہے تو ان کو ایسی بشارت خود ہی سناتا ہے۔

﴿وَأَبۡشِرُوا بِالۡجَنَّةِ الَّتِي كُنتُمۡ تُوعَدُونَ﴾ قیامت کے روز باری تعالیٰ اہلِ ایمان سے فرمائیں گے: خوشخبری سن لو اس جنت کی جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا کہ اگر نیک کام کروگے تو جنت ملے گی، تو آج دیکھ لو، یہ مل رہی ہے، اب خوش ہو جاؤ۔

﴿فَبَشَّرۡنَاهُ بِغُلَامٍ حَلِيمٍ﴾ حضرت ابراہیم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کو بیٹا ہونے کی خوشخبری فرشتوں کے ذریعہ سنائی اس کو باری تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿فَبَشَّرۡنَاهُ﴾ ہم نے بشارت دی۔ یعنی یہ اطلاع دینے کے لیے اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو بھیجا تھا، گویا بشارت دینے والے اللہ تعالیٰ ہی ہیں۔

قرآنِ پاک کی ان آیتوں کے ذریعہ سے یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ دیکھو! اللہ تعالیٰ کی ذات تو بے نیاز ہے، لیکن اپنے خلیل کے ساتھ محبت کا اظہار کرنے اور ان کے اعزاز کے واسطے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کتنا اہتمام کیا جارہا ہے! تو ہمیں بھی آپس میں ان چیزوں کا اہتمام کرنا چاہیے، یہی چیز آپس کے تعلقات کو بڑھانے والی اور محبت میں اضافہ کرنے والی ہے۔

﴿وَلَقَدۡ جَاءَتۡ رُسُلُنَا إِبۡرَاهِيمَ بِالۡبُشۡرَىٰ﴾ ہمارے بھیجے ہوئے فرشتے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس بشارت اور خوشخبری لے کر آئے۔ باری تعالیٰ نے ان کو خوش خبری سنانے کے لیے باقاعدہ فرشتے بھیجے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر آپ بھی کسی کو کوئی خوش خبری سنانے کے لیے ٹیلیفون، خط، ٹیلی گرام، یا آدمی بھیجنے کا اہتمام کریں؛ تو یہ ثابت ہے، خود باری تعالیٰ قرآنِ پاک میں فرمارہے ہیں۔

﴿وَامْرَأَتُهُ قَآئِمَةٌ فَضَحِكَتْ فَبَشَّرْنَاهَا بِإِسْحَقَ وَمِن وَّرَاء إِسْحَقَ يَعْقُوبَ﴾ فرشتے جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے یہاں مہمان بن کر بیٹے کی بشارت سنانے کے لیے آئے؛ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اہلیہ حضرت سارہ بھی مہمانوں کی خدمت کے لیے (پردہ کی آڑ میں) موجود تھیں، وہ ہنسیں، اور ہم نے ان کو حضرت اسحاق کے پیدا ہونے کی بشارت سنائی اور ان کے یہاں جو بیٹا پیدا ہوگا اس کا نام یعقوب ہوگا۔

﴿فَنَادَتْهُ الْمَلآئِكَةُ وَهُوَ قَائِمٌ يُصَلِّي فِي الْمِحْرَابِ أَنَّ اللهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيَى﴾ اللہ تعالیٰ نے حضرت زکریا علیہ السلام کے یہاں بیٹا یحییٰ پیدا ہونے کی بشارت فرشتوں کے ذریعہ سے دلوائی۔

یہ ساری آیتیں لا کر بتلانا چاہتے ہیں کہ یہ خوشخبری سنانا کتنا عمدہ کام ہے کہ اللہ تعالیٰ خود بھی اس کا اہتمام کررہے ہیں، تو ظاہر ہے ہمیں بھی ان چیزوں کا اہتمام کرنا چاہیے۔

ایک موتی کے مکان کی خوشخبری:

حدیث ۷۰۸:-

عن أَبِي إبراهيم، ويقال: أَبُو محمد، ويقال: أَبُو معاوية عبد اللهِ بن أَبِي أوفى أنّ رسولَ اللهِ (ﷺ) بَشَّرَ خَدِيجَةَ رضی اللہ عنہا بِبَيْتٍ في الجَنَّةِ مِنْ قَصَبٍ لاَ صَخَبَ فِيهِ، وَلاَ نَصَبَ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

((القَصَبُ)): هُنَا اللُّؤْلُؤُ المُجَوَّفُ. وَ((الصَّخَبُ)): الصِّياحُ وَاللَّغَطُ. وَ((النَّصَبُ)): التَّعَبُ.

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن ابی اَوفیٰ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبیٔ کریم (ﷺ) نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو جنت کے اندر ایک ایسے مکان کی خوشخبری سنائی جو ایسے موتی کا بنا ہوا ہو گا جو اندر سے کھوکھلا ہو گا (یعنی اس مکان کے چاروں طرف موتی کا خول چڑھا ہوا ہو گا) جس میں نہ کوئی شور شغب ہو گا اور نہ کوئی تھکن ہو گی (بڑے سکون سے وہاں زندگی گزرے گی)

افادات:- نبیٔ کریم (ﷺ) جب غار حراء میں عبادت میں مشغول ہوتے تھے تو موقع بموقع حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا آپ (ﷺ) کو ٹفن پہنچانے کا کام کرتی تھیں یعنی حضور (ﷺ) کو توشہ پہنچاتی تھیں۔ روایتوں میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت جبرئیل علیہ السلام غارِ حراء میں نبیٔ کریم (ﷺ) کے پاس موجود تھے اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا توشہ لے کر آرہی تھیں، حضرت جبرئیل علیہ السلام نے جب ان کو آتے ہوئے دیکھا تو حضور (ﷺ) سے کہا: باری تعالیٰ ان کو سلام فرماتے ہیں، آپ ان کو سلام پہنچا دیجئے اور بشارت سنا دیجئے کہ باری تعالیٰ ان کو جنت میں ایک ہی موتی سے بنا ہوا محل عطا فرمائیں گے، ایسا محل جس میں کوئی شور و شغب اور تھکن نہیں ہو گی۔ (بخاری شریف: باب تزویج النبی (ﷺ) خدیجۃ و فضلھا)

اس سے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا مقام معلوم ہوتا ہے۔ اور اُمہات المؤمنین میں ان کا مقام سب سے اونچا ہے، حضورِ اکرم (ﷺ) ہمیشہ ان کی تعریف میں رطب اللسان رہتے تھے۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے مناقب:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ مجھے نبیٔ کریم (ﷺ) کی ازواج میں کسی عورت پر اتنی غیرت نہیں آتی جتنی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا پر آتی تھی، حالاں کہ ان کا انتقال میرے آپ (ﷺ) کے نکاح میں آنے سے پہلے ہوچکا تھا، لیکن حضور (ﷺ) ان کا اتنی کثرت سے تذکرہ فرماتے تھے کہ مجھے ان پر رشک آتا تھا اور غیرت آتی تھی۔ (بخاری شریف: باب تَزوِيجُ النَّبِيِّ (ﷺ) خَدِيجَةَ وَفَضْلُهَا) حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا آپ (ﷺ) کے نکاح میں آنے سے پہلے باری باری دو مردوں کے نکاح میں رہی تھیں، جس وقت حضور (ﷺ) کے نکاح میں آئیں اس وقت آپ (ﷺ) کی عمر شریف پچیس (۲۵) سال تھی اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی عمر چالیس (۴۰) سال تھی۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ کبھی حضورِ اکرم (ﷺ) حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا تذکرہ بڑی محبت سے فرماتے تو میں کہتی: اُس بڑھیا کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایک جوان عورت عطا فرمائی ہے، تو حضور (ﷺ) فرماتے: میری تمام اولاد انہی سے ہیں (بخاری شریف: باب تزوِيجُ النَّبِيِّ (ﷺ) خَدِيجَةَ وَفَضْلُهَا) حضورِ اکرم (ﷺ) کی تمام اولاد سوائے حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کے انہی سے ہیں۔ حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کے بطن سے تھے، باقی چاروں بیٹیاں اور سب صاحبزادے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے ہیں۔

اور حضورِ اکرم (ﷺ) پر سب سے پہلے ایمان لانے والی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا۔ حضورِ اکرم (ﷺ) کو تسلی دینے والی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا۔ اپنا سب مال حضور (ﷺ) کے لیے قربان کرنے والی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا۔ انہی کی وجہ سے نبیٔ کریم (ﷺ) کو بڑی تقویت رہی۔ ان کے انتقال والے سال ہی ابوطالب کا بھی انتقال ہوا جس کی وجہ سے حضورِ اکرم (ﷺ) کو بڑی پریشانیوں کا سامنا ہوا۔

حضورِ اکرم (ﷺ) نے جنت کی بشارتیں سنائیں:

حدیث ۷۰۹:-

وعن أَبي موسىٰ الأشعرى رضی اللہ عنہ أَنَّهُ تَوَضَّأَ فى بَيْتِهِ، ثُمَّ خَرَجَ، فَقَالَ: لَأَلْزَمَنَّ رسولَ الله (ﷺ) . وَلَأَكُونَنَّ مَعَهُ يَوْمِي هَذَا، فَجَاءَ الْمَسْجِدَ، فَسَأَلَ عَنِ النَّبِيِّ (ﷺ) . فقالوا: وجَّهَ هاهُنَا، قَالَ: فَخَرَجْتُ عَلَى أَثَرِهِ أَسْأَلُ عَنْهُ، حَتَّى دَخَلَ بِئْرَ أَرِيسٍ، فَجَلَسْتُ عِندَ البَابِ حَتَّى قضى رسولَ الله (ﷺ) حاجتهُ وتوضأ، فقمتُ إليهِ فإذا هو قد جلَسَ على بئرِ أريسٍ وتوَسَّطَ قُفَّهَا، و كشَفَ عنْ ساقيهِ ودلاّهُما فى البئرِ، فسلمتُ عليهِ ثمَّ انصَرَفتُ، فجلستُ عِندَ البابِ، فقُلْتُ: لَأَكُونَنَّ بَوَّابَ رسولِ اللهِ (ﷺ) الْيَوْمَ، فَجَاءَ أَبُو بَكْرٍ رضی اللہ عنہ فَدَفَعَ الْبَابَ، فقلتُ: مَنْ هَذَا؟ فَقَالَ: أَبُو بَكْرٍ، فقلتُ: عَلَى رِسْلِكَ، ثُمَّ ذَهبْتُ، فقلتُ: يَا رسول الله، هَذَا أَبُو بَكْرٍ يَستَأْذِنُ. فَقَالَ: ائْذَنْ لَهُ وَبَشِّرْهُ بِالْجَنَّةِ. فَأَقْبَلْتُ حَتَّى قُلْتُ لِأَبِي بَكْرٍ: ادْخُلْ وَرسول الله (ﷺ) يُبَشِّرُكَ بِالْجَنَّةِ. فَدَخَلَ أَبُو بَكْرٍ حَتَّى جَلَسَ عَنْ يَمِينِ النَّبِيِّ (ﷺ) مَعَهُ فِى الْقُفِّ، وَدَلَّى رِجْلَيْهِ فِى الْبِئْرِ كَمَا صَنَعَ رسول الله (ﷺ)، وَكَشَفَ عَنْ سَاقَيْهِ، ثُمَّ رَجَعْتُ وَ جَلَسْتُ، وَقَدْ تَرَكْتُ أَخِي يَتَوَضَّأُ وَيَلْحَقُنِي، فقلتُ: إِنْ يُرِدِ الله

بِفُلانٍ - يُرِيدُ أَخَاهُ - خَيْراً يَأْتِ بِهِ. فَإِذَا إِنْسَانٌ يُحَرِّكُ الْبَابَ، فقلتُ: مَنْ هَذَا؟ فَقَالَ: عُمَرُ بن الخَطّابِ، فقلتُ: عَلَى رِسْلِكَ، ثُمَّ جِئْتُ إِلَى رسول الله (ﷺ)، فَسَلَّمْتُ عَلَيْهِ وَقُلْتُ: هَذَا عُمَرُ يَسْتَأْذِنُ. فَقَالَ: ائْذَنْ لَهُ وَبَشِّرْهُ بالجَنَّةِ. فَجِئْتُ عُمَرَ، فقلتُ: أَذِنَ وَيُبَشِّرُكَ رسول الله (ﷺ) بِالجَنَّةِ، فَدَخَلَ فَجَلَسَ مَعَ رسول الله (ﷺ) فِي القُفِّ عَنْ يَسَارِهِ وَدَلَّى رِجْلَيْهِ فِي البِئْرِ، ثُمَّ رَجَعْتُ فَجَلَسْتُ، فَقُلْتُ: إِنْ يُرِدِ اللهُ بِفُلانٍ خَيْراً - يَعْنِي أَخَاهُ - يَأْتِ بِهِ، فَجَاءَ إِنْسَانٌ فَحَرَّكَ الْبَابَ. فَقُلْتُ: مَنْ هَذَا؟ فَقَالَ: عُثْمَانُ بن عَفَّانَ. فقلتُ: عَلَى رِسْلِكَ، وجِئْتُ النَّبِيَّ (ﷺ) فأَخْبَرْتُهُ، فقالَ: ائْذَنْ لَهُ وَبَشِّرْهُ بِالجَنَّةِ مَعَ بَلْوَى تُصِيبُهُ. فَجِئْتُ، فقلتُ: ادْخُلْ وَيُبَشِّرُكَ رسولُ الله (ﷺ) بِالجَنَّةِ مَعَ بَلْوَى تُصِيبُكَ فَدَخَلَ فَوجَدَ الْقُفَّ قَدْ مُلِئَ، فجلس وِجَاهَهُمْ مِنَ الشِّقِّ الآخرِ.

قَالَ سَعِيدُ بْنُ الْمُسَيَّبِ: فَأَوَّلْتُهَا قُبُورَهُمْ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

وزادفي رواية: وأمرني رسولُ الله (ﷺ) بحفظِ الباب. وفيها: أَنَّ عُثْمَانَ حِينَ بَشَّرَهُ حَمِدَ اللهَ تَعَالَى، ثُمَّ قَالَ: اللهُ الْمُسْتَعَانُ.

ترجمہ:- حضرت ابوموسیٰ اَشعری رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ اپنے گھر میں وضو کیا، پھر گھر سے باہر آئے اور اپنے جی میں سوچا کہ آج کے پورے دن میں حضورِاکرم (ﷺ) کے ساتھ ہی رہوں گا۔چناں چہ اسی ارادہ سے وہ مسجدِ نبوی میں حاضر ہوئے، لوگوں سے پوچھا: حضور (ﷺ) کہاں ہیں ؟ لوگوں نے بتلایا کہ اس طرف تشریف لے گئے ہیں۔ حضرت ابوموسیٰ اَشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جو سمت مجھے بتلائی گئی تھی مَیں اس طرف چلا اور لوگوں سے پوچھتا جاتا تھا کہ حضور اس طرف آئے؛ تو کہاں ہیں ؟ لوگوں نے بتایا کہ حضور (ﷺ) بیرِ اَریس میں داخل ہوئے ہیں (مسجد قباء کے سامنے ایک باغ تھا اسی میں ایک کنواں تھا،

اس کنویں کا نام بیئرِ اَرِیس تھا نبیٔ کریم (ﷺ) کبھی کبھار اس باغ میں تشریف لے جاتے اوراس کنویں کا پانی نوش فرماتے اوراس کنویں کے کنارے سے اپنے پاؤں کنویں کے اندر لٹکا کر سکون و راحت حاصل کرنے کے لیے بیٹھتے،اس روز بھی حضور (ﷺ) وہیں تشریف لے گئے تو حضرت ابو موسیٰ اَشعری رضی اللہ عنہ بھی وہاں پہنچ گئے۔وہ فرماتے ہیں کہ) مَیں اس باغ کے پاس پہنچ کراس کے دروازے پر بیٹھ گیا،نبیٔ کریم (ﷺ) اسی باغ میں کچھ دور اپنی حاجت پوری فرمانے کے لیے تشریف لے گئے تھے،یہاں تک کہ جب آپ قضائے حاجت کے بعد واپس تشریف لائے اوروضو فرمایاتو مَیں اُٹھ کر حضور کے پاس پہنچا،اس وقت حضورِاکرم (ﷺ) کنویں پر آکر تشریف فرما ہو چکے تھے،اور آپ نے اس کے ایک طرف بیٹھ کراپنی پنڈلیاں کھول کر کنویں میں پاؤں لٹکا رکھے تھے۔مَیں نے سلام کیااور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! اگر آپ اجازت دیں تو مَیں پہرہ داری کروں کہ باغ کے دروازہ پر بیٹھوں اورآپ کی اجازت کے بغیر کسی کو اندر نہ آنے دوں۔ حضور (ﷺ) نے فرمایا:ٹھیک ہے۔دوسری روایت میں ہے کہ خود حضور (ﷺ) نے ان کو دربانی کا حکم دیا۔چناں چہ وہ دروازہ کے پاس بیٹھ گئے، اور اپنے جی میں طے کرلیا کہ آج میں حضور (ﷺ) کی دربانی کے فرائض انجام دوں گا۔کچھ دیر بعد حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ تشریف لائےاور دروازہ کو دھکا دیا۔مَیں نے پوچھا: کون؟انہوں نے کہا: ابو بکر۔مَیں نے کہا: آپ ٹھہر جایئے، ابھی اندر نہیں آسکتے،پہلے میں حضورِاکرم (ﷺ) سے اجازت لے لوں۔پھر میں حضور (ﷺ) کے پاس گیا اورعرض کیا: یارسول اللہ!ابو بکراندرآنے کی اجازت چاہتے ہیں۔حضورِاکرم (ﷺ) نے فرمایا: ان کواندرآنے کی اجازت دو،اورجنت کی خوشخبری بھی سناؤ(بس!یہاں تو یہ روایت اسی بات کو بتلانے کے لیے لائے ہیں کہ آپ نے خوشخبری سنانے کا فرمایا)حضرت ابو موسیٰ اَشعریؓ فرماتے ہیں : مَیں دروازہ

کی طرف آیااور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے کہا: اندر تشریف لائیے اور حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے آپ کو جنت کی خوشخبری دی ہے۔ چناں چہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اندر آئے اور حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کنویں کے جس کنارے پر پاؤں لٹکائے ہوئے بیٹھے تھے، وہیں آکر حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کی دائیں طرف بیٹھ گئے، اورانہوں نے بھی اپنے پاؤں اسی طرح کنویں کے اندر لٹکادیئے جس طرح حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے لٹکائے تھے اور اپنی پنڈلیاں بھی اسی طرح کھول دیں جس طرح حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کھولی تھیں۔ حضرت ابو موسیٰ کہتے ہیں: پھر مَیں کنویں کے پاس سے لوٹ کر دروازہ کے پاس آیا اور بیٹھ گیا (چوں کہ ان کو تو آج دربانی کرنی تھی) حضرت ابو موسیٰ کہتے ہیں: جس وقت مَیں گھر سے وضو کرکے نکلا تھا تو اپنے بھائی کو وضو کرتا ہوا چھوڑ آیا تھا، اس لیے میں نے اپنے جی میں سوچا کہ آج اگر اللہ تعالیٰ کو میرے بھائی کی بھلائی منظور ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو یہاں ضرور لائیں گے، اس لیے کہ آج تو حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) جنت کی بشارت سنا رہے ہیں، کاش! وہ بھی آجائے (اس سے معلوم ہوا کہ کوئی آدمی اپنے متعلقین میں سے کسی کے لیے ایسی چیز کی تمنا کرے تو پسندیدہ ہے) ابھی میں دل میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ دیکھا کہ کوئی دروازے کو دھکا دے رہا ہے۔ میں نے پوچھا: بھائی! کون ہو؟ انہوں نے کہا: عمر بن خطاب ہوں۔ حضرت ابو موسیٰ نے کہا: ٹھہر جائیے، پھر حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس حاضر ہوا اور اطلاع دی کہ حضرت عمر دروازہ پر ہیں اور اندر آنے کی اجازت چاہتے ہیں۔ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: ان کو اندر آنے کی اجازت دیدو اور ان کو بھی جنت کی خوشخبری سنادو۔ مَیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور کہا کہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اندر آنے کی اجازت دی اور آپ کو جنت کی بشارت ارشاد فرمائی۔ چناں چہ وہ داخل ہوئے اور حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بائیں طرف بیٹھ گئے، اور انہوں نے بھی اپنے پاؤں کنویں میں لٹکادیئے۔ حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: پھر مَیں دروازہ کے پاس آیا اور بیٹھ گیا اور دل میں وہی تمنا کرنے لگا کہ کاش! میرا بھائی آجاتا، آج بڑا اچھا موقع ہے، اگر اللہ تعالیٰ کو اس کے لیے خیر منظور ہے تو ضرور اس کو بھیج

دیں گے۔اتنے میں کوئی آدمی آیااوردروازہ کو ہلانے لگا۔میں نے پوچھا:کون ہو؟ انہوں نے جواب دیا:میں عثمان بن عفان ہوں۔میں نے ان سے بھی کہا: ٹھہر جایئے،ابھی آپ اندر نہیں آسکتے۔اس کے بعد مَیں حضورِاکرم (ﷺ) کے پاس حاضر ہوا اوراطلاع کی۔حضورِاکرم (ﷺ) نے فرمایا:ان کواندرآنے کی اجازت دو اورجنت کی بشارت سناؤ اس آزمائش کے ساتھ جو اللہ تعالیٰ ان کی کریں گے۔مَیں نے کہا:اندر آجایئے اور حضوراکرم (ﷺ) آپ کو جنت کی بشارت سنارہے ہیں اس آزمائش کے ساتھ جو آپ کو پہنچنے والی ہے۔ دوسری روایت میں ہے کہ بشارت سن کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء فرمائی اور کہا اللہ تعالیٰ ہی مدد فرمانے والا ہے۔جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اندر تشریف لائے تو دیکھا کہ حضورِاکرم (ﷺ) کنویں کے جس کنارہ پر تشریف فرما تھے وہ بھر چکا تھا، حضور کے دائیں بائیں حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ بیٹھ چکے تھے،وہاں بیٹھنے کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی،اس لئے کنویں کے سامنے والے دوسرے کنارہ پر جو جگہ خالی تھی وہ وہاں بیٹھ گئے۔

اس روایت کے نقل کرنے والے حضرت سعید بن المسیب رحمۃ اللہ علیہ (جو بڑے تابعی ہیں) فرماتے ہیں کہ اس روایت کا مطلب میں نے یہ لیا کہ ان حضرات کو جہاں جہاں بیٹھنے کا موقع ملا،وہ ان کی قبروں سے عبارت ہے۔

افادات:۔اللہ تعالیٰ نے حضراتِ شیخین رضی اللہ عنہما کی قبریں تو نبیٔ کریم (ﷺ) کے ساتھ اسی حجرۂ شریفہ میں بننے دیں ،اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی قبر جنت البقیع میں ہے،لیکن اگر آپ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی قبر پر جاکر کھڑے رہیں اور دیکھیں تو وہاں سے گنبدِ خضراء بالکل سامنے سیدھ میں نظر آئے گا،ذرا بھی اِدھر اُدھر نہیں ہے۔

میرے پہلے سفرِ حج کا واقعہ:

مَیں پہلی مرتبہ جب حج میں گیا تھا تو وہاں ایک بڑے صالح بزرگ تھے، مدت سے وہاں جماعت کے کام میں لگے ہوئے تھے، اور مدینہ منورہ کی ساری زیارت گاہوں سے خوب واقف تھے، اور چوں کہ اس سے اگلے سال ۹ےئہ میں ایک واقعہ پیش آیا تھا جس کی وجہ سے جماعت کے کام کرنے والوں پر بڑی سختی اور نگرانی تھی۔ جب مَیں مدینہ منورہ پہنچا تو میں نے ساتھیوں سے کہا کہ مسجدِ نبوی اور یہاں کی دوسری تاریخی جگہوں کی زیارت کرنا چاہتا ہوں، اگر کوئی واقف کار آدمی ہو تو رہنمائی ملے۔ مولانا اسماعیل صاحب بدات اور دوسرے ایک دو آدمیوں نے کہا کہ دَھار (ﷺ) (مہاراشٹر کے ایک علاقہ کا نام ہے) کے فلاں بڑے میاں ہیں وہ بہت اچھا بتلائیں گے، ان سے ملو۔ مَیں ان سے ملا، انہوں نے کہا: آج کل میری نگرانی ہو رہی ہے، تم اگر میرے سامنے بیٹھو گے تو تم بھی پکڑے جاؤ گے، اس لیے میرے پاس اس طرح بیٹھنا جیسے کوئی آدمی صف میں بیٹھتا ہے، مَیں تھوڑی تھوڑی چیزیں بتاتا رہوں گا۔ وہ مسجدِ نبوی کی چیزیں بتاتے اور پھر کہتے کہ جاؤ! تم دیکھ کر آؤ، مَیں دیکھ کر آتا اور رپورٹ دیتا کہ ایسی ایسی ہے، تو وہ کہتے کہ ہاں! ٹھیک ہے۔

ایک مرتبہ انہوں نے یہی قصہ سنایا، لیکن انہوں نے اس میں ایک چیز کا اضافہ کیا تھا، مجھے تو آج تک کسی روایت میں وہ چیز نہیں ملی، مَیں تلاش میں بھی ہوں کہ مل جائے۔ وہ اضافہ یہ تھا کہ اس کے بعد ایک اور آدمی آئے اور دروازہ کھٹکھٹایا، حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ

نے پوچھا: کون ہو؟ آنے والے نے کہا: مَیں علی بن اَبی طالب ہوں۔ انہوں نے کہا: یہیں ٹھہرو، مَیں حضورِ اکرم (ﷺ) سے اجازت لے لوں۔ حضرت ابو موسیٰ اَشعری حضور (ﷺ) کے پاس پہنچے اور کہا کہ حضرت علیؓ اندر آنے کی اجازت چاہتے ہیں۔ حضورِ اکرم (ﷺ) نے فرمایا: ان کو جنت کی بشارت سنادو اور اندر آنے کی اجازت نہیں ہے، چناں چہ ان کی قبر مدینہ منورہ میں نہیں بنی۔

حضرت سعید بن مسیب رحمۃ اللہ علیہ نے ان حضرات کی قبور کی جو تعبیر فرمائی وہ یہ ہے کہ حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کی قبریں تو بالکل حضور (ﷺ) کے ساتھ بنیں، حضرت عثمانؓ ساتھ میں نہیں ہیں، لیکن مدینہ منورہ ہی میں بالکل سامنے ہیں، اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی قبر مدینہ منورہ میں نہیں بن پائی۔

خیر! یہاں تو بشارت سنانے کی مناسبت سے یہ روایت پیش کی ہے کہ دیکھو! حضرت اَبو موسیٰ اَشعری رضی اللہ عنہ حضورِ اکرم (ﷺ) کی طرف سے جاکر یہ خوشخبریاں بڑے خوش ہو کر سناتے رہے۔ انہوں نے یہ نہیں سوچا کہ مجھے تو یہ خوشخبری نہیں دی جارہی ہے تو پھر مَیں جاکر دوسروں کو کیوں سناؤں۔ ہمارے جیسے ہوتے تو ایسا ہی سوچتے کہ مجھے تو کوئی بشارت نہیں مل رہی، تو پھر یہ سارے چکر اور آنٹے پھیرے (چکر لگانا) کیوں مارتا رہوں

یقین سے کلمہ پڑھنے پر جنت کی بشارت:

حدیث ۱۰۷:-

وعن أبي هريرة رضی اللہ عنہ قَالَ: كُنَّا قُعُوداً حَوْلَ رسولِ الله (ﷺ) وَمَعَنَا أَبُو بَكْرٍ وَعُمَرُ رضی اللہ عنہما في نَفَرٍ، فَقَامَ رسولُ الله (ﷺ) مِنْ بَيْنِ أَظْهُرِنَا فَأَبْطَأَ عَلَيْنَا، وَخَشِينَا أنْ يُقْتَطَعَ دُونَنَا وَفَزِعْنَا فَقُمْنَا، فَكُنْتُ أوَّلَ مَنْ فَزِعَ. فَخَرَجْتُ أَبْتَغِي رسولَ الله (ﷺ) حَتَّى أتَيْتُ حَائِطاً للأنصَارِ لِبَنِي النَّجَارِ. فَدُرْتُ بِهِ هَلْ أجِدُ لَهُ بَاباً؟ فَلَمْ أجِدْ! فَإِذَا رَبيعٌ يَدْخُلُ فِي جَوْفِ حَائِطٍ مِنْ بِئْرٍ خَارِجَه -وَالرَّبِيعُ: الجَدْوَلُ الصَّغِيرُ- فَاحْتَفَرْتُ، فَدَخَلْتُ عَلَى رسولِ الله (ﷺ) فَقَالَ: ((أَبُو هُرَيْرَةَ؟)) فقلتُ: نَعَمْ، يَا رسولَ اللهِ، قَالَ: ((مَا شَأنُكَ؟)) قُلْتُ: كُنْتَ بَيْنَ أَظْهُرِنَا فَقُمْتَ فَأبْطَأتَ عَلَيْنَا، فَخَشِينَا أنْ تُقْتَطَعَ دُونَنَا، ففزعنا، فَكُنْتُ أوّلَ مَنْ فَزِعَ، فَأَتَيْتُ هَذَا الحَائِطَ، فَاحْتَفَرْتُ كَمَا يَحْتَفِزُ الثَّعْلَبُ، وهؤلاء النَّاسُ وَرَائِي. فَقَالَ: يَا أَبَا هُرَيْرَةَ. وَأَعْطَانِي نَعْلَيْهِ، فَقَالَ: اذْهَبْ بِنَعْلَيَّ هَاتَيْنِ، فَمَنْ لَقِيتَ مِنْ وَرَاءِ هَذَا الحَائِطِ يَشْهَدُ أنْ لا إلهَ إلاَّ اللهُ مُسْتَيْقِناً بِهَا قَلْبُهُ، فَبَشِّرْهُ بِالجَنَّةِ..... وَذَكَرَ الحديثَ بطوله.. (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ ہم نبیٔ کریم (ﷺ) کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے، حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما بھی کچھ صحابہ کے ساتھ موجود تھے کہ اچانک آپ (ﷺ) ہمارے درمیان سے اُٹھے اور آبادی سے باہر تشریف لے گئے، جب آپ نے واپس آنے میں دیر کردی تو سب کو فکر لاحق ہوئی کہ پتہ نہیں کیا بات ہوئی، اس لیے سب آپ (ﷺ) کی تلاش و جستجو میں نکلے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سب سے پہلے بے چینی مجھے پیدا ہوئی تھی اس لئے میں آپ کو تلاش کرنے کے لئے نکلا، یہاں تک کہ انصار کے قبیلہ بنو نجّار کا ایک باغ تھا اُس کے متعلق مجھے خیال ہوا کہ آپ

شاید اندر ہوں گے، تو مَیں اندر جانے کا راستہ ڈھونڈنے کے لیے اس باغ کے چاروں طرف چکّر لگانے لگا، لیکن مجھے راستہ نہیں ملا، اس باغ میں پانی جانے کے لیے ایک چھوٹی سی نہر تھی جو مجھے نظر آئی تو میں نے اپنے جسم کو سکیڑا، جیسے لومڑی سکیڑتی ہے ،اور اس چھوٹی سی نہر سے اندر داخل ہوا تو دیکھا کہ حضورِ اکرم (ﷺ) اس باغ میں تشریف فرماہیں۔ جب حضور (ﷺ) نے مجھے دیکھا تو پوچھا: ابوہریرہ ہو؟ میں نے عرض کیا: جی ہاں! اے اللہ کے رسول۔ پوچھا: کیا بات ہے؟ یہاں کیوں آئے؟ مَیں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ ہمارے درمیان تشریف فرما تھے، پھر اچانک اُٹھ گئے اور واپس آنے میں دیر ہوگئی تو ہم سب پریشان ہوگئے، اور ہمیں اندیشہ ہوا کہ کہیں آپ کو کوئی تکلیف نہ پہنچی ہو، اس لئے ہم سب بے چین ہوگئے اور سب سے پہلے بے چینی مجھے ہوئی، اس لئے میں اس باغ میں اپنے جسم کو اس طرح سکیڑ کر اندر داخل ہوا جیسے لومڑی کسی جگہ گھستی ہے۔ دوسرے لوگ بھی میرے پیچھے پیچھے آرہے ہیں (جب نبی ٔکریم (ﷺ) نے حضراتِ صحابہ ٔکرام رضی اللہ عنھم کی اس بے چینی کو دیکھا اور ظاہر ہے کہ نبی ٔکریم (ﷺ) کے ساتھ تعلق ومحبت کی بنا پر یہ بے چینی پیدا ہوئی تھی، تو نبی ٔکریم (ﷺ) نے چاہا کہ اس کی تلافی ہوجائے اور ان کا جی خوش ہوجائے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ) حضور (ﷺ) نے مجھے اپنے نعلین مبارک علامت اور نشانی کے طور پر عطا فرمائے اور ارشاد فرمایا: میرے یہ دونوں جوتے لے کر جاؤ اور اس باغ کے باہر جو بھی ایسا آدمی تمہیں ملے جو دل کے یقین کے ساتھ ”لاالٰہ الا اللہ“ کا اقرار کرتا ہو؛ اس کو جنت کی بشارت سنادینا۔

افادات:۔یہ روایت پہلے بھی آچکی ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ وہ نعلین مبارک لے کر باہر نکلے، سب سے پہلے ملاقات حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ہوگئی۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ تو خوشی

خوشی جوتے لے کر جارہے تھے۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا: ابوہریرہ! کیا بات ہے؟ کہا: نبیٔ کریم (ﷺ) کے یہ جوتے ہیں جو آپ نے مجھے عنایت فرمائے ہیں اور مجھے یہ حکم دیا ہے کہ جو بھی لا الٰہ الّا اللہ کا سچے دل سے اقرار کرنے والا تمھیں ملے؛ اس کو جنت کی بشارت سنادو؛ تو لیجئے میں آپ کو جنت کی بشارت سناتا ہوں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ٹھہرو! اور واپس چلو۔ اب حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو تو حضورِ اکرم (ﷺ) نے بھیجا تھا اس لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے کہنے سے واپس تھوڑے ہی لوٹتے، انہوں نے واپس لوٹنے میں تامّل کیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کے سینے پر ایک ہاتھ مارا جس سے وہ نیچے زمین پر گر پڑے۔ اب دیکھا کہ واپس لوٹنا ہی پڑے گا، لٰہذا لوٹے۔ آگے حضرت ابوہریرہ اور پیچھے حضرت عمر۔ حضور (ﷺ) کے پاس پہنچے، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ رو رہے تھے اور حضور (ﷺ) سے عرض کیا کہ: آپ کے ارشاد کے مطابق میں تو جارہا تھا، راستہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ مل گئے اور انہوں نے میرے سینے پر ایسے زور سے ہاتھ مارا کہ میں تو نیچے گر گیا اور مجھ سے کہا کہ ایسی بشارت مت سناؤ اور واپس لوٹو۔ اتنے میں حضرت عمرؓ بھی پہنچ گئے اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! کیا آپ نے ان کو اپنے جوتے عنایت فرما کر بھیجا تھا؟ حضور (ﷺ) نے فرمایا: جی ہاں۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا: ایسی بشارت سنانے کے لیے بھیجا تھا؟ حضور (ﷺ) نے فرمایا: جی ہاں۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ایسا نہ کیجئے، لوگوں کو عمل کرنے دیجئے، کیوں کہ اگر صرف دل کے یقین کے ساتھ کلمہ پڑھ لینے پر جنت کی بشارت سن لیں گے، تو ہو سکتا ہے کہ عمل کے معاملہ میں کمزوری آجائے، لوگ

یوں سوچنے لگیں کہ جنت تو مل ہی گئی ہے، حالاں کہ جنت کے تو بہت سے درجات ہیں، اس لیے یہ بشارت نہ سنایئے۔ تو حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: ٹھیک ہے، اگر مناسب نہیں ہے تو بشارت سنانے کی ضرورت نہیں ہے۔

نوٹ:- یہ قصہ حدیث کے اصلاحی مضامین، جلد: ۷/ امید کے بیان میں آیا تھا، وہاں تفصیلی وضاحت کر چکا ہوں۔

مختصر آپ بیتی از حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ:

حدیث ۱۱۷:-

وعن ابن شماسة، قَالَ: حَضَرْنَا عَمْرَو بنَ العَاصِ رضی اللہ عنہ وَهُوَ فِی سِيَاقَةِ الْمَوْتِ، فَبَكَى طَوِيلاً، وَحَوَّلَ وَجْهَهُ إِلَى الجِدَارِ، فَجَعَلَ ابْنُهُ، يَقُولُ: يَا أَبَتَاهُ! أَمَا بَشَّرَكَ رسولُ الله (صلی اللہ علیہ وسلم) بكَذَا ؟ أَمَا بَشَّرَكَ رسولُ الله (صلی اللہ علیہ وسلم) بِكَذَا ؟ فَأَقْبَلَ بِوَجْهِهِ، فَقَالَ: إنَّ أَفْضَلَ مَا نُعِدُّ شَهَادَةُ أَنْ لا إلٰهَ إلاَّ الله، وَأَنَّ مُحَمَّداً رسول اللهِ، إنِّي قَدْ كُنْتُ عَلَى أَطْبَاقٍ ثَلاَثٍ: لَقَدْ رَأَيْتُنِی وَمَا أَحَدٌ أَشَدُّ بُغْضاً لرسولِ الله (صلی اللہ علیہ وسلم) مِنِّی، وَلاَ أَحبَّ إِلَيَّ مِنْ أَنْ أكُونَ قدِ اسْتَمْكَنْتُ مِنْهُ؛ فَقَتَلْتُه، فَلَوْ مُتُّ عَلَى تلك الحَالِ، لَكُنْتُ مِنْ أَهْلِ النَّارِ. فَلَمَّا جَعَلَ اللهُ الإسلامَ فی قَلْبِی، أَتَيْتُ النبيَّ (صلی اللہ علیہ وسلم) فقُلْتُ: ابسُطْ يَمِينَكَ فَلأُبَايِعكَ، فَبَسَطَ يَمِينَهُ، فَقَبَضْتُ يَدِی، فَقَالَ: ((مَا لَكَ يَا عَمْرُو ؟)) قلتُ: أردتُ أنْ أشْتَرِطَ. قَالَ: ((تَشْتَرِطُ مَاذا ؟)) قُلْتُ: أنْ يُغْفَرَ لِی، قَالَ: ((أمَا عَلِمْتَ أنَّ الإسلامَ يَهْدِمُ مَا كَانَ قَبْلَهُ، وأنَّ الهِجْرَةَ تَهْدِمُ مَا كَانَ قبلَهَا، وَأَنَّ الحَجَّ يَهْدِمُ مَا كَانَ قَبْلَهُ ؟)) وَمَا كَانَ أَحدٌ أَحَبَّ إِلَيَّ مِنْ رَسُولِ الله (صلی اللہ علیہ وسلم) وَلاَ أَجَلَّ فی عَينی مِنْهُ وَمَا كُنْتُ أُطِيقُ أنْ أملأ عَينی مِنْهُ؛ إجلالاً لَهُ، ولو سُئِلت أن

أصفه ما أطقت، لأني لم أكن أملأ عيني منه، ولو مت على تلك الحال لرجوت أن أكون من أهل الجنة. ثم ولينا أشياء ما أدري ما حالي فيها؛ فإذا أنا مت فلا تصحبني نائحة ولا نار، فإذا دفنتموني، فشنوا علي التراب شناً، ثم أقيموا حول قبري قدر ما تنحر جزور، ويقسم لحمها، حتى أستأنس بكم، وأنظر ما أراجع به رسل ربي. (رواہ مسلم)

ترجمہ مع تشریح:-حضرت ابن شماسہ فرماتے ہیں ہم لوگ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے پاس حاضر ہوئے ،وہ بالکل موت کی گھڑی میں تھے ، دیر تک روتے رہے،اپنا چہرہ دیوار کی طرف پھیر لیا،ان کے صاحبزادے حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ (بھی صحابی ہیں) ان سے کہنے لگے: اباجان!کیا آپ کو حضورِ اکرم (ﷺ)نے فلاں چیز کی بشارت نہیں دی؟کیا حضورِ اکرم (ﷺ) نے فلاں چیز کی بشارت نہیں سنائی؟ (حضورِ اکرم (ﷺ) نے ان کو جو جو بشارتیں دی تھیں وہ یاد دلانے لگے،چوں کہ موت کا وقت تھا اور وہ رو رہے تھے ،تو دل کے اندر امید پیدا کرنے کے لیے وہ ساری چیزیں یاد دلا رہے تھے،یہ سن کر) انہوں نے اپنا چہرہ لوگوں کی طرف متوجہ کیا اور کہنے لگے : سب سے عمدہ چیز جو ہم نے اپنے ساتھ سامان کے طور پر لی ہے وہ کلمۂ شہادت لاالٰہ الااللہ محمد رسول اللہ کی گواہی ہے۔پھر فرمانے لگے:میرے اوپر تین دَور گزرے ہیں ،ایک دَور تو وہ تھا کہ نبی ٔکریم (ﷺ) کی دشمنی میرے دل میں بھری ہوئی تھی، حضور (ﷺ) کا مجھ سے بڑا دشمن اور کوئی نہیں تھا،اُس زمانہ میں مجھے یہ چیز بہت پسند تھی کہ اگر مجھے موقع مل جائے تو مَیں آپ کو قتل کردوں ، اگر اس حالت میں میری موت آتی تو یقیناً میں جہنمی ہوتا۔

پھر جب اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں اسلام کی محبت ڈالی،تو مَیں حضورِ اکرم (ﷺ) کی خدمت میں حاضر ہوا اور درخواست کی کہ اپنا دستِ مبارک آگے بڑھایئے، مَیں آپ کے

ہاتھ پر اسلام کی بیعت کرنا چاہتا ہوں (یعنی مسلمان ہوناچاہتاہوں) جب حضور ﷺ نے اسلام کی بیعت لینے کے واسطے اپنادایاں ہاتھ آگے بڑھایا،تومَیں نے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا، حضورِاکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اے عمرو!کیا بات ہے؟میں نے کہا:اے اللہ کے رسول! مَیں ایک شرط کرناچاہتاہوں حضورِاکرم ﷺ نے فرمایا :کیا شرط کرناچاہتے ہو؛کرو۔مَیں نے کہا:اس شرط پراسلام لاؤں گا کہ میرے سارے گناہ معاف ہوجائیں ،اور میری مغفرت ہوجائے۔ حضورِاکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اے عمرو!تمہیں معلوم نہیں کہ اسلام تو اپنے سے پہلے کے سارے گناہوں کو ختم کردیتاہے،اور ہجرت اس سے پہلے کے سارے گناہوں کو مٹادیتی ہے،اور حج بھی اس سے پہلے کئے ہوئے تمام گناہوں کو ختم کردیتاہے(اس جگہ پر اسلام کے متعلق لکھا ہے کہ اسلام لانے سے تو اس کا نامۂ اعمال ایک دم کلین وصاف ہوجاتاہے، ایسا جیسا کہ آج ہی اپنی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا ہو، لیکن ہجرت اورحج کے متعلق لکھا ہے کہ اس سے صغیرہ گناہ معاف ہوں گے،کبیرہ گناہ نہیں،اگرچہ بعضوں نے کبیرہ کے متعلق بھی لکھاہے، لیکن راجح قول وہی ہے)پھر تو میرا یہ حال ہوگیا کہ حضورِاکرم ﷺ کی ذاتِ بابرکات سے زیادہ محبوب اور باعزت میری نگاہوں میں اور کوئی نہیں رہا،بلکہ حضور ﷺ کا میرے دل میں اتنا زیادہ احترام تھا کہ مَیں آنکھیں بھر کر حضور ﷺ کو دیکھ بھی نہیں سکتا تھا۔اگر کوئی مجھے پوچھے کہ حضور ﷺ کے چہرۂ انور کی کیفیت بیان کروتو مَیں بیان نہیں کر سکتا،کیوں کہ میں کبھی حضورِاکرم ﷺ کو نظر بھر کر دیکھ ہی نہیں سکتا تھا؛ پھر کیسے بیان کروں ؟(جو چیز آدمی غور سے اور پورے

اطمینان سے دیکھے اس کو بیان کرسکتا ہے،اور جس کو پورے اطمینان سے نہ دیکھ پاتاہو، تو کیسے بیان کرے گا)اگراس وقت میری موت آگئی ہوتی تو مجھے امید تھی کہ یقیناً میں جنتی ہوتا۔

اس کے بعد بہت سارے اختیارات ہمارے حوالے کئے گئے(یعنی بعد میں حکومت ہمارے ہاتھ میں آئی، کچھ اختیارات استعمال کرنے کی نوبت آئی)اس کے بعد اب میں نہیں کہہ سکتاکہ میرا حال کیاہے۔اس لئے دیکھو!جب میری موت ہوجائے تو کوئی رونے والی عورت اورآگ میرے جنازہ کے ساتھ نہ جائے(زمانۂ جاہلیت میں دستور تھاکہ جب کسی کاجنازہ لے جاتے تھے ،توساتھ میں آگ بھی لے جاتے تھے، اور رونے والی عورتیں سینہ اورچہرہ کوٹتی ہوئی اور مرنے والے کی خوبیاں بیان کرتی ہوئی ساتھ میں چلتی تھیں ،اس لیے انہوں نے تاکید کردی کہ میرے ساتھ ایسا نہ ہو۔بہت سی جگہوں پر غیر مسلموں میں آج بھی ایسارواج ہے۔ علماء نے لکھا ہے کہ آدمی کے مرنے کے بعداگر اس کے خاندان والوں کی طرف سے اس بات کااندیشہ یارواج ہوکہ وہ کسی بدعت کا ارتکاب کریں گے، تو اس کو چاہیے کہ تاکیدکے ساتھ اس بات کی وصیت کرجائے کہ میرے مرنے کے بعد ایساکچھ مت کرنا،اس کے بعد بھی اگر وہ کریں گے تومرنے والے پراس کی کوئی ذمہ داری نہیں رہے گی)اورجب مجھے دفن کرچکو تو میری قبرپر مٹی ڈال دینا،پھر میری قبرکے پاس اتنی دیر تک ٹھہرنا جتنی دیر میں ایک اونٹ ذبح کرکے اس کاگوشت تقسیم کردیا جاتا ہے (تقریباًبیس پچیس منٹ)تاکہ

تمہارے ذریعہ مجھے اُنس حاصل ہو،اور میں دیکھ لوں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والے فرشتوں کو مَیں کیا جواب دیتا ہوں۔

چوں کہ دفن کے بعد فوراً فرشتے آتے ہیں تو اس وقت اہلِ خاندان کو چاہیے کہ قبر کے پاس بیس پچیس منٹ ٹھہریں اور کلمۂ طیبہ کا ورد کریں، تلاوتِ قرآن میں مشغول رہیں اور مرنے والے کے لیے دعا کا اہتمام کریں کہ اللہ تعالیٰ اس کو منکر نکیر کے سوال کے جواب میں ثبات قدمی نصیب کرے اور اس سے صحیح جواب دلوائے؛یہ مناسب ہے، بہر حال!یہاں تو اس روایت کو اس بنیاد پر لائے ہیں کہ ان کے صاحبزادہ نے نبیٔ کریم (ﷺ) کے ارشادات کے مطابق ان کو بشارت سنائی،اس سے معلوم ہوا کہ دوسروں کو خوشخبری دینا اور بشارت سنانا ثابت ہے۔

باب وداع الصاحب ووصيته عند فراقه للسفر وغيره والدعاء لَهُ وطلب الدعاء مِنْهُ

اپنے کسی ساتھی اور دوست کو رخصت کرتے وقت نصیحت کرنا، اس کے لیے دعا کرنا اور اس سے دعا کی درخواست کرنا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وَوَصَّى بِهَا إِبْرَاهِيمُ بَنِيهِ وَيَعْقُوبُ يَا بَنِيَّ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَى لَكُمُ الدِّينَ فَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ. أَمْ كُنْتُمْ شُهَدَاءَ إِذْ حَضَرَ يَعْقُوبَ الْمَوْتُ، إِذْ قَالَ لِبَنِيهِ مَا تَعْبُدُونَ مِنْ بَعْدِي؟ قَالُوا نَعْبُدُ إِلَهَكَ وَإِلَهَ آبَائِكَ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ إِلَهًا وَاحِدًا وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ (البقرة: ۱۳۲، ۱۳۳)

جدائی کے موقع کے چار آداب:

باب کا عنوان ہے: اپنے ساتھی، عزیز، اپنی اولاد یا اپنے ملنے والوں کو جدائی کے موقع پر الوداع کہنا، اور جو نصیحت کی بات ان کے مناسبِ حال ہو وہ کہنا۔ جدائی چاہے سفر کی وجہ سے ہو رہی ہو، پھر وہ سفر تجارتی ہو، حج کا ہو، تبلیغ کی غرض سے ہو، یا طلبِ علم کے لیے ہو، یا وہ جدائی کسی اور وجہ سے ہو رہی ہو، جیسے: ایک آدمی بالکل آخری گھڑی میں ہے اور وہ یہ سمجھ رہا ہے کہ اب میں دنیا سے رخصت ہونے والا ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ جدائی چاہے وقتی ہو، یا مستقل ہو، جب بھی اپنے عزیزوں، رفقاء اور دوستوں سے جدائی کی گھڑی آئے، تو آداب میں سے ایک ادب یہ بھی ہے کہ ان کو الوداع کہے، اور دوسرا ادب یہ ہے کہ ان کو وصیت، تاکیدی نصیحت اور بھلائی کی بات کہے جو ان کے مناسبِ حال ہو۔

"وصیت" دراصل اس نصیحت کی بات کو کہتے ہیں جو کوئی آدمی کسی کو رخصت کے وقت کرتا ہے۔ ویسے روزانہ عام حالات میں جو کہا جاتا ہے اس کو نصیحت کہیں گے، لیکن یہی نصیحت کی بات جب جدائی کے موقع پر- چاہے جدائی وقتی ہو یا ہمیشہ کی ہو- کہی جاتی ہے تو اس کو "وصیت" سے تعبیر کرتے ہیں جس میں تاکید زیادہ ہوا کرتی ہے۔

تو یہ چاروں چیزیں آداب میں سے ہیں :-

۱:-الوداع کہنا۔

۲:- کچھ نصیحت کرنا۔

۳:-اس کے لیے دعا کرنا۔

۴:-اپنے واسطے اس سے دعا کی درخواست کرنا۔

ان کا بھی ہمیں اپنی زندگیوں میں اہتمام کرنا چاہیے، اسی کو بتلانے کے لیے یہ باب قائم کیا ہے۔

دو پیغمبروں کی اپنے بیٹوں کو وصیت:

اس سلسلہ میں سورۂ بقرہ کی دو آیتیں پیش کی ہیں۔ حضرت ابراہیم اور حضرت یعقوب علیٰ نبینا وعلیہما الصلوٰۃ والسلام نے اپنی اولاد کو دین پر قائم رہنے اور کلمہ کو مضبوطی سے پکڑنے کی وصیت کی

تھی، چناں چہ ان کی وصیت کے الفاظ ذکر کیے: اے میرے بیٹو! اللہ تبارک وتعالیٰ نے تمہارے لیے دین اسلام کو پسند کیا ہے (تم کو دینِ اسلام کی توفیق عطا فرمائی، اس کی ہدایت عطا فرمائی جس کی وجہ سے تم نے اس دین کو قبول کیا، اوراب تک اسی پر قائم ہو، اسی پر عمل کر رہے ہو) تواب تمہاری موت نہ آئے مگر ایسی حالت میں کہ تم اسلام ہی پر قائم ہوؤ۔ گویا دینِ اسلام کو مضبوطی سے تھامے رہنا، اور مضبوطی سے تھامنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کو اپنی زندگیوں میں عملی جامہ پہناؤ کہ تمہارا اٹھنا بیٹھنا سونا جاگنا، چلنا پھرنا؛ غرضیکہ تمہاری ہر حرکت وسکون اور تمہارا ہر کام اسی کے مطابق ہو، تب ہی کہا جائے گا کہ تم اس کو مضبوطی کے ساتھ تھامے ہوئے ہو۔

اور پھر اسی حال میں تمہیں موت آئے، اس لیے کہ اگر آدمی یہ چاہتا ہے کہ فلاں حالت میں مجھے موت آئے، تو ظاہر ہے کہ موت کا کوئی وقت اور گھڑی مقرر نہیں ہے ، کسی کے متعلق بھی گارنٹی کے ساتھ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ کون سے دن ،کون سی گھڑی میں ،کتنے بجے موت آنے والی ہے۔ لہٰذا اگر کوئی یہ چاہتا ہو کہ اس کی موت ایمان پر آئے تو اس کو چاہیے کہ ایمان کو ہمیشہ تھامے رہے ،اورایسا طریقہ اختیار کرے کہ کسی حال میں بھی اپنے آپ کو ایمان سے جدا نہ ہونے دے ،اس لیے کہ معلوم نہیں کب موت آجائے۔ جب ایمان کو ہمیشہ کے لیے تھامے رکھے گا، تو ظاہر ہے کہ جب بھی موت آئے گی اسی حالت میں آئے گی۔ جیسا کہ حدیثِ پاک میں آتا ہے: ”تَمُوْتُوْنَ كَمَا تَعِيْشُوْنَ، وَتُحْشَرُوْنَ كَمَا تَمُوْتُوْنَ (تفسیر روح البیان)“ موت اسی حالت میں آئے گی جس حالت میں تم زندگی گزارتے ہو، اور جس حالت میں موت آئے گی

اسی میں تم اٹھائے جاؤ گے۔ کوئی آدمی اگراللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرمانبرداری کی حالت میں زندگی گزارتا ہے،تو موت بھی اسی حالت میں آئے گی۔اور اگر کوئی آدمی معصیت اور نافرمانی کی حالت میں زندگی گزارتاہے،گناہوں میں لت پت ہے،اسی میں مشغول ہے تو ظاہر ہے کہ موت بھی اسی حالت میں آئے گی۔اس لیے اگر آپ چاہتے ہیں کہ اچھی حالت میں موت آئے،تواپناحال درست کرلو، پھراسی حال پر مرو گے۔اور جس حالت میں موت آئے گی اسی حالت میں تم اُٹھائے جاؤ گے۔اگر اچھی حالت میں موت آئی ہے تو اچھی حالت میں اٹھائے جاؤ گے اور اگر خدانخواستہ بری حالت میں موت آئی ہے توبری حالت میں اٹھائے جاؤگے۔

دیکھو!حضرت ابراھیم اور حضرت یعقوب علیٰ نبیناوعلیہما الصلوۃ والسلام نے اپنی اولاد کو جو وصیت فرمائی، اپنی موت کے وقت جو تاکید فرمائی وہ یہ تھی کہ: دین کا دامن تھامے رکھیو،دین کوہاتھ سے جانے مت دینا،اس پر مضبوطی سے قائم رہنا۔

بیانِ واقعہ کانرالا انداز:

خاص طورسے حضرت یعقوب علیہ السلام کاقصہ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ پاک میں ذکر کیا،توہمیں غورکرناہے کہ کیوں ذکرکیا؟ظاہرہے کہ قرآنِ پاک میں ماضی کے واقعات تاریخی حیثیت سے نہیں ذکر کئے جاتے بلکہ اس کا مقصدیہ ہوا کرتاہے کہ ہمیں عبرت حاصل ہو،اوراس سے کچھ سبق لیں۔اللہ تعالیٰ نے بھی حضرت یعقوب علیہ السلام کے اس واقعہ کوایک عجیب ونرالے انداز

سے قرآنِ پاک میں ذکر کیا، باری تعالیٰ سوال کرتے ہیں کہ: ﴿أَمْ كُنتُمْ شُهَدَاءَ إِذْ حَضَرَ يَعْقُوبَ الْمَوْتُ﴾ کیا تم لوگ اس وقت موجود تھے جب حضرت یعقوب علیہ السلام کی موت کا وقت آیا؟ یہ آیت حضورِ اکرم (ﷺ) پر نازل ہوئی، تو اس کے سب سے پہلے مخاطب حضورِ پاک (ﷺ) ہیں اور آپ کے واسطے سے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور ان کے بعد قیامت تک آنے والی پوری امتِ محمدیہ ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کا زمانہ نبیٔ کریم (ﷺ) کے زمانہ سے سیکڑوں سال پہلے کا ہے تو ان کی موت کے وقت حضور (ﷺ) وہاں کیسے موجود ہوتے؟ نہ حضور (ﷺ) اس وقت موجود تھے، نہ صحابۂ کرام موجود تھے، اور نہ ہم آپ موجود تھے۔ دراصل یہ انداز اختیار فرما کر آگے جو بات کہی جانے والی ہے اس کی اہمیت اور تاکید بتانا مقصود ہے، جیسے کوئی واقعہ اور حادثہ آپ کے سامنے پیش آیا ہو تو اس کو بیان کرنے کا ایک انداز یہ ہوتا ہے کہ بھائی! فلاں نے فلاں کو جو بات کہی تھی اس وقت تم وہاں تھے؟ وہ کہے گا کہ نہیں! میں وہاں موجود نہیں تھا، تو آپ کہیں گے کہ میں وہاں تھا، اس لیے میں بتلاتا ہوں کہ کیا ہوا تھا۔ یہ انداز دراصل سامنے والے کو کسی چیز کی طرف متوجہ کرنے کے واسطے ہوتا ہے۔ باری تعالیٰ نے بھی یہاں وہی انداز اختیار کیا۔

حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ قرآنِ پاک میں باری تعالیٰ نے لوگوں کو سمجھانے کے واسطے سارے انداز اور طریقے وہی اختیار کئے جو آپس کی بات چیت میں اختیار کئے جاتے ہیں۔ کسی آدمی کو متوجہ کرنے کے لیے یہ بھی ایک انداز اور طریقہ ہے

جو اپنایا جاتا ہے۔ گویا باری تعالیٰ یہ سوال کرتے ہیں کہ جس وقت حضرت یعقوب علیہ السلام کی موت کا وقت آیا اس وقت آپ لوگ وہاں موجود تھے؟ ظاہر ہے کہ موجود نہیں تھے، تو باری تعالیٰ فرمانا چاہتے ہیں کہ مَیں تھا، بتاؤں کہ کیا ہوا تھا؟ اللہ تعالیٰ تو ہمیشہ سے ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔ فرماتے ہیں کہ جب حضرت یعقوب علیہ السلام کی موت کی گھڑی آئی تو انہوں نے اپنے بیٹوں کو جمع کیا اور ان سے سوال کیا۔

خاندانِ نبوت:

آگے بڑھنے سے پہلے ذرا معلوم ہو جانا چاہیے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کون تھے؟ آپ اللہ تعالیٰ کے جلیل القدر پیغمبر تھے۔ بنو اسرائیل پورا ایک خاندان ہے جن کے اندر سینکڑوں انبیاءِ کرام مبعوث ہوئے، اس لیے کہ ان کے بعد سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک جتنے بھی نبی آئے وہ سب بنو اسرائیل ہی میں آئے۔ اسرائیل حضرت یعقوب علیہ السلام ہی کا دوسرا نام ہے، ان کے بارہ بیٹے تھے انہی سے بارہ خاندان پھیلے، انہی کی ساری اولاد کو بنو اسرائیل کہا جاتا ہے، پھر ان بنو اسرائیل کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا جو خصوصی معاملہ ہوا وہ بھی عجیب و غریب ہے، اور اسی خاندان میں نبوت کا سلسلہ جاری رہا۔ اور دیکھئے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام خود اللہ تعالیٰ کے نبی ہیں، ان کے والد حضرت اسحاق علیہ السلام بھی اللہ تعالیٰ کے نبی ہیں، ان کے دادا حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی اللہ تعالیٰ کے جلیل القدر نبی ہیں جن کو ابوالانبیاء کہا جاتا ہے، اس لیے کہ حضرت ابراہیم

علیہ السلام کی بعثت کے بعد دنیا میں جتنے بھی انبیاء آئے وہ سب کے سب انہی کی نسل سے ہیں۔ اوران کے چچاحضرت اسماعیل علیہ السلام بھی نبی ہیں ؛گویاپوراگھرانہ نبوت کاگھرانہ ہے،اس لیے ظاہرہے کہ وہاں کون سی چیز کے چرچے ہوں گے!جیسے:تاجرگھرانہ میں تجارت کے چرچے ہوتے ہیں کھیتی باڑی والے گھرانہ میں کھیتی باڑی کے چرچے ہوتے ہیں ،جیساگھرانہ ہوتاہے اس میں ویسے ہی چرچے ہوتے ہیں ؛توآخران کا کام کیاتھا؟پورے خاندان کاکام ہی لوگوں کو اللہ کی توحید اورنبی کی رسالت پر ایمان لانے کی دعوت دیناتھا،ان کی زندگیاں اسی میں گزرتی تھیں،اپنی صلاحیتوں کواسی کے لیے استعمال کرتے تھےاوراسی کے لیے ساری مشقتیں اُٹھاتے تھے، گویاان کی زندگی کامقصداورمشن یہی تھا۔

فکر کیا کرے؟:

نیزسوچنے کی بات یہ ہے کہ باپ خوداللہ کے نبی ہیں اوران بارہ بیٹوں میں سے ایک حضرت یوسف علیہ السلام ہیں جو اللہ تعالیٰ کے نبی ہیں ،توباپ اپنے بیٹوں کو-جن میں ایک اللہ کے نبی موجود ہیں -جمع کرکے وصیت کررہے ہیں اوراس میں یہ سوال کررہے ہیں :”مَاتَعۡبُدُوۡنَ مِنۡۢ بَعۡدِیۡ؟“اے میرے بیٹو!تم میرے بعد کس کی عبادت کروگے؟ سوچنے کی بات یہ ہے کہ یہ بھی کوئی کرنے کاسوال تھا؟ظاہر ہے کہ ان کے گھرمیں دعوت کے چرچے ہوتے تھے،ان کی

زندگیاں اسی میں کھپ گئی تھیں ، ساری صلاحیتیں اسی میں استعمال ہوئی تھیں ،اب موت کے وقت بیٹوں سے یہ سوال کر رہے ہیں کہ میرے بعد تم کس کی پوجا کروگے !

یہ ایک واقعہ پہلے پیش آیاہے،توآخراس واقعہ کو قرآنِ پاک میں کو خصوصیت کے ساتھ ایک نرالے انداز میں کیوں ذکر کیا گیا؟دراصل اس سے ہم لوگوں یعنی قیامت تک آنے والی امت ِ محمدیہ کوایک سبق دینا منظور ہے کہ ایک آدمی جب دنیاسے جارہاہو تو اس کواپنی اولاد اوراپنے خاندان کے متعلق اگر فکر کرنی ہےتو کیا کرے ؟

آج کے دَور کی تصویر کشی:

ہم اورآپ تصورکریں کہ کسی کومعلوم ہوجائے کہ میرے دنیاسے جانے کا وقت آچکا ہے، ڈاکٹروں نے بھی کہہ دیا،اپنی صحت کودیکھتے ہوئے خود اس کو بھی اندازہ ہوگیا، گھروالے بھی سمجھ رہے ہیں کہ یہ زیادہ دنوں کامہمان نہیں ہے، دس بارہ گھنٹہ کی مہمانی ہے، ایسےوقت میں وہ سب کو جمع کرے کہ فلاں بیٹادبئی میں ہے،فلاں سعودیہ میں ہے، فلاں انگلینڈمیں ہے؛ان سب کوبلالو۔آج اگرکوئی آدمی اپنی اولاد کوجمع کرے توذرا دل پر ہاتھ رکھ کرسچ بتاؤکہ وہ کیاکہے گا؟باپ اگر فیکٹری کامالک ہے تو کہے گاکہ دیکھوبیٹا!بڑی محنت سے میں نے یہ فیکٹری قائم کی ہے،اپناخون پسینہ ایک کیا ہے،اپنی ساری زندگی اس کے اندرلگائی ہے،دیکھنا!میرے بعد اس کو

برباد مت کر دینا، دشمنوں کو ہنسنے کا موقع مت دینا، بلکہ اور زیادہ ترقی ہو ایسی شکلیں اختیار کرنا، مل جل کر کے کام کرنا۔ یہی کہے گا نا !

اگر وہ کسان ہے اس کی کئی ایکڑ زمین ہے تو وہ کہے گا: یہ ساری زمینیں، یہ سب باغات جو نظر آرہے ہیں ، یہ سب کچھ نہیں تھا، بنجر پڑا ہوا تھا، میں نے بڑی محنتیں کی ہیں ،رات دن اس کے پیچھے ایک کر دیا ہے، اب یہ سب تمہارے لیے چھوڑ کر جارہا ہوں ، دیکھنا! کہیں برباد نہ کر دینا۔ آج اگر کوئی آدمی نصیحتیں کرے گا تو یہی کرے گا، اور کیا کرے گا؟ ہمارا مزاج ہی ایسا بنا ہوا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ واقعہ قرآنِ پاک میں ذکر کر کے بتلایا کہ یہ سب چیزیں وصیت کی نہیں ہیں کہ فیکٹریوں میں اضافہ کرنا، زمینوں کو ترقی دینا، تجارت بڑھادینا، آج اگر دس لاکھ کا ٹرن اوور (TurnOver) ہے تو پچاس لاکھ کا کر دینا؛ بلکہ فکر کی چیز اگر ہے تو یہ ہے کہ میرے بعد میری اولاد کون سا دین اختیار کرے گی؟ کس کی عبادت کرے گی؟

حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد سے کیا یہ گمان ہو سکتا تھا کہ وہ کسی اور خدا کی عبادت کریں گے؟ یہ تو نبیوں کی اولاد تھی، ان کا باپ نبی، دادا نبی، پر دادا نبی، دادا کا بھائی نبی؛ پھر بھی حضرت یعقوب علیہ السلام ان سے پوچھ رہے ہیں کہ میرے بعد کس کی پوجا کروگے؟ ان سے اور کچھ توقع کی ہی نہیں جاسکتی تھی، اس کے باوجود تاکید کے واسطے پوچھا جارہا ہے، اور بیٹوں نے بھی جو جواب ان کی شایانِ شان تھا وہی دیا: ”نَعْبُدُ إِلٰهَكَ وَإِلٰهَ آبَائِكَ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ“ ابا جان! آپ بے فکر

رہیے، آپ کے دنیا سے رخصت ہونے کے بعد آپ کے معبود ہی کی ہم عبادت کریں گے۔ پھر مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ آپ کے آباء واجداد حضرت ابراہیم، حضرت اسماعیل اور حضرت اسحاق علیہم السلام کا جو معبود ہے اسی کی عبادت کریں گے، وہ کون ہے؟ ''إِلٰهاً وَاحِداً'' وہی ایک معبود اللہ تعالیٰ۔ اس طرح پوری وضاحت کر دی گئی، اب اس کے بعد تو کچھ پیچیدگی باقی ہی نہیں رہی تھی، پھر بھی آگے فرمایا: ''وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ'' اور ابا جان! ہم اسی کا حکم مانیں گے، اور اسی کی بات پر چلیں گے۔ اس طرح سے بیٹوں نے اپنے والد کو مکمل اطمینان دلا دیا۔

خلاصہ یہ ہے کہ جب حضرت یعقوب علیہ السلام جیسے پیغمبر کو اپنی اولاد کے متعلق۔جن میں ایک اللہ کا نبی ہے۔یہ فکر لاحق ہے کہ میرے بعد میری اولاد کس کی عبادت کرے گی، اور کون سا دین اختیار کرے گی؛ تو کیا اِس زمانہ میں ہمیں اپنی اولاد کے متعلق یہ فکر نہیں ہونی چاہیے؟ آج تو اس فکر کی اور زیادہ سخت ضرورت ہے۔ اس لیے حقیقت تو یہ ہے کہ ہماری طرف سے اس کا اہتمام ہونا چاہیے، اور ایسی وصیت سے پہلے اولاد کے لیے ایسی کوشش بھی ہونی چاہیے۔

اب آگے وصیت کے متعلق کچھ روایتیں پیش کرتے ہیں۔

نبی کریم (ﷺ) کی وصیت:

حدیث ۲۱۷:-

فمنها حديث زيد بن أرقم رضی اللہ عنہ -الَّذِي سبق في بَابِ إكرام أهْلِ بَيْتِ رسول الله (ﷺ) - قَالَ: قَامَ رسول الله (ﷺ) فِينَا خَطِيباً، فَحَمِدَ اللهَ، وَأَثْنَى عَلَيْهِ، وَوَعَظَ وَذَكَّرَ، ثُمَّ قَالَ: ((أَمَّا بَعْدُ، أَلاَ أَيُّهَا النَّاسُ، إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ يُوشِكُ أَنْ يَأْتِيَ رَسُولُ رَبِّي فَأُجِيبَ، وَأَنَا تَارِكٌ فِيكُمْ ثَقَلَيْنِ، أَوَّلُهُمَا: كِتَابُ اللهِ، فِيهِ الْهُدَى وَالنُّورُ، فَخُذُوا بِكِتَابِ اللهِ وَاسْتَمْسِكُوا بِهِ))، فَحَثَّ عَلَى كِتَابِ اللهِ، وَرَغَّبَ فِيهِ، ثُمَّ قَالَ: ((وَأَهْلُ بَيْتِي، أُذَكِّرُكُمُ اللهَ فِي أَهْلِ بَيْتِي)) (رواه مسلم، وَقَدْ سَبَقَ بِطُولِهِ.)

ترجمہ مع تشریح:- حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ایک مرتبہ نبی کریم (ﷺ) ہمارے درمیان خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے، پہلے آپ نے اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء بیان فرمائی اور لوگوں کو نصیحت کی، اللہ تعالیٰ کی یاد دلائی، اور فرمایا: حمد وصلوٰۃ کے بعد! اے لوگو، سنو! میں ایک انسان ہوں، قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ایلچی اور بلانے والا میرے پاس آئے اور میں اس کے بلاوے پر لبیک کہوں (یعنی موت کا فرشتہ آئے گا تو مجھے دنیا سے جانا ہوگا) اس لیے میں تمہارے درمیان دو مضبوط چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں (ان کو اگر تم مضبوطی سے پکڑلو گے تو کبھی گمراہ نہیں ہوگے) ایک اللہ تعالیٰ کی کتاب (یعنی قرآن پاک کہ) اسی میں ہدایت کاراستہ، لوگوں کے لیے رہنمائی اور روشنی موجود ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ کی کتاب کو پکڑو اور مضبوطی کے ساتھ اس کو تھامے رہو (مطلب یہ ہے کہ اس پر عمل کرو۔ پکڑنے اور تھامنے سے ہاتھ میں پکڑنا مراد نہیں ہے، بلکہ عمل کرنا مراد ہے) چنانچہ نبی کریم (ﷺ) نے لوگوں کو

قرآنِ پاک پر عمل کے لیے خوب ابھارا اور ترغیب دی۔ اور دوسری چیز میرے اہل بیت ہیں، کہ ان کے سلسلہ میں مَیں تمہیں اللہ تعالیٰ سے ڈراتا ہوں (یعنی ان کے حقوق کو بھی ادا کرنا)

دیکھو! یہاں نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو جب یہ اندازہ ہوا کہ میرے دنیا سے جانے کا وقت اب قریب آرہا ہے تو آپ نے امت کو یہ وصیت فرمائی، اسی مناسبت سے اس روایت کو یہاں پیش کیا ہے۔

مناسبِ حال معاملہ اور نصیحت:

حدیث ۷۱۳:-

وعن أَبِي سليمان مالِك بن الحُوَيْرِثِ رضی اللہ عنہ قَالَ: أَتَيْنَا رسولَ الله (صلی اللہ علیہ وسلم) وَنَحْنُ شَبَبَةٌ مُتَقَارِبُونَ، فَأَقَمْنَا عِنْدَهُ عِشْرِينَ لَيْلَةً، وَكَانَ رسولُ الله (صلی اللہ علیہ وسلم) رَحِيماً رَفيقاً، فَظَنَّ أنَّا قد اشْتَقْنَا أَهْلَنَا، فَسَأَلَنَا عَمَّنْ تَرَكْنَا مِنْ أَهْلِنَا، فَأَخْبَرْنَاهُ، فَقَالَ: ((ارْجِعُوا إِلَى أَهْلِيكُمْ، فَأَقِيمُوا فِيهِمْ، وَعَلِّمُوهُم وَمُرُوهُمْ، وَصَلُّوا صَلاَةَ كَذَا فِي حِيْنِ كَذَا، وَصَلُّوا كَذَا فی حِيْنِ كَذَا، فَإِذَا حَضَرَتِ الصَّلاَةُ فَلْيُؤَذِّنْ لَكُمْ أَحَدُكُمْ وَلْيَؤُمَّكُمْ أَكْبَرُكُمْ)) (متفقٌ عَلَيْهِ)

زاد البخاری فی روایة لَهُ: ((وَصَلُّوا كَمَا رَأَيْتُمُونِي أُصَلِّي)).

وَقَوْلُه: ((رحيماً رَفِيقاً)) رُوِيَ بِفاءٍ وقافٍ، وَرُوِيَ بقافينِ.

ترجمہ مع تشریح:- حضرت مالک بن حُوَیرِث رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم لوگ (یعنی یہ اور ان کے قبیلہ کے کچھ نوجوان) نبی کریم (ﷺ) کی خدمت میں حاضر ہوئے حال یہ کہ ہم سب ہم عمر اور نوجوان تھے(یہ لوگ اپنے علاقہ سے خاص دین سیکھنے کے لیے حاضر ہوئے تھے)ہم نے نبی کریم (ﷺ) کی خدمت میں بیس روز قیام کیا، اور نبی کریم (ﷺ) بڑے مہربان اور نرم دل تھے۔جب بیس روز ہوگئے تو حضورِ اکرم (ﷺ) نے محسوس کیا کہ ہمارے دلوں میں ہمارے گھر والوں کا شوق پیدا ہوا ہے(ایسا اندازہ ہو جاتا ہے کہ اب ان کو گھر والے یاد آرہے ہیں)تو حضور (ﷺ) نے ہم سے پوچھا کہ تمہارے گھر پر کون کون ہے؟ (ماں باپ، بھائی بہن، بیوی بچے؛یہ ساری تفصیلات حضور (ﷺ) نے پوچھیں)ہم نے آپ کو سب تفصیل بتلائی(تو حضور (ﷺ) سمجھ گئے کہ ان کو گھر کی یاد آرہی ہے اس لیے کہ بیس دن ہوگئے تھے)تو حضور (ﷺ) نے ازخود ارشاد فرمایا:بھائیو!تم لوگ گھر جاؤ(اس سے معلوم ہوا کہ تعلیم و تربیت اور تبلیغ وغیرہ امور کے اندر جس آدمی کو لگایا جائے اس میں اس کے مزاج اور اس کی طبیعت کے تقاضوں کا بھی خیال رکھا جائے،ان سے ہٹ کر اگر کچھ کرنے جاؤ گے تو پھر یہ چیز نبھے گی نہیں ،اور اس میں استقامت نہیں ہوگی۔دیکھو! ان کو فقط بیس دن گزرے تھے،لیکن نبی کریم (ﷺ) نے ان کے مزاجوں سے محسوس کیا کہ اب ان کے دلوں میں گھر کا خیال آرہا ہے،تو حضور (ﷺ) نے ازخود پوچھ لیا کہ گھر پر کس کو چھوڑ کر آئے ہو، ساری تفصیل سننے کے بعد آپ نے فیصلہ کیا کہ اب تم لوگ گھر جاؤ) اور اپنے خاندان کے لوگوں میں قیام کرو،اور (یہاں جو سیکھا ہے وہ)ان کو سکھاؤ (مقامی کام کرو) ان کو اللہ کی باتوں کا حکم کرو، اور فلاں

وقت میں فلاں نماز اور فلاں وقت میں فلاں نماز پڑھو (پانچوں وقت کی نماز کے اوقات بتلائے) اور جب نماز کا وقت آئے تو ایک آدمی اذان کہے، اور تم میں جو بڑا ہے وہ تمہاری امامت کرائے۔

افادات:- دیکھو! جب یہ لوگ رخصت ہو رہے تھے تو نبی کریم (ﷺ) نے ان کو نماز کی اور خاندان والوں کو دین سکھلانے کی تاکید فرمائی، اور نماز کا طریقہ بتلایا۔ اس روایت کو لاکر بتلانا یہ چاہتے ہیں کہ جب کسی سے جدائی کا وقت آئے تو اس کے مناسبِ حال نصیحت کرنی چاہیے۔ جیسے: آپ اپنے بچے کو مدرسہ میں پڑھنے کے لیے بھیج رہے ہوں تو ظاہر ہے کہ اس کے مناسبِ حال بات یہی ہے کہ اس سے کہا جائے کہ بیٹا! وہاں جاکر محنت سے پڑھنا۔ اگر آپ کا لڑکا بڑا ہے اور وہ تجارتی سفر کے لیے بیرون جا رہا ہے، یا ملک ہی میں کہیں لمبی ٹور پر جا رہا ہے، تو اس کے مناسب آپ نصیحت کریں گے، مثلاً: سفر میں نماز کا خیال رکھنا، اپنے آپ کو گناہوں سے بچانا، برائیوں سے دور رہنا، اور اپنے کام کی طرف توجہ دینا۔

کہنے کا حاصل یہ ہے کہ جب بھی کسی سے جدائی کا وقت آئے، تو اس کو اس کے مناسبِ حال نصیحت کی جائے، خاص طور پر دین کی حفاظت کی طرف توجہ دلائی جائے۔

اپنی دعاؤں میں ہمیں مت بھولیو:

حدیث ۷۱۴:-

وعن عمرَ بن الخطاب رضی اللہ عنہ قَالَ: اسْتأْذَنْتُ النَّبِيَّ (ﷺ) فِى العُمْرَةِ فَأَذِنَ، وقال: ((لاَ تَنْسَانَا يَا أُخَىَّ مِنْ دُعَائِكَ)) فقالَ كَلِمَةً ما يَسُرُّنِى أنَّ لِى بِهَا الدُّنْيَا

وفی رواية قَالَ: ((أَشْرِكْنَا يَا أُخَىَّ فى دُعَائِكَ))

(رواه أَبُو داود والترمذي، وقال: حديث حسن صحيح)

ترجمہ:- حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم (ﷺ) سے عمرہ کے لیے جانے کی اجازت طلب کی، تو حضور (ﷺ) نے اجازت مرحمت فرمائی، اور کہا: اے میرے پیارے بھائی! اپنی دعاؤں میں ہمیں مت بھولیو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور (ﷺ) نے ایسا جملہ ارشاد فرمایا کہ ساری دنیا ملتی تو اس سے وہ خوشی نہ ہوتی جو حضور (ﷺ) کے اس ارشاد سے ہوئی۔

افادات:- اس سے معلوم ہوا کہ بڑا بھی اپنی چھوٹے سے دعا کی درخواست کرے۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ جب کوئی آدمی کسی ایسی جگہ پر جارہا ہو جس کے متعلق یہ گمان ہو کہ وہاں دعا قبول ہوتی ہے، تو ان جانے والوں سے دعا کی درخواست کرنی چاہیے۔ باب کے عنوان میں یہ بھی تھا: ان کے لیے دعا کرنا اور ان سے اپنے لیے دعا کی درخواست کرنا۔ تو کوئی آدمی کسی بھی سفر میں جارہا ہو تو چوں کہ مسافر کی دعا قبول ہوتی ہے، تو اس سے بھی دعا کی درخواست کی جائے۔

کسی کو رخصت کرتے وقت کی دعائیں :

حدیث ۷۱۵:-

وعن سالم بن عبدِ الله بنِ عمر : أنَّ عبدَ اللهِ بن عُمَر رضی اللہ عنہما كَانَ يَقُولُ للرَّجُلِ إِذَا أَرَادَ سَفَراً أُدْنُ مِنِّي حَتَّى أُوَدِّعَكَ كَمَا كَانَ رسولُ الله (صلی اللہ علیہ وسلم) يُوَدِّعُنَا. فَيَقُولُ: ((أَسْتَوْدِعُ اللهَ دِينَكَ، وَأَمَانَتَكَ، وَخَواتِيمَ عَمَلِكَ))

(رواه الترمذي ، وقال : حديث حسن صحيح)

ترجمہ:- حضرت سالم -جو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے صاحبزادے ہیں ان سے روایت ہے کہ جب کوئی آدمی سفر کا ارادہ رکھتا اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے پاس آتا تو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے کہ : مجھ سے قریب آؤ تاکہ میں تم کو اسی طرح رخصت کروں جس طرح نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم کو رخصت فرماتے تھے، پھر یہ دعا دیتے تھے: **"میں اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں دیتا ہوں تیرے دین کو، تیری امانت کو، اور تیرے اعمال کے انجام کو"** (اور جو چیز اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں دی جائے وہ کبھی ضائع نہیں ہوا کرتی)

افادات:- معلوم ہوا کہ سفر میں جانے والے اپنے ساتھیوں کو اپنے پاس سے اس طرح رخصت کرنا چاہیے۔

حدیث ۷۱۶:-

وعن عبدِ اللہ بن یزیدَ الخَطْمِیِّ الصحابِیِّ رضی اللہ عنہ قَالَ: کَانَ رسولُ اللہ (ﷺ) إِذَا أَرَادَ أَنْ یُوَدِّعَ الجَیشَ، قَالَ: ((أَسْتَوْدِعُ اللہَ دِینَکُمْ، وَأَمَانَتَکُمْ، وَخَوَاتِیمَ أَعْمَالِکُمْ)) (حدیث صحیح، رواہ أبو داود وغیرہ بإسناد صحیح.)

اس روایت میں بھی اوپر والی دعا کا تذکرہ ہے کہ نبی کریم (ﷺ) کسی لشکر کو رخصت فرماتے تھے تو یہی دعا دیتے تھے۔

حدیث ۷۱۷:-

وعن أنسٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: جَاءَ رَجُلٌ إِلَی النبی (ﷺ) فَقَالَ: یَا رسولَ اللہ! إِنِّی أُرِیدُ سَفَراً، فَزَوِّدْنِی، فَقَالَ: ((زَوَّدَكَ اللہُ التَّقْوَی)) قَالَ: زِدْنِی قَالَ: ((وَغَفَرَ ذَنْبَكَ)) قَالَ: زِدْنِی، قَالَ: ((وَیَسَّرَ لَكَ الْخَیرَ حَیثُمَا کُنْتَ))

(رواہ الترمذي، وقال: حدیث حسن)

ترجمہ مع مختصر تشریح:- حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی نبی کریم (ﷺ) کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میں سفر کا ارادہ رکھتا ہوں، آپ مجھے (دعا اور نصیحت کا) توشہ دیجئے۔ نبی کریم (ﷺ) نے فرمایا: اللہ تعالیٰ تجھے تقویٰ سے مالا مال فرمائے (اس سے معلوم ہوا کہ سفر کرنے والے کو دعا دینی چاہیے) اس نے پھر درخواست کی کہ: اے اللہ کے رسول! مزید (دعا) دیجئے۔ تو نبی کریم (ﷺ) نے فرمایا: اللہ تعالیٰ تیرے گناہوں کو معاف کرے۔ اس نے پھر درخواست کی کہ: کچھ اور (دعا) دیجئے، تو نبی کریم (ﷺ) نے فرمایا: تو جہاں کہیں بھی رہے اللہ تعالیٰ تیرے لیے بھلائی کے راستے آسان کردے۔

افادات:- اوپر نبی کریم (ﷺ) نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے دعا کی درخواست کی تھی اور یہاں آپ (ﷺ) نے دعا دی۔ معلوم ہوا کہ جو رخصت ہو رہا ہو اس کو دعا دینی بھی چاہیے اور اس سے دعا کی درخواست بھی کرنی چاہیے۔ یہ بھی آداب میں سے ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے۔

الاستِخارة والمشاورة

استخارہ اور مشورہ کرنا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قَالَ اللہ تَعَالَیٰ: وَشَاوِرْهُمْ فِي الأَمْرِ (آل عمران: ۱۵۹)

وقال تَعَالَیٰ: وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ (الشوریٰ: ۳۸) أَيْ: يَتَشَاوَرُونَ بَيْنَهُمْ فِيهِ

مشورہ کی اہمیت:

دو چیزیں ہیں: استخارہ اور مشورہ۔ استخارہ؛ اللہ تبارک وتعالیٰ سے کیا جاتا ہے، اور مشورہ؛ امانتدار، سمجھدار، خیر خواہ اور تجربہ کار آدمی سے کیا جاتا ہے۔ مشورہ کے سلسلہ میں آیت پیش کی ہے: وَشَاوِرْهُمْ فِي الأَمْرِ (آل عمران: ۱۵۹) اللہ تعالیٰ نے حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اس بات کا حکم دیا کہ اہم معاملات میں آپ حضراتِ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ کیجیے۔ حالاں کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اللہ تعالیٰ نے جو علم، عقل، سمجھ، اور سوجھ بوجھ عطا فرمائی تھی؛ وہ اعلیٰ، کامل و مکمل تھی، نوعِ انسانی میں کسی کے لیے بھی وہ علم، عقل و سمجھ اور ایسا کمال متصوَّر نہیں ہو سکتا، اور ان خوبیوں کے ساتھ ساتھ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ گویا عالَمِ غیب سے علوم کا القاء مختلف طریقوں سے ہوتا ہی رہتا تھا، اس کے باوجود اہم معاملات میں حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو مشورہ کا حکم دیا گیا۔ گویا اس طریقہ کو اللہ تعالیٰ انسانوں میں اور امتِ مسلمہ کے اندر جاری فرمانا چاہتے ہیں، اس لیے حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اس کا حکم دیا گیا۔

حضورِ اکرم (ﷺ) کبھی اپنی رائے چھوڑ دیتے تھے:

اسی لیے اہم معاملات میں حضورِ اکرم (ﷺ) کی عادتِ شریفہ تھی کہ مشورہ فرماتے تھے، بلکہ بہت سی مرتبہ ایسا ہوتا تھا کہ کسی معاملہ میں آپ (ﷺ) کی کوئی رائے ہوتی، لیکن مشورہ میں بات رکھی گئی اور لوگوں کا زیادہ رجحان دوسری بات کی طرف دیکھا تو آپ (ﷺ) دوسری بات کو اختیار فرمالیتے۔ یا کسی کی طرف سے کوئی بات پیش کی گئی اور حضورِ اکرم (ﷺ) نے محسوس کیا کہ اسی کو اختیار کیا جانا چاہیے، تو اگرچہ آپ کی اپنی رائے دوسری ہوتی تھی، اس کے باوجود ان کی رائے کو اختیار فرمالیتے۔

غزوۂ اُحد کے مشورہ کا منظر:

چناں چہ غزوۂ اُحد کے موقع پر جب نبیٔ کریم (ﷺ) کو یہ اطلاع ملی کہ مکہ والے ایک لشکر لے کر مدینہ منورہ پر چڑھائی کے ارادہ سے روانہ ہو چکے ہیں، تو اس لشکر کے ساتھ مقابلہ کہاں ہو؟ اس سلسلہ میں نبیٔ کریم (ﷺ) نے مشورہ کے لیے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو جمع کیا۔ مشورہ کے لیے بیٹھنے سے پہلے حضورِ اکرم (ﷺ) نے ایک خواب بھی دیکھا تھا کہ میں ایک محفوظ قلعہ میں ہوں، ایک گائے ذبح کی جارہی ہے، اور اپنی تلوار کو آپ نے ہلایا اور سونتا، تو اس کا اگلا حصہ ٹوٹ کر گر گیا، پھر دوبارہ اس کو حرکت دی تو وہ پہلے سے زیادہ عمدہ نظر آنے لگی۔ محفوظ قلعہ سے

اشارہ مدینہ منورہ کی آبادی کی طرف تھا کہ اگر اس میں رہ کر مقابلہ کیا جائے گا تو یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ کوئی آدمی محفوظ قلعہ میں رہ کر دشمن کا مقابلہ کرے، اور جو گائے ذبح ہوتے ہوئے دیکھی، اس سے اشارہ ان صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی طرف تھا جو اس غزوہ کے موقع پر شہید ہوئے تھے۔ اور پہلی مرتبہ جو تلوار سونتی تو اس کا اگلا حصہ ٹوٹ گیا اس سے بھی اشارہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی اسی جماعت کی طرف تھا جو شہید ہوئی، اور دوبارہ اس کو سونتا اور پہلے سے عمدہ نظر آئی، اس سے اس کے بعد کی جو کامیابیاں ملنے والی تھیں ان کی طرف اشارہ تھا۔

خیر! نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو مشورہ کے لیے مسجدِ نبوی ہی میں جمع کیا، اور مشورہ میں حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنی جو بات پیش فرمائی اس سے تمام حضرات نے یہی سمجھا کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) مدینہ ہی میں رہ کر مقابلہ کرنے کو ترجیح دے رہے ہیں اور پسند فرما رہے ہیں، خواب میں بھی اسی کی طرف اشارہ تھا، اور حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اپنی رائے شریف بھی یہی تھی۔

غزوۂ بدر کا مختصر خاکہ:

لیکن بعض صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم جن کو غزوۂ بدر میں مقابلہ کے لیے میدان میں آنے کا موقع نہیں ملا تھا، ان کی دلی تمنائیں تھیں کہ اگر موقع ملے تو ہم بھی اللہ کے واسطے اور دینِ اسلام کے واسطے حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ساتھ دے کر بہادری کے جوہر دکھلائیں۔ ان کو غزوۂ بدر میں شرکت کا موقع اس لیے نہیں ملا تھا کہ غزوۂ بدر اچانک پیش آیا تھا، پہلے سے ایسی کوئی بات

ذہنوں میں نہیں تھی کہ دشمن سے مقابلہ ہوگا۔مکہ والوں کا ایک تجارتی قافلہ شام سے واپس آرہا تھاجس کے تعاقب میں نبی ٔکریم (صلی اللہ علیہ وسلم) صحابہ ٔکرام کو لے کر روانہ ہوئے تھے ، حضورِاکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بھی وہم وگمان میں نہیں تھا کہ مکہ مکرمہ سے کوئی لشکر روانہ ہوگا اوراس سے مقابلہ کی نوبت آئے گی،بس اچانک مقابلہ کی نوبت آگئی اوراللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کوکامیابی عطافرمائی۔

جب آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) اس قافلہ کے تعاقب کے لیے مدینہ منورہ سے روانہ ہونے والے تھے، توآپ نے اعلان فرمایاکہ کون تیارہے؟معلوم ہوا ہے کہ مکہ والوں کاایک تجارتی قافلہ شام سے واپس آرہاہے،اورمکہ جارہا ہے، اس وقت وہاں جوموجودتھے وہ اسی حالت میں تیار ہوگئے، بعضوں نے کہاکہ ہم ذراتیاری کرلیں ؟ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا : نہیں !جو موجود اور تیارہیں وہ آجائیں۔بہرحال!تین سوتیرہ کے قریب صحابہؓ روانہ ہوئے، اور بعدمیں جوہوا وہ ہوا۔تویہ سب کچھ اچانک ہواتھا،اس لیےبہت سوں کوشرکت کاموقع نہیں ملاتھا اوران کی تمنائیں دل ہی دل میں رہ گئی تھیں۔

افسوس کاتدارک:

اسی لیے بدرکے واقعہ کےبعد بعض حضرات ِصحابہ کوجیسے حضرت اَنس رضی اللہ عنہ کےچچا حضرت اَنس بن نضررضی اللہ عنہ کوتو بہت زیادہ افسوس رہ گیا تھا،وہ کہنےلگے کہ نبی ٔکریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا اپنے دشمنوں سے پہلاہی مقابلہ تھا،افسوس کی بات ہے کہ میں اس میں شریک نہ ہوسکا،اگراللہ

تعالیٰ نے مجھے آئندہ دشمن کے مقابلہ میں آنے کا موقعہ دیا تو اللہ تعالیٰ دیکھ لیں گے کہ میں کیا کرتا ہوں، یعنی میں برابر دشمن کا مقابلہ کروں گا۔ یہ انہوں نے قسم کھا کر کہا تھا۔ اور پھر غزوۂ احد کے موقع پر انہوں نے بہادری کے ایسے جوہر دکھلائے کہ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ ۔جو انصار میں بڑے بہادر اور ایسے ہی سخت مزاج سمجھے جاتے تھے جیسے مہاجرین میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ تھے، وہ۔ فرماتے ہیں کہ غزوۂ اُحد کے موقع پر ایک وقت حضرت اَنس بن نضر رضی اللہ عنہ تلوار لے کر آگے بڑھ رہے تھے، میرے پاس سے گزرتے ہوئے کہنے لگے: اے معاذ! کدھر چلے، میرے ساتھ چلو، اُدھر اُحد پہاڑ کی طرف جنت کی خوشبو محسوس ہو رہی ہے، یہ کہہ کر وہ آگے بڑھے اور دشمن کا مقابلہ کیا اور شہید ہوئے۔ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: انہوں نے ایسا مقابلہ کیا تھا کہ میری بھی ہمت نہیں ہوئی۔

غزوۂ اُحد کا مشورہ:

کہنے کا حاصل یہ ہے کہ غزوۂ بدر میں بہت سوں کو شرکت کا موقع نہیں ملا تھا، اس لیے ان کی دلی تمنائیں تھیں کہ آئندہ اگر ایسا موقع آئے گا تو ہم بھی اللہ کے واسطے اور دینِ اسلام کے واسطے حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ساتھ دیں گے۔ اس وقت جب مشورہ کے لیے بیٹھے اور معلوم ہوا کہ مکہ سے لشکر روانہ ہوا ہے، تو حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنا رجحان اور ارادہ ظاہر فرمادیا کہ مدینہ منورہ میں رہ کر مقابلہ کیا جائے۔

چناں چہ عبداللہ بن اُبی جو منافقین کا سردار تھا اور ظاہری طور پر اسلام لے آیا تھا، وہ ایک تجربہ کار صاحبِ رائے آدمی تھا، اسی لیے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ہجرت کرکے مدینہ منورہ تشریف لانے سے پہلے مدینہ والوں نے اسی کو اپنا سردار اور بادشاہ بنانا طے کرلیا تھا، لیکن جب نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) ہجرت کرکے یہاں تشریف لائے اور اسلام پھیلا تو اس کا سارا نظام گڑبڑ ہوگیا، اسی کا تو اس کو حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) پر حسد تھا کہ ان کے آنے سے میرا سارا کھیل بگڑ گیا، اسی پر وہ جلتا اور کڑھتا تھا، اور اسی وجہ سے اس میں منافقت آئی تھی۔ خیر! اس سے بھی حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مشورہ لیا، تو اس نے یہ مشورہ دیا کہ آج تک مدینہ کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ باہر کے کسی دشمن نے جب بھی حملہ کیا اور مدینہ کے رہنے والوں نے مدینہ میں رہ کر ان کا جواب دیا، تو مدینہ والے کبھی ناکام نہیں ہوئے اور دشمن کو ہمیشہ منھ کی کھانی پڑی۔ اور اس نے یہ بھی کہا کہ اگر اندر رہ کر مقابلہ کریں گے تو مرد تو باہر نکل کر دشمن سے لڑیں گے اور عورتیں بھی چھتوں سے دشمنوں پر پتھراؤ کرسکیں گی۔

لیکن جن کو غزوۂ بدر میں موقع نہیں ملا تھا ان کی رائے یہ تھی کہ باہر میدان میں جاکر جواب دینا چاہیے، اندر رہ کر مقابلہ کرنا تو ہماری بزدلی سمجھی جائے گی۔ نوجوان پارٹی اسی طرف تھی، اور ان کی طرف سے مطالبہ تھا کہ مدینہ منورہ سے باہر جاکر مقابلہ کیا جائے، کچھ بڑوں نے بھی اس رائے میں ان کا ساتھ دیا، حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے کہا: اگر مدینہ سے باہر جاکر مقابلہ کا فیصلہ نہ کیا گیا تو میں کھانا نہیں کھاؤں گا، جب حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے دیکھا کہ ان

لوگوں کا شوق اور جذبہ یہ ہے، تو آپ نے فیصلہ کر دیا کہ ٹھیک ہے! مدینہ سے باہر جا کر مقابلہ کریں گے۔

وہ جمعہ کا دن تھا، حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے لوگوں کو جمعہ کی نماز پڑھائی اور تقریر فرمائی، جس میں اللہ کے راستہ میں دشمن کے مقابلہ میں بہادری کے جوہر دکھلانے کے لیے ترغیب دی، اسی میں عصر کا وقت ہو گیا، تو عصر کی نماز پڑھا کر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے حجرۂ مبارکہ میں تیاری کے واسطے تشریف لے گئے، جب آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) اندر تشریف لے گئے تو یہ نوجوان جنہوں نے مدینہ منورہ سے باہر جا کر مقابلہ پر اصرار کیا تھا، ان کو دوسروں نے سمجھایا کہ حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا رجحان کیا تھا وہ تمہاری سمجھ میں نہیں آتا؟ تم نے بلا وجہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مرضی کے خلاف اتنا زور لگایا کہ آپ کو یہ فیصلہ کرنا پڑا۔ مطلب یہ ہے کہ بڑوں نے ان کو ذرا ڈانٹا اور متنبہ کیا تو ان کی بھی سمجھ میں بات آئی کہ بات تو ٹھیک ہے۔ اب حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) تو تیاری کے واسطے حجرۂ مبارکہ میں تشریف لے گئے تھے، اس لیے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) زرہ پہن کر، تلوار ہاتھ میں لے کر، ترکش اور کمان لٹکا کر میدانِ جنگ میں جانے کی پوری تیاری فرما کر جب باہر تشریف لائے، تو ان نوجوانوں نے -جن کو اصرار کرنے پر لوگوں نے سمجھایا تھا- عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ہماری طرف سے آپ کی بے ادبی اور گستاخی ہوئی، آپ کا رجحان اور ارادہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مدینہ میں رہ کر مقابلہ کیا جائے، ہم لوگوں نے اصرار کیا جس کی وجہ سے آپ نے یہ فیصلہ فرمایا، اگر آپ کا ارادہ ہو تو مدینہ ہی میں رہ کر مقابلہ کرنے کا فیصلہ فرما دیجیے۔ حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم)

نے ارشاد فرمایا: اللہ کا نبی جب ایک مرتبہ فیصلہ کرلیتا ہے کہ دشمن کے مقابلہ کے لیے میدان میں نکلیں گے ،تو پھر مقابلہ کئے بغیر واپس نہیں لوٹتا،اب تو میں تیار ہو کر آگیا ہوں۔اسی کو قرآنِ پاک میں بتلایا گیا:﴿فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللهِ﴾ پہلے اچھی طرح مشورہ کرلو،پھر جب کوئی فیصلہ کرلیا اور ارادہ مضبوط ہوگیا ؛تو اب اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرو۔

اس کو مشورہ کہتے ہیں:

آج کل تو ایک مصیبت یہ بھی ہوگئی کہ مشورہ مشورہ نہیں رہا،بلکہ پہلے سے فیصلہ کرلیتے ہیں۔ہمارے یہاں طلبہ کا کوئی معاملہ پیش آتا ہے اور مہتمم صاحب کو لگتا ہے کہ یہ قابو میں نہیں آئے گا،تو مہتمم صاحب ان سے کہتے ہیں کہ جاکر مفتی صاحب سے مشورہ کرلو۔وہ میرے پاس آتے ہیں،جب میں ان سے پوچھتا ہوں کہ کیا ہوا؟ تو وہ پوری بات بیان کردیتے ہیں کہ ایسا ایسا ہوا ہے،اور ایسا کرنے کا ارادہ ہے۔تو میں کہتا ہوں کہ آپ نے تو فیصلہ کرلیا،اب مشورہ کس بات کا کرنے آئے ہو؟جب ایک چیز طے کرلی،تو اب مشورہ کا سوال ہی نہیں رہا۔مشورہ کا مطلب تو یہ ہے کہ آپ نے کوئی چیز طے نہیں کی،بلکہ پہلے اپنی بات رکھ دی ،اب اس پر لے دے ہوگی،اس کے بعد کوئی فیصلہ کریں گے؛اس کو مشورہ کہتے ہیں۔

اس کا نام مشورہ نہیں :

لیکن آج کل عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ اپنی طرف سے ایک چیز کا فیصلہ کرلیا جاتا ہے، پھر دوسرے کے کندھے پر بندوق رکھ کر چلانے کے واسطے مشورہ ہوتا ہے کہ میں فلاں مولانا صاحب کے پاس گیا تھا تو انہوں نے بھی مجھے یہی مشورہ دیا۔ ارے بھائی! تم کو تو یہی کرنا تھا، بس مشورہ کا تو بہانہ ہے، اس کا نام مشورہ نہیں ہے۔ مشورہ تو یہ ہے کہ آدمی کوئی فیصلہ نہ کرے، اپنی بات پوری دیانتداری کے ساتھ ان کے سامنے رکھ دے۔ اتنا ضروری ہے کہ جس سے مشورہ کیا جائے وہ آدمی امانتدار ہو، حدیثِ پاک میں آتا ہے: "اَلْمُسْتَشَارُ مُؤْتَمَنٌ"(سنن ابوداود: باب فِي الْمَشُورَةِ) اور جس سے مشورہ لیا جارہا ہے اس کی بھی ذمہ داری ہے کہ مشورہ لینے والے کے حق میں جس چیز کو وہ بہتر سمجھتا ہو اسی چیز کا مشورہ دے، چاہے اس میں مشورہ دینے والے کا بھی نقصان ہوتا ہو۔

مشورہ کے بعد کیا ہوا فیصلہ نہ بدلے:

خیر! مَیں یہ عرض کررہا تھا کہ مشورہ میں پہلے سے فیصلہ نہیں کیا جاتا اور فیصلہ کرلینے کے بعد اس کو بدلا نہیں جاتا۔ ہمارے یہاں ایک مصیبت یہ بھی ہوگئی ہے کہ فیصلہ کرلینے کے بعد بیوی نے کچھ کہہ دیا، عورتوں نے دو باتیں کہہ دیں کہ یوں کرو تو پہلا فیصلہ بدل دیتے ہیں کہ اچھا

چلو! یوں کر لیتے ہیں۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد کوئی تیسرا آیا اس نے کچھ اور کہا تو پھر فیصلہ بدل دیا، اسی کا نتیجہ ہوتا ہے کہ ہمارے کسی کام میں برکت نہیں ہوتی۔ اسلام کا طریقہ یہ نہیں ہے۔ اس لیے پہلے سے اچھی طرح مشورہ ہونا چاہیے، اور اس مشورہ میں جب ایک فیصلہ ہو گیا تو اب دنیا اِدھر سے اُدھر ہو جائے، لیکن آپ اسی فیصلہ کے مطابق چلیے، سیدھی سادی بات ہے ﴿فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللهِ﴾ جب فیصلہ کر لیا تو اب اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کر کے آگے بڑھو۔

عورتوں سے مشورہ:

عام طور پر جب عورتوں کے سامنے بات آتی ہے تو پھر بڑے بڑے سمجھ دار بھی اپنا فیصلہ بدل ڈالتے ہیں، اگر ان سے مشورہ کرنا ہے تو پہلے سے ان کے سامنے بھی بات رکھو۔ ویسے عام طور پر عورتوں سے مشورہ لینے کو پسند نہیں کیا گیا ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ تو فرماتے ہیں: "شَاوِرُوْهُنَّ وَخَالِفُوْهُنَّ" ان سے مشورہ کرو اور اس کی مخالفت کرو ({[illegible]}) اگرچہ عورت بھی کبھی کبھی اچھا مشورہ دیا کرتی ہے، ایک واقعہ یاد آگیا تو سنا دیتا ہوں۔

صلحِ حدیبیہ کے موقعہ پر جب صلح ہو گئی جس میں انہوں نے ایک شرط یہ بھی لگائی تھی کہ اگرچہ مسلمان احرام باندھ کر آئے ہیں لیکن اس سال تو ان کو عمرہ کے لیے بیت اللہ جانے نہیں دیں گے، البتہ آئندہ سال آکر تین دن یہاں رہ کر عمرہ کر سکتے ہیں، اور سوائے تلواروں کے اور کوئی ہتھیار ساتھ میں نہ لائیں اور وہ تلوار بھی نیام میں ہونی چاہیے۔ اور بھی شرائط تھیں

جو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے منظور فرمالیں اور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فیصلہ کرلیا کہ ٹھیک ہے اس سال واپس جائیں گے۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو یہ صلح بہت گراں گزری، کہنے لگے کہ ہم عمرہ کے لیے وہاں سے یہاں تک آگئے ہیں، اب یہ ہم کو کیوں روکتے ہیں، ہم لڑلیں گے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بھی ضبط نہ ہوسکا اور عرض کیا: یارسول اللہ! کیا آپ نبی برحق نہیں؟ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: کیوں نہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: کیا ہم حق پر اور وہ باطل پر نہیں؟ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: بیشک۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: پھر یہ ذلت کیوں گوارا کریں۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: میں اللہ کا رسول اور برحق نبی ہوں، اس کے حکم کے خلاف نہیں کرسکتا اور وہ میرا معین اور مددگار ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: یارسول اللہ! کیا آپ نے یہ نہیں فرمایا تھا کہ ہم بیت اللہ کا طواف کریں گے؟ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: ہاں! لیکن میں نے یہ کب کہا تھا کہ اسی سال طواف کریں گے، اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس گئے اور ان سے بھی یہی عرض کیا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بھی لفظ بلفظ وہی جواب دیا جو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زبانِ مبارک سے نکلا تھا۔ بہرحال! حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے لڑائی نہیں ہونے دی اور صلح کرلی۔

جب یہ طے ہوگیا کہ واپس جانا ہے تو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حضراتِ صحابہ کو حکم دیا کہ اپنے جانور ذبح کردو، سرمنڈوادو، اور احرام کھول دو۔ لیکن سب اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھے رہے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے سنا ہی نہیں۔ یہ دیکھ کر حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو بہت تکلیف ہوئی کہ میں ایک چیز کا حکم دے رہا ہوں، لیکن کوئی آگے ہی نہیں بڑھتا، ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے سنا ہی نہ ہو۔ آپ

(ﷺ) اپنے خیمے میں تشریف لے گئے۔ اُم المؤمنین حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا اس سفر میں ساتھ تھیں، حضور(ﷺ) نے ان کو سارا واقعہ بیان فرمایا کہ ایسا ہوا۔ حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے، انہوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ نے جو بات کہی وہ انہوں نے سنی ہی نہیں، اس لیے کہ یہ صلح ان کو اتنی ناگوار ہوئی ہے کہ ان کے دماغ ماؤف ہو چکے ہیں (جب کسی چیز کا غم زیادہ ہوتا ہے تو آدمی کو کچھ پتہ نہیں چلتا کہ لوگ کیا باتیں کر رہے ہیں) اس لیے ان لوگوں نے کچھ سنا ہی نہیں ہے، آپ ان کو یہ حکم نہ دیجئے کہ جانور ذبح کر کے بال کٹوا دو، اور احرام کھول دو، بلکہ آپ ان کے سامنے اپنا جانور ذبح کیجئے، بال منڈوا دیجئے اور اپنا احرام کھول دیجئے، جب وہ آپ کو ایسا کرتے ہوئے دیکھیں گے تو خود بخود آپ کی اتباع کریں گے۔ چناں چہ حضورِ اکرم (ﷺ) باہر تشریف لائے اور جانور ذبح کیا آپ کو قربانی کرتا ہوا دیکھ کر سب لوگ اپنے جانوروں کو ذبح کرنے کے لیے ایسے لپک پڑے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک دوسرے کی گردنیں کاٹ دیں گے۔

آمدم برسرِ مطلب:

تو بات چل رہی تھی کہ جس سے مشورہ کیا جائے وہ تجربہ کار، سمجھ دار، امانت دار اور خیر خواہ ہو۔ حضورِ اکرم (ﷺ) سے بڑھ کر کس کی عقل کامل ہو سکتی ہے اور آپ سے بڑھ کر کس کا علم کامل اور مکمل ہو سکتا ہے، پھر آپ پر باری تعالیٰ کی طرف سے وحی بھی آتی تھی، اس

کے باوجود باری تعالیٰ کی طرف سے آپ کو حکم دیا گیا: "وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ" اور حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس حکم پر عمل کیا، اور بہت سی مرتبہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا اپنا رجحان کچھ اور ہوتا تھا اس کے باوجود آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے دوسروں کی رائے پر فیصلہ کیا جیسا کہ غزوۂ اُحد کے موقع پر ہوا۔

صدیق کی رائے صادق:

اسی طرح صلحِ حدیبیہ کے موقع پر جب نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ عمرہ کا احرام باندھ کر روانہ ہوئے تو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے پہلے سے بُسر بن سفیان نامی ایک جاسوس کو مکہ مکرمہ بھیجا تاکہ وہ مکہ والوں کے حالات سے باخبر کرے، جب نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) غدیرالاشتات ((} vH {٢٣٩٦) پر پہنچے تو آپ کے جاسوس نے آکر اطلاع دی کہ تمام مکہ والے جمع ہوگئے ہیں اور اطراف سے تمام قبائل کو بھی جمع کرلیا ہے، اور دودھ دینے والی اونٹنیوں اور پانی کا انتظام کرلیا ہے، اور انہوں نے طے کیا ہے کہ جو ہونا ہو وہ ہو، لیکن آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) اور آپ کے ساتھیوں کو مکہ مکرمہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ اور خالد بن ولید- جو اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے، ان- کو مقدمۃ الجیش کے طور پر دوسو سواروں کو لے کر روانہ کردیا ہے جو مقامِ غمیم میں پہنچ گئے ہیں، جب یہ اطلاع نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ملی تو آپ نے مشورہ کے لیے حضراتِ صحابہ کو جمع کیا کہ ایسی اطلاع آئی ہے، اب بتاؤ! کیا کرنا ہے؟ اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنی رائے پیش کی کہ میرے ذہن میں تو یہ آتا ہے کہ مکہ کے آس پاس کے جو قبیلے والے مکہ والوں کا ساتھ دینے کے واسطے

پہنچے ہوئے ہیں ،ان کے علاقے لڑنے والوں سے خالی ہوگئے ہیں ،ہم ان کے علاقوں پر جاکر حملہ کردیں،جب ان کو اطلاع ملے گی کہ مسلمانوں نے ہمارے علاقوں پر حملہ کیاہے تووہ مکہ والوں کو چھوڑ کر اپنے علاقوں کی حفاظت کے لیے آجائیں گے،اوراگر نہیں آئیں گے تو نقصان اُٹھائیں گے۔حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول !ہم اور آپ تو مدینہ منورہ سے عمرہ کے ارادے سے نکلے ہیں،اس لیے ہم تو عمرہ کے لئے آگے بڑھتے رہیں ،ہم کو ان کے کسی علاقہ پر حملہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے،ہاں!اگرمکہ مکرمہ میں داخل ہونے سے کوئی ہمیں روکے گا توہم اس کا مقابلہ کریں گے۔حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان کی رائے قبول فرمالی۔

اس واقعہ سے میں یہ بتلانا چاہتاہوں کہ حضورِاکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کومشورہ کا حکم بھی دیا گیا اور بہت سے مواقع پر دوسروں کی رائے اپنی رائے سے مخالف تھی پھر بھی حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان کی رائے قبول فرمالی۔اس طرح آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایک سنت جاری فرمائی کہ اہم معاملات میں خاص طور پر مشورہ کرنا چاہیے ،اورجو حضرات کسی بھی لائن کے ذمہ دار ہیں ان کوتواورزیادہ اہتمام کرنا چاہیے، جیسے:گھر کا ذمہ دار ہوتو اس کوچاہیے کہ گھر کے دوسرے افراد جومشورہ کے قابل ہوں،ان سے مشورہ کرے۔یا خاندان کے دوسرے جو خیر خواہ لوگ ہوں ، ان سے مشورہ کرے۔جماعت کا کام ہے تو اس کے ذمہ داروں سے مشورہ کریں۔

بہر حال! مشورہ ایک بہت اہم چیز ہے، اور اس کی خاص تاکید فرمائی گئی ہے، اسی کو حدیثِ پاک میں حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: مَاخَابَ مَنِ اسْتَخَارَ، وَلَانَدِمَ مَنِ اسْتَشَارَ (المعجم الأوسط: ۶۶۲۷) جس نے استخارہ کیا وہ کبھی ناکام نہیں ہوگا، اور جس نے مشورہ کیا وہ کبھی پچھتائے گا نہیں۔ اس سے مشورہ اور استخارہ دونوں کی اہمیت معلوم ہوتی ہے۔

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ باب انہی دوچیزوں کی اہمیت کو بتلانے کے لیے قائم کیا ہے۔ دو آیتیں مشورہ والی پیش فرمائی ہیں اور روایت استخارہ والی لا رہے ہیں۔ ان میں سے ایک آیت ﴿وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (آل عمران: ۱۵۹)﴾ ہوئی، اور دوسری آیت ہے ﴿وَأَمْرُهُمْ شُورَى بَيْنَهُمْ (الشوریٰ: ۳۸)﴾ اہلِ ایمان کے معاملات آپس کے مشورہ سے طے ہوتے ہیں۔ گویا مشورہ کو ایمان والا ہونے کی علامت بتلایا گیا۔ اس لیے ضروری ہے کہ مشورہ ہو، اس کے اندر بڑی برکتیں ہیں، جہاں اس کا اہتمام کیا جاتا ہے، وہاں اس کے بڑے اچھے نتائج ظاہر ہوتے ہیں۔

استخارہ کی تعلیم اور اس کی اہمیت:

حدیث ۷۱۸:-

وعن جابر رضی اللہ عنہ قَالَ: كَانَ رسولُ الله (صلی اللہ علیہ وسلم) يُعَلِّمُنَا الاسْتِخَارَةَ فی الأمُورِ كُلِّهَا، كَالسُّورَةِ مِنَ القُرْآنِ، يَقُولُ: إِذَا هَمَّ أَحَدُكُمْ بِالأَمْرِ، فَلْيَرْكَعْ رَكْعَتَيْنِ مِنْ غَيْرِ الفَرِيضَةِ، ثُمَّ ليقل: اللَّهُمَّ إِنِّي أَسْتَخِيرُكَ بِعِلْمِكَ، وَأَسْتَقْدِرُكَ بِقُدْرَتِكَ، وأَسْأَلُكَ مِنْ فَضْلِكَ العَظِيمِ، فَإِنَّكَ تَقْدِرُ وَلَا أَقْدِرُ، وَتَعْلَمُ وَلَا أَعْلَمُ، وَأَنْتَ عَلَّامُ

الْغُيُوبِ. اللَّهُمَّ إِنْ كُنْتَ تَعْلَمُ أَنَّ" هَذَا الأَمْرَ" خَيْرٌ لِي فِي دِينِي وَمَعَاشِي وَعَاقِبَةِ أَمْرِي (أَوْ قَالَ) عَاجِلِ أَمْرِي وَآجِلِهِ، فَاقْدُرْهُ لِي وَيَسِّرْهُ لِي، ثُمَّ بَارِكْ لِي فِيهِ. وَإِنْ كُنْتَ تَعْلَمُ أَنَّ" هَذَا الأَمْرَ" شَرٌّ لِي فِي دِينِي وَمَعَاشِي وَعَاقِبَةِ أَمْرِي (أَوْ قَالَ) عَاجِلِ أَمْرِي وَآجِلِهِ؛ فَاصْرِفْهُ عَنِّي، وَاصْرِفْنِي عَنْهُ، وَاقْدُرْ لِيَ الْخَيْرَ حَيْثُ كَانَ، ثُمَّ أَرْضِنِي بِهِ. (قَالَ): وَيُسَمِّي حَاجَتَهُ. (رواہ البخاری.)

ترجمہ:۔حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیِ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم لوگوں کو تمام معاملات میں استخارہ کرنا اس طرح سکھاتے تھے جیسے قرآنِ پاک کی سورت سکھاتے تھے۔ چناں چہ فرماتے تھے کہ جب تمہیں کوئی معاملہ پیش آئے تو چاہیے کہ (اگر مکروہ وقت نہ ہو تو) دو رکعت نفل پڑھے، اس کے بعد یہ دعا پڑھے: اے اللہ! میں تیرے علم کے ذریعہ سے تجھ سے خیر کا سوال کرتا ہوں، اور تیری طاقت سے میں طاقت چاہتا ہوں۔ اے اللہ! میں تیرے بڑے فضل کا سوال کرتا ہوں، اس لیے کہ تو قدرت رکھتا ہے، میرے اندر تو قدرت اور طاقت نہیں ہے، اور سارا علم تو تیرے پاس ہی ہے، میں تو کچھ بھی نہیں جانتا۔ اور تو غیب کی باتوں کو بھی جاننے والا ہے۔ اے اللہ! اگر تیرے علم میں یہ ہے کہ "**یہ کام**" جس کا میں ارادہ کررہاہوں، اس میں میرے لیے میرے دین کے اعتبار سے، دنیوی زندگی کے اعتبار سے، اور انجام کار اور نتیجہ کے اعتبار سے بھلائی ہے، یا فوری طور پر میرے اس کا م میں بھلائی ہے؛ تو اے اللہ! اس کام کو میرے لیے مقدر فرما دے، اور اس کام کو میرے لیے آسان بھی کردے اور پھر اس کام میں میرے لیے برکت رکھ دے۔

اور اے اللہ! اگر تو نے اپنے علم میں یہ بات طے کی ہے کہ "**یہ کام**" میرے لیے میرے دین کے اعتبار سے، اور میری دنیوی زندگی کے اعتبار سے، اور میرے انجام کار کے اعتبار سے برا ہے اور اس میں میرے لیے بھلائی نہیں ہے؛ تو اے اللہ! اس کام کو مجھ سے

پھیر دے، اور مجھے اس سے پھیر دے۔ اور پھر بھلائی جہاں کہیں بھی ہو، اس کا میرے لیے فیصلہ کر دے، پھر مجھے اس پر راضی کر دے۔

اہتمامِ استخارہ کی وجہ:

افادات:- حضورِ اکرم (ﷺ) قرآنِ پاک کی سورتیں جس اہتمام اور تاکید سے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو سکھاتے تھے، اسی اہتمام اور تاکید کے ساتھ استخارہ اور اس کی دعا بھی صحابہ کو سکھاتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ زمانۂ جاہلیت میں لوگوں نے اپنے اہم معاملات کے فیصلے کرنے کے لیے عجیب و غریب طریقے اختیار کر رکھے تھے، جن کی بنیادیں صرف توہمات اور خیالات پر تھیں اور ان کو بڑی اہمیت دے رکھی تھی، حضورِ اکرم (ﷺ) نے زمانۂ جاہلیت میں رائج ان توہّمات پر مبنی سارے طریقوں کو منع فرمادیا، اور ایک بہترین چیز امت کو عطا فرمائی۔

کہانت:

وہ مختلف طریقے کیا تھے جو اس زمانہ میں رائج تھے؟

ایک طریقہ "کہانت" تھا۔ "کاہن" وہ آدمی کہلاتا ہے جو مستقبل کی خبریں بتائے؛ جس کو ہم جوتشی کہتے ہیں۔ زمانۂ جاہلیت میں کاہنوں کا بڑا رواج اور دَوردورہ تھا کوئی قبیلہ ایسا نہیں تھا جس میں کوئی کاہن نہ ہو اور وہ قبیلے والے اپنے اہم معاملات میں اس کی خدمت میں حاضر ہوتے

تھے، اور چوں کہ وہ دعویدار ہوتا تھا کہ آئندہ جو باتیں پیش آنے والی ہیں وہ مَیں جانتا ہوں، اس لیے لوگ اس سے پوچھتے تھے کہ مثلاً: ہم اپنے لڑکے کی شادی فلاں جگہ کرانا چاہتے ہیں، ٹھیک رہے گا یا نہیں؟ پھر وہ اپنے حساب سے کہتا کہ، ہاں صحیح ہے؛ تو وہ کرتے تھے۔ یا کوئی پوچھتا کہ: ہم یہ تجارت کرنا چاہتے ہیں، فلاں کاروبار شروع کرنا چاہتے ہیں، فلاں سفر کرنا چاہتے ہیں، ایسے مختلف اہم کاموں کے سلسلہ میں کاہنوں کے پاس جاتے تھے اور کاہن ویسے ہی مشورہ نہیں دیتا تھا، بلکہ جانے والا پہلے اس کی خدمت میں ہدیہ پیش کرتا تھا جو عام طور پر سو درہم ہوتے تھے، یہ معمولی رقم نہیں ہوتی تھی بلکہ بڑی رقم ہوتی تھی، اس کے بعد وہ اپنی حاجت پیش کرتا تھا کہ مَیں اس مقصد کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ یہ جو رقم پیش کی جاتی تھی اسی کو حدیث میں "**حُلْوَانُ الْکَاهِنِ**" کاہن کی شیرینی اور مٹھائی کہا گیا ہے۔ ہماری زبان میں بھی مٹھائی بول کر مٹھائی مراد نہیں لی جاتی، جیسے: کہتے ہیں کہ بھائی! مٹھائی لاؤ یعنی کوئی چیز لاؤ۔ اور حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حرام کمائی کی جو چیزیں بتلائی ہیں اس میں "حلوان الکاہن" بھی ہے، یعنی کاہن کی خدمت میں اس مقصد کے لیے جو کچھ پیش کیا جاتا تھا؛ چوں کہ ایک غلط کام کے لیے ہوتا تھا، اس لیے وہ کمائی بھی حرام ہے۔

زَجر:

دوسرا طریقہ "زَجر" کا تھا، یعنی کبھی کسی کام کا ارادہ کرتے تھے تو جانوروں کی آوازیں سنتے تھے۔ اس زمانہ میں بعض قبیلہ کے لوگ ایسے ہوتے تھے جو جانوروں کی آوازوں کے ماہر ہوتے

تھے، وہ ان کی آواز سن کر بتاتے تھے کہ اس جانور کی اس آواز کا مطلب یہ ہے کہ تم کو یہ کام نہیں کرنا چاہیے، اس میں کامیابی نہیں ہوگی، کبھی کہتے کہ کرو؛ کامیابی ہوگی۔ اسی طرح باہر نکلے اور کوئی جانور سامنے سے گزر گیا، جیسے: بلّی سامنے سے گزری، تو سمجھتے تھے کہ یہ کام نہیں کرنا ہے، آج بھی ایسا ہوتا ہے کہ بلّی اگر راستہ کاٹ جائے تو بعض لوگ واپس گھر میں گھس جاتے ہیں، یعنی تمہاری قسمت کا سارا فیصلہ اس بلّی ہی نے کرڈالا۔ جب ہمارا ایمان تقدیر پر ہے کہ سب کچھ اللہ تعالیٰ طے کر چکے ہیں، تو بلّی کے گزر جانے سے اس میں کوئی تبدیلی آسکتی ہے؟ اسی کو **"زجر"** والا طریقہ کہتے تھے۔

تطیُّر اور طیرہ:

ایک تیسرا طریقہ بھی تھا، جس کو **"تطیُّر اور طیرہ"** کہتے ہیں، یعنی شگون اور فال لینا۔ اس میں یہ کرتے تھے کہ گھر سے باہر نکلے اور کوئی پرندہ بیٹھا ہوا دیکھا تو کنکر مار کر اس کو اڑاتے تھے، اگر وہ اُڑ کر دائیں طرف گیا تو سمجھتے تھے کہ اس کام میں کامیابی ہوگی اور بائیں طرف جاتا تو سمجھتے تھے کہ ناکامی ہوگی۔ دائیں طرف جانے والے پرندے کو یہ لوگ **"سوانح"** کہتے تھے، اور بائیں طرف جانے والے کو **"بوارح"** کہتے تھے۔

اب آپ ہی فیصلہ کیجئے کہ یہ معاملہ عقل کے بالکل خلاف ہے یا نہیں! ایک جانور اگر اُڑا، تو اس کو تمہارے کام سے کیا لینا دینا۔ وہ اگر دائیں طرف اڑا تو کامیابی اور بائیں طرف اڑا تو ناکامی؛ یہ

کوئی سمجھ میں آنے والی بات ہے؟ عقل اس کو تسلیم کر سکتی ہے؟ یہ سب توہُّمات ہیں، اسلام ایسی چیزوں کی ہرگز اجازت نہیں دیتا۔ اسلام تو اللہ تعالیٰ کی ذات پر یقین و توکل اور بھروسہ کرنے اور اسی سے امیدیں قائم کرنے کا سبق دیتا ہے۔

اِسْتِقْسَام بِالْاَزْلَام:

ایک اور طریقہ "**إِسْتِقْسَام بِالْأَزْلَام**" کا تھا۔ تیروں کے پاسے ڈالے جاتے تھے۔ ویسے تیر میں تو آگے لوہے کا نوکیلا حصہ اور پیچھے پَر ہوتا ہے، لیکن اس کام کے لیے جو تیر ہوتے تھے اس میں آگے اور پیچھے کچھ نہیں ہوتا تھا، صرف لکڑی ہوتی تھی، اور ایسے کل سات تیر ہوتے تھے۔ ایک تیر پر لکھا ہوتا تھا: "أَمَرَنِي رَبِّيْ" مجھے میرے رب نے اس کام کو کرنے کا حکم دیا۔ دوسرے پر لکھا ہوتا تھا: "نَهَانِيْ رَبِّيْ" مجھے میرے رب نے اس کام سے منع کیا۔ یہ دو تیر ہوئے، تین تیر اور ہوتے تھے، ایک پر لکھا ہوتا تھا: "وَاحِدٌ مِّنْكُمْ" دوسرے پر ہوتا تھا: "مِنْ غَيْرِكُمْ" تیسرے پر لکھا ہوتا تھا: "مُلْصَقٌ"۔ دو تیر اور ہوتے تھے، ایک پر لکھا ہوتا تھا: "اَلْعَقْلُ" اور دوسرے پر لکھا ہوتا تھا: "اَلْغَفَلُ"؛ اس طرح کل سات تیر ہوئے۔

عام طور پر ان کے یہاں کوئی جھگڑا کسی کے نسب کے بارے میں ہوتا کہ یہ تمہارے قبیلے سے ہے یا نہیں؛ تو اس جھگڑے کے لیے تو وہ تین تیر استعمال کئے جاتے تھے۔ اور اگر کسی کے قتل کا معاملہ ہو، اور اس سے خون بہا اور دیت لینی ہو، تو اس کے لیے اخیری دو تیر استعمال کئے

جاتے تھے۔ان کے علاوہ اور کوئی بھی اہم کام ہوتا تھاتواس کے لیے پہلے والے دو تیر استعمال ہوتے تھے۔اورچوں کہ وہ لوگ بتوں کی پوجا کیا کرتے تھے، اور ہر قبیلے کا ایک بت ہوا کرتا تھا،اوروہ بت جس مکان اوربت خانے میں رکھا ہوتا تھا اس کے پجاری کی بہت ساری ذمہ داریاں اور ڈیوٹیاں ہوتی تھیں،ان میں سے ایک ذمہ داری اورڈیوٹی یہ بھی تھی کہ لوگوں کے معاملات میں مشورہ دے اورفیصلہ کرے۔یہ سب تیر الگ الگ تھیلوں میں اس پجاری کے پاس اسی بت خانے میں رکھے ہوتے تھے۔اب مثلاً:کسی کو سفر کرنا ہوتا تووہ مندر کے اس پجاری کے پاس جاتا اس کو ہدیہ پیش کرتا،پھرسوال کرتا کہ: ایک تجارتی سفر کا ارادہ ہے ،اس سلسلہ میں کیا فیصلہ ہے؟تووہ دو تیر والا چمڑے کا ایک تھیلا نکالتا۔اور بعض روایتوں میں ہے کہ وہ دو تیر نکال کر اس پر کپڑا ڈال دیتا تھا،آنکھیں بند کرکے کچھ بڑبڑا کرایک تیر اُٹھاتا تھا اور اس پر دیکھتا کہ کیا لکھا ہوا ہے،اگر وہ تیر ہوتا جس پر ”أَمَرَنِي رَبِّيْ“ لکھا ہوتا تھا کہ مجھے میرے رب نے اس کام کو کرنے کا حکم دیا؛تو کہتا یہ سفر کرو، اس میں کامیابی ہے۔اور اگر دوسرا تیر نکلتا جس پر لکھا ہوتا تھا ”نَهَانِيْ رَبِّيْ“ مجھے میرے رب نے اس کام سے منع کیا؛تو کہتا کہ یہ سفر کرنے جیسا نہیں ہے۔اور یہاں رب بول کر وہی بت مراد ہوتا تھا جو اس مندر میں رکھا ہوتا تھا،اوراس کی بنیاد توہّم پر تھی۔یہ سارے طریقے زمانۂ جاہلیت میں رائج تھے،اوراس کا بڑا رواج تھا۔

ایک غلط رواج:

آج کل بھی فال کے نام پر بہت کچھ کیا جاتا ہے، جیسے: بعض لوگ کرتے ہیں کہ قرآن کھولو ایک دو صفحات اِدھر اُدھر سے دیکھ کر کہتے ہیں کہ، یہ کرو، اور یہ مت کرو۔ ان سے پوچھئے کہ یہ طریقہ کہیں کسی حدیث میں آیا ہے؟ بالکل نہیں۔ اور بعض طریقے تو زمانۂ جاہلیت والے طریقوں سے بالکل مشابہ ہو جاتے ہیں، اس لیے ان سارے طریقوں کو چھوڑ کر حضورِ اکرم (ﷺ) نے استخارہ کا طریقہ بتایا ہے؛ وہ کرو۔

استخارہ کی لغوی تحقیق:

استخارہ عربی زبان کا لفظ ہے، اور عربی زبان کے مصدر استفعال سے ہے۔ اب اس کا مادہ کیا ہے؟ تو بعض حضرات تو فرماتے ہیں کہ استخارہ ''خیر'' سے مشتق ہے، 'سین' اور 'تاء' طلب کا معنٰی دینے کے لیے آتے ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ سے خیر اور بھلائی طلب کرنا۔ گویا جو کام کرنا ہے اس میں اللہ تعالیٰ سے خیر کا سوال کرنے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا جائے جو حضورِ اکرم (ﷺ) نے بتلایا۔ اور بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اس کا مادہ ''خِیَرَۃٌ'' ہے، جس کا معنٰی ہے انتخاب اور فیصلہ۔ جیسے قرآنِ پاک میں ہے: ﴿مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ﴾ تو استخارہ یعنی اللہ تعالیٰ سے فیصلہ مانگنا کہ اے اللہ! میں یہ کام کرنا چاہتا ہوں، تو ہی اس کام میں میرے لیے فیصلہ کر دے کہ مَیں کروں یا نہ کروں۔

استخارہ کن کاموں میں کیا جائے؟:

"إِذَا هَمَّ أَحَدُكُمْ بِالْأَمْرِ" یعنی جب تم کو کوئی معاملہ پیش آئے۔ یہاں کون سا معاملہ مراد ہے؟ تو سمجھنا چاہیے کہ ایک تو روزمرّہ کے معاملات ہوتے ہیں جن کو امورِ عادیہ کہا جاتا ہے، جیسے: کھانا، پینا، سونا، دوکان اور کاروبار پر جانا وغیرہ؛ اس کے لیے استخارہ نہیں کیا جائے گا، یہ تو روزمرّہ کے امورِ عادیہ ہیں۔

کچھ کام وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ اور شریعت کی طرف سے لازم اور ضروری کئے گئے ہیں، جیسے: پنج وقتہ نماز پڑھنا، روزے رکھنا، حج کرنا وغیرہ۔ تو اب مَیں حج کروں یا نہ کروں؟ ایسا استخارہ نہیں کیا جائے گا۔ جب تم پر حج فرض ہوگیا ہے تو وہ تو کرنا ہی کرنا ہے، اس میں استخارہ کیا معنیٰ رکھتا ہے؟ مَیں نماز پڑھنے کے لیے جاؤں یا نہ جاؤں؟ یہ استخارہ کی چیز نہیں ہے۔ جو چیز شریعت کی فرض و واجب کی ہوئی ہے؛ اس میں استخارہ کیا کرنا؟

کچھ کام حرام اور ممنوع ہیں، ان کے بارے میں استخارہ کرنا کہ مثلاً: فلاں جگہ ڈاکہ ڈالنا ہے؛ جاؤں یا نہ جاؤں؟ جیسے: بعض لوگ (لاٹری کا) نمبر پوچھنے کے لیے جاتے ہیں۔ ارے بھائی! یہ تو حرام کام ہے جو کرنے کا ہے ہی نہیں۔ تو جو حرام اور ناجائز کام ہیں ان کے لیے بھی استخارہ نہیں ہے۔

استخارہ تو ان کاموں میں ہوتا ہے جو جائز ہیں، یا کم از کم مستحب ہیں کہ جن کے کرنے میں ثواب ہے، اور نہ کرنے میں کوئی گناہ نہیں، جیسے: فلاں گاؤں میں مسجد بنانی ہے، تو بناؤں یا نہ بناؤں؟ اس کا استخارہ کر سکتے ہیں۔ اس لیے کہ مسجد نہ بنانے پر کوئی گناہ ہونے والا نہیں ہے۔ یا مسجد تو بنانی ہی ہے لیکن کون سے گاؤں یا شہر میں بناؤں، اس کا استخارہ کر سکتے ہیں۔ تو استخارہ ناجائز کام کے لیے نہیں ہوتا، بلکہ جائز اور مباح کام کے لئے ہوتا ہے۔ مثلاً: آپ کاروبار کرنا چاہتے ہیں، اب کون سا کاروبار کروں، کپڑوں کی دلالی کا کروں، دوکان کھولوں، ہوٹل کھولوں، فلاں کام کروں، یا فلاں کروں؛ کئی چیزیں آپ کے سامنے ہیں اور مختلف لوگوں نے مختلف باتیں رکھی ہیں کہ تمہارے لیے فلاں چانس ہے، اور فلاں چانس بھی ہے، اور وہ سب جائز کام ہیں؛ تو اب آپ استخارہ کیجئے، پھر فیصلہ کیجئے۔

یا مثلاً: کوئی سفر درپیش ہے، اور اس کے معاملہ میں تردد ہے کہ کروں یا نہ کروں۔ یا مثلاً: نکاح کا معاملہ ہے، لڑکی کا رشتہ کرنا ہے، اور تردد ہے کہ کروں یا نہ کروں؛ تو اس سلسلہ میں استخارہ کر لیجئے۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی بھی اہم کام ہو، جو روزمرّہ کا نہ ہو، بلکہ زندگی میں ایک آدھ بار کیے جانے والے کاموں میں سے ہو؛ ایسے کاموں میں آدمی کو چاہیے کہ استخارہ کرے، بس! شرط یہ ہے کہ وہ جائز کام ہو۔

مسنون استخارہ:

”دو رکعت نفل پڑھے“: اور یہ یاد رہے کہ ایسا بھی ضروری نہیں ہے کہ سوتے وقت ہی ہو، کبھی بھی نماز پڑھ کر دعا کرلیجئے، بس مکروہ وقت نہیں ہونا چاہیے۔ ہاں! یہ ہے کہ اطمینان اور یکسوئی والا استخارہ وہ ہے کہ رات کو سونے سے پہلے دو رکعت پڑھ کر دعا کرلی جائے، پھر سنت کے مطابق دائیں کروٹ پر رخ کرکے سو جائے، لیکن یہ کوئی ضروری نہیں ہے، اس دعا کے پڑھنے کے بعد سو جانے والی بات کسی حدیث میں نہیں آئی ہے، اگر آپ نے دو رکعت نماز پڑھ کر استخارہ والی دعا پڑھ لی، تو مسنون استخارہ ہو گیا اور حدیث پر عمل ہو گیا۔ یہ یاد رہے۔

دعا کے آداب:

حدیث میں دعا کے آداب آئے ہیں، تو آداب کا تقاضہ ہے کہ اس دعا سے پہلے ان کا بھی لحاظ کرلیا جائے۔ دعا کے آداب میں سے یہ ہے کہ دعا کی شروعات اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء سے کی جائے، جیسے: کسی کے نام درخواست لکھتے ہیں اور عرضی لے کر جاتے ہیں تو اپنی بات پیش کرنے سے پہلے اس کے القاب و آداب لکھے جاتے ہیں کہ، آپ ایسے ہیں اور ویسے ہیں، لوگوں کی حاجتوں کی طرف توجہ کرنے والے ہیں، مَیں بھی آپ کی خدمت میں اس امید پر یہ درخواست پیش کررہا ہوں کہ اس کو آپ قبول فرمائیں گے۔ یہ پورا ایک طریقہ ہے، اسی کو تمہید کہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کو اپنی حمد بہت پسند ہے، اس لیے دعا کے آداب میں سے یہ ہے کہ پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کی جائے۔

یہ سب حمد و ثناء ہی ہے:

بعض لوگ سوچتے ہیں کہ حمد کے لیے عربی کے الفاظ کہاں سے یاد کریں؟تو بھائی الحمد شریف تو سب کو یاد ہی ہوتی ہے ،وہ اللہ تعالیٰ کی حمد ہی ہے، نماز میں پڑھی جانے والی ثناء بھی حمد ہی ہے، تیسرا اور چوتھا کلمہ بھی اللہ تعالیٰ کی حمد ہی ہے، آیت الکرسی بھی حمد ہی ہے،ان میں سے کوئی بھی پڑھ لو۔ یہ سب آسانی کے لیے بتلا رہا ہوں ،اس میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء آگئی۔ پھر دعا کو قبولیت سے قریب کرنے والی چیز نبی کریم ﷺ پر درود ہے،اس لیے حمد و ثناء کے بعد درود پڑھو،سب سے اعلیٰ درود وہی ہے جو نماز کے اندر پڑھا جاتا ہے جس کو درودِ ابراہیمی کہتے ہیں، اس کے علاوہ بھی دوسرے درود پڑھنا چاہو تو پڑھو،اس کے بعد پھر استخارہ والی یہ دعا پڑھو۔

دعائے استخارہ کی تشریح:

”اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَسْتَخِیْرُکَ بِعِلْمِکَ“ اے اللہ !مَیں تیرے علم کے ذریعہ تجھ سے خیر کا سوال کرتا ہوں۔ جیسے: کوئی ہم سے زیادہ جاننے والا ہوتا ہے تو ہم اس سے کہتے ہیں کہ بھائی!اس سلسلہ میں آپ

ہی بتاؤ۔ تو اللہ تعالیٰ کا علم ساری چیزوں کو محیط ہے، تو اس میں آدمی اللہ تعالیٰ سے خیر و بھلائی یا فیصلہ مانگتا ہے۔

"وَأَسْتَقْدِرُكَ بِقُدْرَتِكَ" اور تیری طاقت سے میں طاقت چاہتا ہوں۔ ہم لوگوں نے اپنا ذہن ایسا بنالیا کہ ہماری سوچ اسباب ووسائل تک محدود ہوگئی۔ جیسے: ایک آدمی تجارت کرنا چاہتا ہے، تو اس کے لیے جگہ اور جتنے کونٹیکٹ (Contact) ضروری ہیں وہ، اور ایڈورٹائز وغیرہ؛ یہ ساری چیزیں اختیار کرلیتا ہے، پھر وہ آدمی سمجھتا ہے کہ اب میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ یہیں آکر ہم سے غلطی ہو جاتی ہے، حالاں کہ ایک مؤمن کی نظر ان اسباب ووسائل کی طرف نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف ہونی چاہیے، اسباب ووسائل کو سبب کے درجہ میں اختیار کرے، لیکن نظر مسبب الاسباب اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہی ہونی چاہیے، بھروسہ واعتماد اسی پر ہو، کرنے والا وہی ہے۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں: "عَرَفْتُ رَبِّيْ بِفَسْخِ الْعَزَائِمِ" میں نے اپنے رب کو اپنے پختہ ارادوں کے ٹوٹنے پر پہچانا۔ آدمی کیسے کیسے پکّے ارادے کرتا ہے اور اس کے لیے کیسی لمبی چوڑی پلاننگ کرتا ہے، لیکن ساری پلاننگ زلزلہ کے ایک جھٹکے میں ختم ہو جاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت کے سامنے انسان کی ساری پلاننگ کی کیا حیثیت ہے؟

جب جیب کٹی:

ایک آدمی گھوڑا خریدنے جارہا تھا، کسی نے پوچھا: کہاں جارہے ہو؟ کہا: گھوڑا خریدنے۔ پوچھنے والے نے کہا: ان شاء اللہ کہو۔ تو وہ کہتا ہے: اس میں ان شاء اللہ کیا کہنا! میرے پاس پیسے ہیں، بازار جارہا ہوں، وہاں گھوڑے بکنے کے لیے آئے ہیں، میں خریدنے کے لیے جارہا ہوں، اگر پسند آگیا تو لے لوں گا؛ اب اس میں کیا باقی رہ گیا۔ اس نے کہا: ٹھیک ہے بھائی! جاؤ۔ دوسرے دن بازار لگنے والا تھا، یہ آدمی گیا، رات میں ایک مسافر خانہ میں آرام کیا، اسی میں اس کی جیب کٹ گئی۔ صبح اُٹھ کر دیکھتا ہے تو پیسے ہی نہیں ہیں، اب کیا گھوڑا خریدتا! واپس لوٹ رہا تھا، وہی آدمی ملا تو پوچھنے لگا کہ بھائی! کیا ہوا؟ گھوڑا نہیں خریدا؟ تو یہ کہتا ہے: بس! ان شاء اللہ میں جارہا تھا، ان شاء اللہ وہاں پہنچا، ان شاء اللہ رات کو سو گیا، ان شاء اللہ صبح جب اُٹھا تو دیکھا کہ ان شاء اللہ میری جیب کٹ گئی تھی، تو ان شاء اللہ اب مَیں واپس ہو رہا ہوں۔ جب جیب کٹی تو سبق سمجھ میں آگیا، اور ایسا آیا کہ جہاں ان شاء اللہ نہیں کہنا چاہیے وہاں بھی ان شاء اللہ منہ سے نکل رہا ہے۔

دعائے استخارہ کی روح:

اسی لیے اسباب اختیار کرنے کے بعد بھی مؤمن کی نگاہ اور اعتماد تو اللہ تعالیٰ کی ذات ہی پر ہونی چاہیے؛ اسی کا نام توکل ہے۔ اور اعلیٰ درجہ کا توکل یہی ہے کہ بظاہر سب کچھ نظر آرہا ہے،

ایک پائی کی بھی کمی نہیں ہے، دل کا یقین کہتا ہے کہ یہ کام ہو کر رہے گا؛ پھر بھی اس پر بھروسہ نہ ہو۔ مؤمن تو ہر وقت یہی کہتا کہ اگر اللہ تعالیٰ کرے گا تو ہو گا۔ استخارہ کی دعا میں یہی سکھایا گیا ہے۔ توکل یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات پر اعتماد و بھروسہ، تفویض یعنی اپنا معاملہ اللہ تعالیٰ کے حوالہ کرنا۔ جیسے: ہمارا چھوٹا بچہ کہتا ہے کہ ابا جان! میرے پاس یہ سب کچھ ہے، لیکن آپ جو فیصلہ کریں گے، مَیں تو اسی پر چلوں گا؛ تو آپ اندازہ لگائیے کہ باپ کو اس بچہ کے ساتھ کیسا تعلق ہو گا؟ پھر باپ پوری کوشش کرے گا کہ یہ کام پورا ہونا ہی چاہیے۔ تو ہم جب اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے حوالے کر دیں گے اور کہیں گے کہ: اے اللہ! میں نے یہ اسباب تو اپنی جگہ پر اختیار کر لیے، لیکن میرے علم اور میری قدرت کی کیا حیثیت ہے، تیرا علم تیری قدرت اور تیرا فیصلہ ہی سب کچھ ہے، تو جو کرے اسی پر میں آس اور امید لگائے ہوئے بیٹھا ہوں؛ تو پھر دیکھو کہ اللہ تعالیٰ کیا کرتا ہے۔

دراصل نبیٔ کریم ﷺ کی تعلیمات ہر مؤمن کا مزاج یہی بنانا چاہتی ہے۔ اسباب کے اختیار کرنے سے منع نہیں کیا، بلکہ اسباب کا حکم دیا کہ اسباب اختیار کرو، لیکن نظر ان اسباب پر نہیں ہونی چاہیے، بلکہ نظر اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہونی چاہیے۔ اسی کو کہتے ہیں: "وَأَسْتَقْدِرُكَ بِقُدْرَتِكَ" اے اللہ! تیری طاقت سے مَیں طاقت حاصل کرنا چاہتا ہوں، میرے اندر قدرت اور طاقت ہی کہاں ہے، قدرت والا تو تو ہی ہے، تیری ذات ہی سے مَیں مدد و قدرت حاصل کرنا چاہتا ہوں۔

”وَأَسْأَلُكَ مِنْ فَضْلِكَ الْعَظِيمِ“ اور اے اللہ !میں تیرے بڑے فضل کا سوال کرتا ہوں، میرا تجھ پر کوئی حق نہیں ہے۔کیا بندے کی اللہ تعالیٰ پر کوئی زبردستی ہے؟ وہ دے تو اس کا فضل ہے،اور اگر نہ دے تو اس سے چھین کر کون لے سکتا ہے؟ اس لیے کہا کہ: اے اللہ !تیرا فضل بہت بڑا ہے،اسی فضلِ عظیم کا مَیں تجھ سے سوال کرتا ہوں۔

آگے فرمایا:”فَإِنَّكَ تَقْدِرُ وَلاَ أَقْدِرُ“اس لیے کہ تو قدرت رکھتا ہے، میرے اندر تو کوئی قدرت اور طاقت نہیں ہے۔

”وَتَعْلَمُ وَلاَ أَعْلَمُ“اور سارا علم تو تیرے پاس ہے، مَیں تو کچھ جانتا بھی نہیں ، اس کام کا آئندہ کیا نتیجہ ہونے والا ہے،اور آگے پیچھے، اندر باہر اس کے کیا اثرات ہیں ؛ وہ سب تو جانتا ہے، مَیں تو جانتا بھی نہیں۔

”وَأَنْتَ عَلاَّمُ الْغُيُوبِ“ اور تو تو غیب کی باتوں کو بھی جاننے والا ہے۔

دعا کا عجیب وغریب انداز:

یہ سب کہنے کے بعد اب آگے کہا جارہا ہے کہ:اے اللہ !اگر تیرے علم میں یہ ہے کہ ”یہ کام“ جس کا مَیں ارادہ کررہا ہوں ، اس میں میرے لیے میرے دین کے اعتبار سے،دنیوی

زندگی کے اعتبار سے، انجام کار اور نتیجہ کے اعتبار سے بھلائی ہے؛ تو اس کام کو تو میرے لیے آسان کر دے، اور میری تقدیر میں لکھ دے۔ دیکھو! جتنی بھلائیاں ہو سکتی ہیں، وہ سب مانگ لیں۔

اور بعض روایتوں میں ہے کہ فوری طور پر میرے اس کام میں میرے لیے دنیا اور آخرت میں بھلائی ہے، تو اے اللہ! اس کام کو میرے لیے مقدر فرما دے، اور اس کا فیصلہ کر دے کہ یہ کام ہو جائے، اور اس کام کو میرے لیے آسان بھی کر دے، پھر اس کام میں میرے لیے برکت رکھ دے۔

اور اے اللہ! اگر تو نے اپنے علم میں یہ بات طے کی ہے کہ **"یہ کام"** میرے لیے میرے دین، میری دنیوی زندگی، اور میرے انجام کار کے اعتبار سے برا ہے، اس میں میرے لیے بھلائی نہیں ہے، تو اس کام کو مجھ سے پھیر دے، اور مجھے اس سے پھیر دے، اور پھر بھلائی جہاں کہیں بھی ہو، اس کا میرے لیے فیصلہ کر دے، اور پھر مجھے اس پر راضی کر دے۔

بہت سی مرتبہ کوئی بات ہماری بھلائی کی ہوتی ہے، لیکن ہمارا دل اس کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتا، پھر بعد میں کہتے ہیں کہ یار وہی ٹھیک تھا۔ اس لیے کہا کہ اس وقت میں اس کو دل سے مان لوں۔

غور کیجیے کہ حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کیسا کیسا مانگا ہے! کیسی عجیب و غریب چیزیں ہیں! ایک بندہ جب اپنے کسی کام میں اللہ تعالیٰ کے سامنے اس طرح سوال کرے گا کہ گویا اپنا سب کچھ اللہ

تعالیٰ کے حوالہ کررہاہے اوراس کے بعد آگے بڑھ رہا ہے،تو اندازہ لگایئے کہ کبھی وہ ناکام ہوسکتاہے؟ اوراگرخدانہ کرے کبھی ظاہری طور پر کوئی ناکامی ہوئی؛ تب بھی اس کادل مطمئن رہے گا۔

"**هٰذَاالْأَمْرَ**" کہتے وقت اس کام کادل میں تصورکرلے،یازبان سے اس کام کوبولے۔یہ استخارہ کاطریقہ ہے۔

دیکھئے !نبیٔ کریم (ﷺ) نے کیسی بہترین تعلیم دی ہے!ایک بندے کواللہ تعالیٰ کے ساتھ بالکلیہ جوڑدیا،جیساکہ پہلے بچہ کی ایک مثال دی تھی۔اسی طرح ہمارانوجوان بیٹاہے جس کے پاس سب کچھ ہے،اس میں ساری صلاحیتیں ہیں اس کے باوجود سب کچھ اباکے حوالہ کردے کہ آپ جو کہیں گے وہی ہوگا،تو اباجان کبھی کوئی ایسی شکل سوچیں گے ہی نہیں جس میں ناکامی ہو، بلکہ اس کو پورے طورپر کامیاب کراکرہی رہیں گے۔اسی طرح بندہ جب اپنے آپ کوپوارااللہ تعالیٰ کے حوالہ کردے گااوراللہ تعالیٰ ہی سے توفیق مانگے گااور اللہ تعالیٰ کے فیصلہ پرچلے گا؛تو پھروہ ضرورکامیاب ہوگا۔

استخارہ کے بعد پتہ کیسے چلے؟:

اب استخارہ کے بعد فیصلہ خواب میں نظر آنا چاہیے یا نہیں ؟تو یہ دھیان رہے کہ خواب کا نظر آنا تو کوئی ضروری نہیں ہے۔ہاں ! کبھی آ بھی جاتا ہے کہ آدمی اس کام کو کرتے ہوئے دیکھتا ہے، گویا اشارہ ہوتا ہے کہ یہ کام کرو، کبھی اس کام سے دور ہوتے ہوئے اور بچتے ہوئے دیکھتا ہے، یہ اشارہ ہوتا ہے کہ یہ کام مت کرو۔ لیکن یہ کوئی ضروری نہیں ہے۔

اور اگر کوئی خواب تو نظر نہیں آیا، مگر استخارہ کرنے سے پہلے اس کام کو کرنے کا آپ کے دل میں جو خیال تھا وہ استخارہ کے بعد اور زیادہ جم گیا اور مضبوط ہو گیا،وہ خیال اور قوی ہو گیا؛ یہ بھی اس بات کی علامت ہے کہ اس کام کو کرو۔ یا اس کام کا ارادہ استخارہ کے بعد کم ہو گیا؛ تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ مت کرو۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ استخارہ کے بعد اپنے کسی محسن سے مشورہ کیا تو اس نے کہا کہ کرو، تو یہ علامت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس استخارہ کے نتیجہ میں اس کے دل میں ڈالا ہے کہ اس سے کہو کہ اس کام کو کرے؛ لہٰذا اس کو کرلو۔ یا اس نے منع کیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کے دل میں منع کرنے کا خیال ڈالا، یہ اسی استخارہ کا اثر ہوتا ہے؛ لہٰذا مت کرو۔

استخارہ کتنے دن ؟:

اب استخارہ کتنے دنوں تک کیا جائے؟ تو فقہاء نے لکھا ہے کہ سات دن تک کیا جائے، اور اگر جلدی ہو تو ایک ہی دن میں سات مرتبہ یہ دعا پڑھ لی جائے۔

اور بعض حضرات تو فرماتے ہیں کہ یہ دعا پڑھ لینے کے بعد وہ کام کر ڈالو، جو خیر ہو گی وہی کام اللہ تعالیٰ آپ کے ذریعہ سے کروائے گا۔

دوسرے سے استخارہ کرایا جاسکتا ہے؟

تو اس سلسلہ میں مَیں نے کسی کتاب میں دیکھا نہیں ہے، اور پہلے پہل جب میں نے سنا کہ کسی دوسرے سے استخارہ کروایا جاتا ہے، تو مجھے بھی عجیب و غریب لگا کہ اپنا کام ہے اور دوسرے سے کیسے استخارہ کروایا جائے؟ لیکن اپنے بزرگوں میں سے بعض کے یہاں سنا کہ فلاں صاحب نے ان سے استخارہ کروایا اور انہوں نے کر کے دیا تو پھر ہم بھی ماننے والے بن گئے۔ ورنہ کسی کتاب میں مَیں نے یہ طریقہ دیکھا نہیں ہے کہ اپنا استخارہ دوسرے سے کرواؤ۔ یہاں اہلِ علم موجود ہیں، ان میں اگر کسی نے کسی کتاب میں دیکھا ہو، تو مجھے بھی بتا دیں؛ تاکہ میرے علم میں اضافہ ہو جائے۔

إستحباب الذهاب

الی العید الخ

عید کی نماز کے لیے مختلف راستوں سے آنا جانا

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

باب کا عنوان:

آداب کا بیان چل رہا ہے ،ایک اور ادب بتلایا جارہا ہے کہ :عید کی نماز کے لیے جاتے ہوئے اور واپسی میں،اسی طرح بیمار کی خبر گیری اور عیادت کے لیے جانے آنے میں ،اسی طریقہ سے حج کے لیے،اللہ کے راستہ میں جہاد کے لیے،جنازہ کی شرکت کے لیے،اور جتنے بھی نیکی کے کام ہیں، ان سب میں مستحب یہی ہے کہ اگر ایک راستہ سے جائے تو دوسرے راستہ سے لوٹے؛تاکہ نیکی کی جگہیں زیادہ سے زیادہ ہو جائیں۔

قیامت کی کچہری کے گواہ:

دراصل یہ بات تو قرآنِ پاک کی آیت اوراحادیث سے ثابت ہے کہ بندے کے اعمال کے متعلق قیامت میں اللہ تعالیٰ جن گواہوں کو قائم فرمائیں گے،ان میں زمین کے وہ حصے بھی ہوں گے جہاں اس نے وہ اعمال کیے تھے۔آدمی جو بھی اعمال کرتا ہے ان کے متعلق مختلف گواہ قیامت کے دن پیش کیے جائیں گے ،جیسے:کورٹ کا دستور ہے کہ مجرم کے خلاف ثبوت مہیا کیے جاتے ہیں اور ان ثبوت کو پیش کرنے کے بعد اس کے اوپر جرم ثابت کیا جاتا ہے، پھر سزا کا فیصلہ سنایا جاتا ہے۔قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے یہاں بھی یہی کارروائی کی جائے گی،اگرچہ اللہ

تعالیٰ ساری چیزیں جانتے ہیں،وہ دانا وبینا ہیں،سب کچھ اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے،اس کے باوجود اللہ تعالیٰ حجت قائم کرنے کے لیے بندوں کے خلاف گواہ پیش کریں گے، اور ان گواہوں کے ذریعہ ان کے گناہوں کو ثابت کیا جائے گا،اوراس کے بعد سزا سنائی جائے گی۔قرآنِ پاک میں ہے: ﴿يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ أَخْبَارَهَا﴾ اس دن زمین اپنی خبریں سنائے گی۔اس کے متعلق مفسرین لکھتے ہیں کہ جو بھی اعمال اچھے یا برے اس نے زمین پر کیے ہیں ، قیامت کے روز زمین کا وہ حصہ اور ٹکڑا اس کے متعلق گواہی دے گا۔

اسی طرح دوسرے گواہ انسان کے اعضاء ہوں گے وہ بھی گواہی دیں گے۔اس لیے کہ جب آدمی کو پیش کیا جائے گا اور اس نے گناہ کیے ہوں گے تو دنیا کی طرح مجرم اوّلِ وہلہ میں ازخود اپنے گناہ کا اقرار نہیں کرے گا،اس کی کوشش یہی ہوگی کہ ان سے انکار کردے ،پھر جب دیکھے گا کہ انکار سے بات بننے والی نہیں ہے،اور میرے خلاف چاروں طرف سے گواہ قائم ہوچکے ہیں ،اگر انکار کروں گاتب بھی میری بات سنی جانے والی نہیں ہے؛توپھر مجبوراً اقرار کرے گا۔

تطبیقِ آیات:

بخاری شریف میں روایت ہے کہ ایک مرتبہ ایک آدمی نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے کچھ سوالات کیے کہ قرآنِ پاک کی کچھ آیتوں میں آپس میں تعارض ہے، ایک آیت سے

ایک بات معلوم ہوتی ہے اور دوسری آیت سے دوسری بات ثابت ہوتی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے پوچھا: وہ کیا ہے؟ اس نے کہا: قرآنِ پاک کی بعض آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگ آپس میں ایک دوسرے سے گفتگو کریں گے اور بات چیت ہوگی۔ اور بعض آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک خاموشی سی طاری ہوگی، کسی کو دم مارنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ اور بعض آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگ اپنے گناہوں سے انکار کریں گے کہ ہم نے کبھی کفر و شرک نہیں کیا تھا: "وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ" اس پر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: پہلے تو وہ لوگ خاموش رہیں گے، لیکن اس کے بعد دیکھیں گے کہ لوگوں کو طلب کیا جاتا ہے اور ان سے پوچھا جاتا ہے، اس موقع پر اہلِ ایمان کو بھی طلب کیا جائے گا اور لوگوں سے چھپا کر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو سوالات کیے جائیں گے کہ تم نے یہ عمل کیا تھا؟ یہ عمل کیا تھا؟ بندۂ مؤمن اس کا اقرار کرے گا۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ اس کے گناہوں کو معاف کردو۔ یہ دیکھ کر کفار آپس میں کہیں گے کہ یہاں تو معاملہ بہت آسان ہے، جو بات کہی جاتی ہے اس کو مان لیا جاتا ہے۔ چناں چہ وہ اسی بنیاد پر انکار کریں گے؛ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی زبان پر مہر لگادی جائے گی، پھر ان کے ہاتھ اور دوسرے اعضاء ان کے خلاف گواہی دیں گے۔ ان گواہی دینے والوں میں زمین کے حصے بھی ہوں گے جہاں وہ عمل کئے تھے۔

(بخاری شریف، کتاب التفسیر: سورہ حم سجدہ)

زمین وآسمان روتے ہیں:

بلکہ حدیثِ پاک میں آتاہے کہ آدمی کاجب انتقال ہوتاہے توزمین کے جن حصوں پروہ نیک اعمال کرتا تھا اور اس کے نیک اعمال آسمان کے جن دروازوں سے اوپر پہنچائے جاتے تھے،زمین کا وہ حصہ اور آسمان کا وہ دروازہ اس کی موت پر روتے ہیں۔اسی کوقرآن نے کہا کہ ”ان کافروں کی ہلاکت پرزمین اور آسمان نہیں روئے“ (سورۃ دخان)اس کی تفسیرمیں حضراتِ مفسرین نے لکھاہے کہ اہلِ ایمان جونیک اعمال کرنےوالے ہوتےہیں ان کی موت پرزمین روتی ہے،اورزمین کے وہ حصے جہاں وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کیاکرتا تھا؛ وہ بھی روتےہیں (شعب الایمان:۳۰۱۸)اس لئے کہ زمین کے جس حصہ پر اللہ تعالیٰ کی عبادت کی جاتی ہے ،وہ خوش ہوتی ہے کہ مجھے اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے استعمال کیاگیا۔توجب بندۂ مؤمن مرجاتا ہے تو زمین کا وہ حصہ اور جگہ ویران ہوجاتی ہے ؛لہٰذا وہ روتی ہے۔مسلمان کی موت پر چاہے انسان روئے یا نہ روئے،لیکن وہ جگہ ضرور روتی ہے ،اور آسمان کے جن دروازوں سے اعمال جاتے تھے وہ بھی روتے ہیں۔

زیادہ گواہ تیار کرلو:

مطلب یہ ہے کہ یہ ساری جگہیں گواہی دیتی ہیں ،اور اللہ تعالیٰ کے یہاں یہ ساری چیزیں نوٹ کی جاتی ہیں۔اسی لیے حدیثِ پاک میں آتاہے کہ اللہ کی تسبیح کو انگلیوں پر گناکرو،کیوں کہ وہ قیامت کے دن گواہی دیں گی(ترمذی:باب ماجاء في عقد التسبيح باليد. ابوداود: باب التسبيح بالحصى)جہاں وہ گناہوں کو بتائے گی،وہیں وہ یہ بھی بتائے گی کہ ان پرتم نے اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا تھا۔کہنے کا حاصل یہ ہے کہ زمین کے وہ حصے جہاں پر آدمی عبادت کرتاتھاوہ بھی اس کے حق میں گواہی دیں گے۔اس لیے شریعت کی نگاہ میں یہ بات مطلوب ہے کہ آدمی زیادہ سے زیادہ زمین کے حصے اپنی گواہی کے لیے تیار کرے۔اسی لیے آپ نے دیکھا ہوگا کہ آدمی فرض نماز پڑھنے کے بعد تھوڑی سی جگہ بدل کر نفل اور سنت پڑھتاہے،اس میں جہاں اوربہت ساری حکمتیں ہیں ،وہیں ایک حکمت یہ بھی ہے کہ اس طرح گویادو جگہیں قیامت کے دن آپ کے حق میں گواہی دیں گی۔

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نےباب قائم کیاہے کہ :عید کی نماز کے لیے جاتےہوئےایک راستہ استعمال کرواوروالپسی میں دوسرے راستہ سے لوٹو؛یہ مستحب ہے۔چوں کہ عیدکی نمازایک عبادت ہے،اس کی ادائیگی کے لیے جب آدمی جائے گا تو کوئی نہ کوئی راستہ تو اختیار کرے گا۔

عمل چھوٹا سا؛ فضیلت بڑی:

اسی طرح بیمار کی خبر گیری اور عیادت کے لیے جانے آنے میں بھی مختلف راستہ اختیار کرنا پسندیدہ ہے۔کسی بیمار کی بیمار پرسی بھی بہت بڑا نیکی کا کام ہے۔آج کل اس کی طرف سے بھی بہت غفلت برتی جاتی ہے، اگر کچھ تعلق ہو تو کرلیتے ہیں ، ورنہ نہیں کرتے،حالاں کہ ایک مؤمن کا دوسرے مؤمن پر حق ہے،اس لئے اہلِ محلہ اور اہلِ مسجد میں سے کسی کے متعلق جب دیکھیں کہ وہ نظر نہیں آرہا ہے، تو حق ہے کہ اس کی عیادت کے لیے جائیں؛اس پر بڑا ثواب ہے۔حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ کوئی آدمی کسی بیمار کی عیادت کے لیے صبح کے وقت گیا تو شام تک ستر ہزار (۷۰۰۰۰)فرشتے اس کے لیے دعا کرتے ہیں اور کوئی شام کو گیا تو صبح تک ستر ہزار(۷۰۰۰۰) فرشتے دعا کرتے ہیں۔حدیثِ پاک میں یہاں تک آتا ہے کہ کوئی آدمی جب کسی مریض کی عیادت کے لیے جاتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت میں دوڑتا ہوا جاتا ہے۔ایک چھوٹا سا عمل ہے؛ لیکن اس کی بڑی فضیلت آئی ہے۔

یہ اہتمام صرف عید میں نہیں :

اس لیے بیمار کی عیادت، حج،اللہ کے راستہ میں جہاداور جنازہ کی شرکت کے لیےاور اس جیسے جتنے بھی نیکی کے کام ہیں ،ان کے لیے اگر آپ جارہے ہیں توکوئی نہ کوئی راستہ تواختیار کرنا

ہی پڑے گا،اس لیے وہاں سنت یہی ہے کہ اگرایک راستہ سے جائے تو دوسرے راستہ سے لوٹے۔یہ حکم صرف عید کی نماز کی سنت نہیں ہے،آج کل لوگ ایسا ہی سمجھتے ہیں ،اس لیے عید کی نماز کے لیے اس کا اہتمام بھی کرتے ہیں ، حالاں کہ ایسا نہیں ہے،بلکہ عید کی نماز کے علاوہ تمام عبادات کے کاموں میں یہی حکم ہے۔جنازہ کی شرکت،بیمار کی عیادت وغیرہ؛ سارے نیکی کام کے لیے ایک راستہ سے جائیں اور دوسرے راستہ سے لوٹیں۔اس کی وجہ وہی ہے کہ آدمی جب چل کران راستوں سے گزرے گا تو قیامت میں زمین کے وہ حصے آپ کے حق میں گواہی دیں گے کہ:اے اللہ!یہ بندہ عید کی نماز پڑھنے کے لیے مجھ پر سے چل کر گیا تھا ،اور واپس لوٹتے وقت مجھ پر سے چل کرلوٹا تھا۔بیمار کی عیادت کے لیے مجھ پر چل کر گیا تھا اور وہاں سے واپسی میں مجھ پر سے چل کرلوٹا تھا۔یہ بھی آداب میں سے ہے۔اس لیے جب ان اعمال کو انجام دیں تو ساتھ ساتھ ان چیزوں کا بھی اہتمام کریں۔

آپ ﷺ کی ذات نمونہ ہے:

نیکی کے جتنے بھی اعمال بتائے گئے ہیں ان کوانجام دینے کے طریقے بھی نبیٔ کریم ﷺ نے بتائے ہیں ، اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی ذات کو نمونہ بنا کر بھیجا ہے،اس لیے ہر کام کواسی طریقہ کے مطابق انجام دینے کی کوشش کرنی چاہیے جو حضور ﷺ نے بتائے ہیں؛تب ہی وہ عمل مقبول ہو گا۔جیسے: اگر آپ کسی جگہ پر کسی چیز کے بنانے کا آرڈر (Order) دیں اور آپ

نے اس کا ایک نمونہ بھی دے رکھا ہے، پھر اگر بنانے والا اس نمونہ سے ذرا بھی اِدھر اُدھر کرے گا تو آپ اس چیز کو (Reject) اور رَد کردیں گے کہ یہ ہمارے آرڈر کے مطابق نہیں ہے۔ معلوم ہوا کہ نمونہ میں ذرا سا بھی فرق نہیں آنا چاہیے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ذاتِ با برکات کو اللہ تعالیٰ نے ہمارے ہر عمل کے واسطہ نمونہ بنایا ہے، قرآنِ پاک میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ آپ کی ذات انسانوں کے لیے نمونہ ہے، جب نمونہ ہے تو پھر ہر چھوٹے بڑے عمل میں اسی کو دیکھا جائے گا، تبھی وہ عمل اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبول ہوگا۔ اس لیے اس کا اہتمام کرنا چاہیے۔

نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا طرزِ عمل:

حدیث ۹۱۷:-

عن جابر رضی اللہ عنہ **قَالَ: كَانَ النبی** (صلی اللہ علیہ وسلم) **إِذَا كَانَ يومُ عيدٍ خَالَفَ الطَّرِيقَ.** (رواہ البخاری)

قَوْله: ((خَالَفَ الطَّرِيقَ)) يعنی: ذَهَبَ فی طريقٍ، وَرَجَعَ فی طريقٍ آخَرَ.

ترجمہ:- حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب عید کا دن ہوتا تھا تو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) عید کی نماز کے لیے ایک راستہ سے تشریف لے جاتے تھے اور دوسرے راستہ سے واپس تشریف لاتے تھے۔

افادات:- اس کا مقصد یہی ہوتا تھا کہ عبادت کی جگہ زیادہ سے زیادہ ہو

حدیث ۷۲۰:-

وعن ابن عُمَرَ رضی اللہ عنہما أَنَّ رسول اللہ (ﷺ) كَانَ يَخْرُجُ مِنْ طريق الشَّجَرَةِ ، وَ يَدْخُلُ مِنْ طَرِيقِ الْمُعَرَّسِ.وَإِذَا دَخَلَ مَكَّةَ ،دَخَلَ مِنَ الثَّنِيَّةِ الْعُلْيَا ،وَيَخْرُجُ مِنَ الثَّنِيَّةِ السُّفْلَى. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ آپ (ﷺ) جب حج کے لیے یا جہاد کے لیے یا کسی اور کام کے لیے مدینہ منورہ سے باہر تشریف لے جاتے،تو شجرہ والے راستہ سے مدینہ منورہ سے باہر تشریف لے جاتے تھے ،اور مُعَرَّس والے راستہ سے مدینہ منورہ میں واپس داخل ہوتے تھے(گویا داخل ہونے کے لیے الگ راستہ اور نکلنے کے لیے دوسرا راستہ اسی مقصد کے لیے اختیار کیا گیا،اور ان سفروں میں حج کے بھی اسفار ہوتے تھے، تو)جب آپ (ﷺ) حج یا عمرہ کے لیے مکہ مکرمہ تشریف لے جاتے تھے تومکہ کا جو بالائی حصہ یعنی جنۃ المُعلی والا راستہ ہے ،اُدھر سے آپ مکہ مکرمہ میں داخل ہوتے تھے اور وہ جو ذیلی راستہ ہے،اُدھر سے واپس لوٹتے تھے(گویا اس طریقہ سے آپ نے یہ تعلیم دی کہ آدمی ایک راستہ سے جائے اور دوسرے راستے سے آئے۔لہٰذا ہم اپنے تمام عبادت کے کاموں میں اس کا اہتمام کریں۔)

استحباب تقدیم

الیمین فی کل مَاھومن

باب التکریم

ہر اچھے کام میں دائیں طرف سے شروع کرنا مستحب ہے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

استحباب تقديم اليمين فى كل مَا هومن باب التكريم كالوضوءِ وَالغُسْلِ وَالتَّيَمُّمِ، وَلُبْسِ الثَّوْبِ وَالنَّعْلِ وَالخُفِّ وَالسَّرَاوِيلِ وَدُخولِ الْمَسْجِدِ وَالسِّوَاكِ، وَالاكْتِحَالِ وَتقليمِ الأظْفار، وقَصِّ الشَّارِبِ، وَنَتْفِ الإبْطِ وَحلقِ الرَّأسِ، وَالسّلامِ مِنَ الصَّلاَةِ، وَالأكْلِ والشُّربِ وَالمُصافحَةِ وَاسْتِلاَمِ الحَجَرِ الأَسْوَدِ والخروجِ منَ الخلاءِ والأخذ والعطاء وغيرِ ذَلِكَ مِمَّا هُوَ فى معناه.

ويُسْتَحَبُّ تَقديمُ اليسارِ فى ضدِ ذَلِكَ ، كالامْتِخَاطِ وَالبُصَاقِ عن اليسار، ودخولِ الخَلاءِ والخروج من المَسْجِدِ، وخَلْعِ الخُفِّ والنَّعْلِ والسراويلِ والثوبِ، والاسْتِنْجَاءِ وفِعلِ المُسْتَقْذرَاتِ وأشْبَاه ذَلِكَ

عنوان کی وضاحت:

ایک اور ادب بتلارہے ہیں کہ جو اچھے اور عزت کے کام سمجھے جاتے ہیں ان کو انجام دینے میں داہنی طرف سے شروعات ہونی چاہیے۔ایک آدمی وضو کرنا چاہتا ہے تو پہلے داہنا ہاتھ دھوئے، پھر بایاں ہاتھ دھوئے۔اسی طرح جہاں جہاں دایاں اور بایاں ممکن ہو؛وہاں ایسا کرے۔ اورجہاں دایاں بایاں ممکن نہ ہو،تو وہاں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔یہی حال غسل کا ہے کہ

جب غسل کے لیے بیٹھے تو بدن کے دائیں حصہ پر پہلے پانی ڈالے، پھر بائیں حصہ پر ڈالے۔ اسی طرح تیمم میں جب ہاتھوں پر ہاتھ پھیرے تو پہلے سیدھے ہاتھ پر، پھر اُلٹے ہاتھ پر پھیرے۔اسی طرح جب کپڑے پہنے توازار میں پہلے سیدھا پیر پھر اُلٹا پیر ڈالے،پہلے سیدھی آستین پھر اُلٹی آستین پہنے۔جوتے پہننے میں بھی پہلے سیدھا پیر پھر اُلٹا پیر۔موزہ میں بھی پہلے دائیں پھر بائیں میں پہنے۔مسجد میں داخل ہوتے وقت پہلے دعاودرود پڑھ لے اور پہلے سیدھا پیر، پھر اُلٹا پیر داخل کرے۔جب مسواک کرے تو پہلے داہنی جانب پھر بائیں جانب۔سرمہ لگانے میں پہلے داہنی جانب ،پھر بائیں جانب۔ناخن کاٹنے میں پہلے دایاں ہاتھ ،پھر بایاں ہاتھ ، پہلے دایاں پیر، پھر بایاں پیر۔اسی طرح جب مونچھیں کاٹے تو دائیں طرف سے شروع کرے اور بائیں جانب ختم کرے۔بغل کے بالوں کو اکھاڑنے میں بھی اس کا خیال رکھے۔بغل کے بالوں کو اکھاڑنا مسنون ہے،اگر کسی آدمی کے لئے بال کا اکھاڑنا ممکن نہیں ہے کہ اکھاڑنے میں تکلیف ہوتی ہے؛تو کوئی حرج نہیں ہے۔ویسے اگر عادت ڈال لی جائے تو پھر آسان ہو جاتا ہے،اور کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔اُکھاڑنے کا ایک فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ بغل میں بدبو نہیں رہتی۔

نماز کا سلام جب پھیرا جائے گا تو پہلے دائیں طرف، پھر بائیں طرف۔کھانے میں بھی اپنے سامنے جو چیز ہے اس میں سے دائیں طرف سے، دائیں ہاتھ سے کھائے۔پینے میں بھی دائیں ہاتھ سے پیے۔مصافحہ کرنے میں ہاتھ ملاتے ہیں ، تو اس میں بھی دایاں ہاتھ ملائے۔حجرِ اسود کو بوسہ دے تو دائیں طرف سے بوسہ دیں گے،بیت الخلاء سے باہر نکلنے میں پہلے دایاں پیر،

پھر بایاں پیر۔ کوئی چیز آپ لے رہے ہیں، یا دے رہے ہیں، تو لینے میں دایاں ہاتھ سے لیں، اور دینے میں بھی دایاں ہاتھ استعمال کریں۔ بہت سے لوگ ان چیزوں کی طرف دھیان نہیں دیتے، اس کی وجہ سے معاملہ اُلٹ جاتا ہے۔ اصل ضرورت اس کی ہے کہ کچھ دنوں تک دھیان اور توجہ سے ان کاموں کو کیا جائے تو ان شاء اللہ خود بخود عادت پڑ جائے گی، بچوں کو بھی اسی کی عادت ڈالی جائے، کچھ دنوں تک اگر اس کی عادت ڈالیں گے تو خود بخود وہ اسی طرح کرنا شروع کر دیں گے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ہر ایسا کام جس میں عزت کا پہلو نکلتا ہو، اس میں دائیں طرف سے شروعات کیا کریں۔ اور اگر معاملہ اُلٹا ہے کہ اس میں عزت کا پہلو نہیں ہے تو اس صورت میں پہلے بائیں طرف سے کیا جائے گا۔ چناں چہ آپ ناک صاف کرنا چاہتے ہیں، تھوکنا چاہتے ہیں، تو دائیں طرف نہیں تھوکیں گے، بلکہ بائیں طرف تھوکیں گے، اور بیت الخلاء میں داخل ہوں گے تو پہلے بایاں پیر اندر رکھیں گے، پھر دایاں پیر۔ مسجد میں داخل ہونا تو عزت کی چیز ہے، لیکن مسجد سے نکلنا اس کے برعکس ہے، اس لیے پہلے بایاں پیر نکالیں گے، پھر دایاں پیر۔ استنجاء بائیں ہاتھ سے کریں گے۔ اسی طرح جتنے بھی کام ہیں ان کے اندر اسی بات کا خیال رکھا جائے۔ تو جتنے بھی اچھے کام ہیں ان میں ادب یہ ہے کہ آدمی دائیں طرف سے شروع کرے، اور جو اس کے برعکس ہے اس میں بائیں طرف سے شروع کرنا چاہیے۔ یہ ایک عنوان قائم کیا ہے، اور اس کے تحت اسی کے متعلق آیتیں اور روایتیں پیش کرتے ہیں۔

اس سلسلہ میں ایک آیت پیش کی ہے:﴿ فَأَمَّا مَنْ أُوتِيَ كِتَابَهُ بِيَمِينِهِ فَيَقُولُ هَاؤُمُ اقْرَؤُوا كِتَابِيَهْ (الحاقة : ۱۹)﴾ جو اللہ کے نیک بندے ہوں گے ان کو قیامت کے روز اللہ تعالی کی طرف سے ان کا نامۂ اعمال داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا۔ گویا داہنےہاتھ میں نامۂ اعمال کا دیا جانا؛ یہ ان کی نجات کی علامت قرار دیا۔اور وہ اتنے خوش ہوں گے کہ مارے خوشی کے لوگوں کو بتاتے پھریں گے، جیسے: کسی آدمی کا رِزَلٹ آیا ،اور وہ اعلیٰ نمبر سے کامیاب ہوا؛تو وہ اس کوبند کرکے جیب میں نہیں رکھ دیتا،بلکہ دوستوں کو بتاتا پھرتاہے کہ دیکھو!یہ میرا رزَلٹ آیا ہے۔ویسے ہی اس آیت میں ہے کہ جس کو اس کانامۂ اعمال دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا وہ لوگوں سے کہے گا کہ:لو! میرا نامۂ اعمال پڑھو۔

حضورِ اکرم (ﷺ) کی پسند:

حدیث ۷۲۱:-

وعن عائشة رضی اللہ عنہا **قالت: كَانَ رسولُ الله (ﷺ) يُعْجِبُهُ التَّيَمُّنُ فی شَأْنِهِ كُلِّهِ : فی طُهُورِهِ، وَتَرَجُّلِهِ، وَتَنَعُّلِهِ** (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:-حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبیٔ کریم (ﷺ) کو ہر اچھے کام (جو عزت و اکرام اور نعمت کے سمجھے جاتے ہیں ،ان)میں دائیں طرف سے ابتداء کرنا پسند تھا۔چناں چہ آپ جب وضو فرماتے تھے تو دائیں طرف سے شروع کرتے تھے (دایاں ہاتھ ،پھر بایاں ہاتھ۔دایاں پیر،پھر بایاں پیر۔

اسی طرح غسل کرنے میں جیسا کہ بتلایا گیا) اور سر پر کنگھا کرنے میں پہلے دائیں طرف، پھر بائیں طرف(ڈاڑھی میں کنگھی کرتے تو پہلے دائیں طرف،پھر بائیں طرف کرتے۔یہی سنت اور مستحب طریقہ ہے)اور جوتے پہننے میں بھی پہلے دائیں پیر میں ،پھر بائیں پیر میں پہنتے تھے۔

افادات:- چند دنوں تک اس کا اہتمام کرنا پڑتا ہے ،یہاں تک کہ جب آدمی کی طبیعت اس کی عادی بن جاتی ہے تو اس کے بعد خود بخود عمل کرنا آسان ہوجاتا ہے، شروع میں ذرا توجہ رکھنی پڑتی ہے۔اوراگر توجہ اور اہتمام نہیں رکھتے تو شیطان اُلٹا ہی کروا تا ہے، اسی لیے لوگ جب مسجد سے نکل رہے ہوں تو کھڑے ہو کر دیکھیے،جو توجہ کر کے جوتے پہننے والے ہوں گے، وہی دایاں جوتا پہلے پہنیں گے،ورنہ شیطان اُلٹا ہی ڈالوائے گا۔اسی طرح مسجد میں آنے والے جب جوتے نکالتے ہیں ؛وہاں بھی شیطان اُلٹا ہی کرواتاہے۔اس لئے چند دنوں تک کچھ توجہ کرنی پڑے گی۔

حضورِ اکرم (ﷺ) کا عمل:

حدیث ۷۲۲:-

وعنھاقالت : كَانَتْ يَدُ رسول الله (ﷺ) اليُمْنَى لِطُهُورِهِ وَطَعَامِهِ، وَكَانَتِ الْيُسْرَى لِخَلائِهِ وَمَا كَانَ مِنْ أَذًى.

ترجمہ:-حضرت عائشہ رضی اللہ عنہاسے روایت ہے کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کادایاں ہاتھ غسل وغیرہ اور کھانے کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ اور استنجاء ،یاکوئی گندی چیز ہوتی (مثلاً:ناک صاف کرنی ہوتی ،تو)بایاں ہاتھ استعمال ہوتا تھا۔

یہی توکمالِ نبی ہے:

افادات:- یہ سب زندگی کے آداب ہیں جوآپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے سکھائے ہیں،آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا تعلق اپنی امت کے ساتھ ایسا تھا جیسے ایک شفیق اور مہربان باپ کا اپنی اولادکے ساتھ ہوا کرتاہے۔ باپ اپنےبچوں کوہرچیز سکھاتا ہے ، اگر وہ نہیں سکھائے گاتوبچوں کویہ سب آداب معلوم بھی نہیں ہوسکیں گے۔

اورآپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کایہی اندازاور طریقۂ تربیت غیروں کے لیے باعثِ اعتراض بنا۔ابن ماجہ شریف میں حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ایک یہودی نے ایک مرتبہ ان سے بطوراستہزاءومذاق کہا:"إِنِّي أَرَىٰ صَاحِبَكُمْ يُعَلِّمُكُمْ كُلَّ شَيْءٍحتّٰى الْخِرَاءَةَ"میں دیکھتاہوں کہ تمہارے ساتھی (یعنی نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم))تم کوہرچیزسکھاتے ہیں ، یہاں تک کہ پیشاب پاخانہ کا طریقہ بھی سکھاتے ہیں؟اس کے جواب میں حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے کہا:جی ہاں !نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے قضائے حاجت کے موقعہ پر کیاکرنا چاہیےوہ بھی ہمیں بتایاکہ ہم قبلہ کی طرف رخ کرکے نہ بیٹھیں، دائیں ہاتھ سے استنجاء نہ کریں ،تین سے کم پتھرپراکتفاء نہ کریں ، لید اور

ہڈی وغیرہ سے استنجاء نہ کریں (ابن ماجہ:۳۱۶) گویا آپ (ﷺ) نے ہر ہر چیز بتائی اوراس کی تعلیم بھی دی کہ بیٹھنے میں کیسی ہیئت اختیار کریں، کون سے ہاتھ سے استنجاء کریں، کون سے ہاتھ سے نہ کریں؛ یہی تو آپ (ﷺ) کا کمال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس مقصد کے لیے آپ کو بھیجا تھا اس میں چھوٹی سے چھوٹی بات بھی آپ (ﷺ) نے نہیں چھوڑی جس کی طرف متوجہ نہ کیا ہو۔ یہ سب وہی تعلیمات ہیں۔ اسی لئے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آپ (ﷺ) نے عملی طور پر بتلایا کہ کون سے کام دائیں ہاتھ سے کیے جاتے ہیں، اور رکون سے کام بائیں ہاتھ سے کیے جاتے ہیں۔ اگر ہمارا بچہ بائیں ہاتھ سے کھانا کھا رہا ہے، یا گلاس پکڑتا ہے، تو ہم اس کو ٹوکتے نہیں، حالاں کہ اس کو محبت سے ٹوکا اور بتایا جانا چاہیے کہ: بیٹا! ایسا نہیں کیا کرتے۔ اس سے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ آپ (ﷺ) نے ہر ہر چیز بتلائی ہے، لیکن آج کل ہم لوگوں کا مزاج ایسا بنتا جارہا ہے کہ ایسی کوئی چیز ہو تو کہتے ہیں کہ یہ تو ہماری شان کے خلاف ہے۔

آج کل کی بدتہذیبی کی بڑی وجہ:

آج کل عام طور پر بدتہذیبی اور بے ادبی عام ہوتی جارہی ہے، اس کی وجہ یہی ہے کہ ماں باپ اور بڑوں کی طرف سے تربیت اورادب سکھانے کے معاملہ میں کوتاہی برتی جاتی ہے، وہ یوں سمجھتے ہیں کہ اس کو یہ بات کیا کہی جائے؟ نہیں بھائی! ان کو ہر ہر چیز بتلانی چاہیے، اگر باپ اپنے بیٹے کو نہیں سکھائے گا تو آخر اس کو کب آئے گا؟ پھر اگر بیٹا اسی طرح رہے گا تو بعد میں لوگ

باپ ہی پر الزام دیں گے کہ باپ نے اس کو کھانے پینے کا طریقہ بھی نہیں سکھایا۔اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کی طرف توجہ کی جائے۔آگے روایت آئے گی وہاں معلوم ہوگا کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) چھوٹوں اور بڑوں ہر ایک پر برابر نگرانی رکھتے تھے،اگر کسی سے کوئی چیز ادب کے خلاف ہو جاتی،تو فوراً آپ اس پر تنبیہ فرماتے تھے،ٹوکتے تھے اور نصیحت فرماتے تھے۔

تربیت کا موثر ترین طریقہ:

آج ہمارا معاملہ یہ ہو گیا ہے کہ پہلے تو ٹوکتے نہیں ہیں ،نہ اس کو درست کرنے کی کوشش کرتے ہیں ،پھر اگر لوگوں کی طرف سے کچھ کہا جاتا ہے تو غصہ میں آکر اس کی پٹائی شروع کردیتے ہیں۔تربیت کا یہ طریقہ نہیں ہے۔چھوٹوں کو محبت سے بتلایا جاتا ہے، بلکہ چھوٹا ہو یا بڑا؛کوئی بات آپ جتنی محبت سے ان کو بتائیں گے، اس پر اتنی ہی زیادہ اثر انداز ہو گی۔

ایک صحابی کی روایت پہلے گزر چکی ہے کہ ایک مرتبہ نماز کے اندر کسی کو چھینک آئی،اس پر وہ نماز کی حالت میں ”یرحمک اللہ “کہنے لگے۔صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سبحان اللہ سبحان اللہ کہنے لگے۔یہ سوچ رہے ہیں کہ مجھ سے ایسا کیا کام ہو گیا کہ سب ایسا کہہ رہے ہیں۔مَیں نے بولنا شروع کیا کہ مَیں نے ایسا کیا کہا ،تم ایسا کیوں کرتے ہو؟ ان کو معلوم نہیں تھا کہ نماز میں بول نہیں سکتے۔پھر صحابہ نے اپنی رانوں پر ہاتھ مارنا شروع کیا۔خیر!یہ کہتے ہیں کہ مجھے غصہ تو بہت آیا لیکن مَیں رک گیا۔پھر نماز کے بعد حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مجھے بلایا۔وہ صحابی فرماتے

ہیں :"وَاللهِ مَا ضَرَبَنِيْ وَلَا قَهَرَنِيْ وَلَا شَتَمَنِيْ" آپ (ﷺ) نے مجھے نہ مارا، نہ ڈانٹا، نہ مجھ پر غصہ کیا؛ بلکہ بڑی محبت سے فرمایا کہ: یہ نماز ہے اور نماز میں اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے، اس میں دنیا کی باتیں اور دوسری چیزیں نہیں ہوتیں۔ اب غور کیجئے کہ وہ تو بڑا آدمی تھا، تو پھر چھوٹوں کو تو اور زیادہ محبت سے بتانے کی ضرورت ہے۔ لیکن ہم یا تو کہتے ہی نہیں، اور جب کہنے پر آتے ہیں تو ڈنڈا لے کر آگے بڑھتے ہیں، ہمارا حال ایسا ہے:-

اگر غفلت سے باز آیا؛ جفا کی
تلافی کی بھی ظالم نے؛ تو کیا کی

پہلے تو کہیں گے ہی نہیں، اور جب کہنے پر آئیں گے ؛تو پٹائی کریں گے۔ **گویا ہمیں پٹائی کے علاوہ تعلیم و تربیت کا اور کوئی طریقہ آتا ہی نہیں ہے، حالاں کہ یہ بالکل غلط طریقہ ہے۔** حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ نبی کریم (ﷺ) نے اپنی پوری زندگی میں کسی عورت کو، کسی غلام کو، بلکہ کسی جانور تک کو نہیں مارا۔

شان کے خلاف نہیں :

تو بات چلی تھی کہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے ایک یہودی نے اعتراض کے طور پر ایک بات کہی تھی کہ میں دیکھتا ہوں کہ تمہارے ساتھی تم کو ہر چیز سکھاتے ہیں، یہاں تک کہ پیشاب پاخانہ کا طریقہ بھی بتاتے ہیں۔ اندازہ لگایئے کہ آپ سید الانبیاء اور سید الاولین والآخرین

ہیں، اگلوں پچھلوں کے سردار ہیں، لیکن کبھی آپ نے یہ نہیں سوچا کہ کیا مَیں ان کو پیشاب پاخانے کا طریقہ بتاؤں؟ یہ میری شان کے مطابق ہے؟ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) تو ہر چیز سکھانے کے لیے آئے تھے، اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے وہ پورا پورا امت کو سکھادیا۔ آج کل ہمارا مزاج ایسا بنتا جارہا ہے کہ فلاں کام تو میری شان کے خلاف ہے، بلکہ اگر کوئی اس کی طرف دھیان دیتا ہو، تو دوسرے لوگ کہتے ہیں کہ: ارے مولانا! آپ اس میں کیوں دخل دیتے ہیں؟ آپ کی شان تو بڑی اونچی ہے۔ خود تو کرتے نہیں، اور کوئی بے چارہ کررہا ہے، تو اس کو روکنے کی کوششیں کرتے ہیں۔

آپ بیتی:

ہمارے یہاں مدرسہ میں کسی زمانہ میں طلباء کی نگرانی میرے ذمہ تھی، جب نماز کے اور دوسرے اوقات میں مَیں دارالاقامہ (Boarding) میں جاتا تھا تو بعض لوگ کہتے تھے کہ: آپ حدیث کی بڑی بڑی کتابیں پڑھاتے ہیں؛ اور آپ وہاں جاتے ہیں؟ مَیں کہا کرتا تھا کہ: ہم نہیں جائیں گے تو کون جائے گا؟ اور ان بچوں کو کون سکھائے گا؟ ان کی نگرانی کون کرے گا؟

آج کل بچے جو بگڑتے جارہے ہیں اس کی وجہ یہی ہے کہ ان کی روک ٹوک نہیں ہے، ان کی نگرانی اور نگہداشت نہیں ہے۔ ان کو تو ہر ہر چیز پر نگرانی کی ضرورت ہے۔ ایک مرتبہ آپ کسی بچے کو ٹوکیں گے، اور جب وہ دیکھے گا کہ میری غلط حرکت پر ٹوکا جارہاہے، تو پھر دوسری

مرتبہ وہ چونکے گا، اور ایسا نہیں کرے گا۔ لیکن اگر اس نے دیکھ لیا کہ کوئی ٹوکنے والا نہیں ہے، تو دھیرے دھیرے معاملہ آگے بڑھتا جائے گا۔

تربیت کا اصل طریقہ:

آپ احادیث کا مطالعہ کیجئے تو معلوم ہو گا کہ کسی بھی بڑے یا چھوٹے کی طرف سے کوئی ایسی بات پیش آتی تو نبی کریم (ﷺ) اس پر فوراً تنبیہ فرماتے۔ وہاں کوئی مار پٹائی نہیں ہوتی تھی، بلکہ بس ٹوک دیا کرتے تھے کہ: یہ جو ہوا وہ مناسب نہیں ہوا، یوں کرنا چاہیے تھا۔ لیکن آج کل ہمارا مزاج یہ بن گیا ہے کہ کسی کو کچھ کہو مت۔ اگر کہتے ہیں تو اُسے برا معلوم ہوتا ہے، اس لئے کہ کچھ کہنے کا ماحول ہی نہیں رہا۔ لیکن یاد رکھئے! پھر بھی اگر آپ کسی کو محبت سے کہیں گے تو وہ ضرور سنے گا، ڈانٹ ڈپٹ اور پٹائی کرنے کی ضرورت نہیں ہے، حضور (ﷺ) کا مزاج اور تربیت کا طریقہ یہی تھا۔

عورتوں کی تعلیم وتربیت اور ہماری کوتاہیاں :

حدیث ۷۲۳:-

وعن أم عطية رضی اللہ عنہا أَنَّ النَّبِيَّ (ﷺ) قَالَ لهن فِي غَسْلِ ابْنَتِهِ زَيْنَبَ رضی اللہ عنہا: إِبْدَأْنَ بِمَيَامِنِهَا، وَمَوَاضِعِ الْوُضُوءِ مِنْهَا.

ترجمہ:- حضرت اُمّ عطیہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبیِ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی صاحبزادی حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا جب انتقال ہوا (تو ان کو غسل تو عورتیں دے رہی تھیں، لیکن نبیِ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) پردہ کے پیچھے سے ان کو غسل دینے کا طریقہ بتلا رہے تھے کہ اس طرح غسل دو) آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) ارشاد فرما رہے تھے کہ: ان کے دائیں طرف سے غسل دینا شروع کرو، اور وضو بھی دائیں طرف سے کراؤ۔

افادات:- اس سے معلوم ہوا کہ پردہ کے اہتمام کے ساتھ عورتوں کو بھی تعلیم دی جاسکتی ہے، لیکن ہماری تو پوری زندگی گزر جاتی ہے، کبھی ہم نے معلوم ہی نہیں کیا کہ گھر کی عورتیں کس طرح کپڑے دھوتی ہیں؟ کس طرح بچوں کو استنجاء کرواتی ہیں؟ بعض عورتوں کو تو معلوم ہی نہیں ہوتا کہ کوئی کپڑا اگر ناپاک ہوجائے تو اس کو اس طرح دھویا جائے کہ دھونے والا اپنی طاقت کے مطابق اس کو اتنا نچوڑے کہ اس میں قطرہ بھی باقی نہ رہے، دوسری اور تیسری مرتبہ بھی اسی طرح نچوڑے، جس کی وجہ سے بہت سی جگہوں پر تو کپڑے پاک ہونے کی نوبت ہی نہیں آتی۔

چھوٹے بچے ان کے ساتھ ہوتے ہیں، ان کا پیشاب پاخانہ کپڑوں پر گر جاتا ہے تو اس کو کس طرح صاف و پاک کیا جائے؛ اس کا طریقہ ان کو معلوم نہیں ہوتا، ان ساری چیزوں کی اپنے گھروں میں نگرانی کی ضرورت ہے۔ ایک دو مرتبہ بتلائیں گے تو وہ آسانی سے عمل کرنے لگ جائیں گی۔ ہم تو اِدھر دھیان ہی نہیں دیتے۔ بچہ اگر کہیں فرش پر پیشاب پاخانہ کردے، تو اس فرش کو کس طرح پاک کرتی ہیں؟ یا کپڑوں پر پیشاب پاخانہ کردے تو کپڑوں کو کس طرح

پاک کرتی ہیں ؟چارپائی پر یالحاف پر پیشاب پاخانہ کردے،تواس لحاف کوکس طرح پاک کرتی ہیں ؟یہ سب کبھی ہم نے ان سے پوچھا؟ اس کی طرف توجہ ہی نہیں ہے۔حالاں کہ یہ ساری چیزیں دھیان دینے کی ہیں ،اگریہ سب ہوگاتب ہی شریعت کی دوسری تعلیمات پر عمل ہوگا۔ جب پاکی و ناپاکی کا ہی اہتمام نہیں ہوگا؛ توپھر نمازیں کیسے درست ہوں گی اور دوسری باتیں کیسے ٹھیک ہوں گی؟

یہاں دیکھئے کہ نبی ٔکریم (ﷺ) کی بیٹی حضرت زینب رضی اللہ عنہاکے انتقال پرجو عورتیں ان کوغسل دے رہی تھیں ،نبی ٔکریم (ﷺ) خودان کوپردہ کی آڑ میں سے بیٹھ کر غسل کا طریقہ بتلارہے ہیں کہ وضو اور غسل میں دائیں طرف سے ابتداء کرو۔

مردہ کوجب غسل دیتےہیں توپہلے اس کووضوکرایاجاتاہے،پھربائیں کروٹ پرلٹاکر دائیں کروٹ پرپانی ڈالتے ہیں ،پھردائیں کروٹ پرلٹاکربائیں کروٹ پر پانی ڈالتے ہیں۔مطلب یہ ہے کہ آپ (ﷺ) نے باقاعدہ طریقہ بتلایا اور اس میں بھی آپ نے دائیں طرف سے شروع کرنے کی تلقین فرمائی۔

ان چیزوں کی طرف بھی توجہ ہو:

حدیث ۷۲۴:-

وعن أبي هريرة رضی اللہ عنہ أَنَّ رسول الله (ﷺ) قَالَ: إِذَا انْتَعَلَ أَحَدُكُمْ فَلْيَبْدَأْ بِالْيُمْنَى، وَإِذَا نَزَعَ فَلْيَبْدَأْ بِالشِّمَالِ. لِتَكُنْ الْيُمْنَى أَوَّلَهُمَا تُنْعَلُ، وَآخِرَهُمَا تُنْزَعُ.

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: جب تم میں سے کوئی آدمی جوتا پہنے، تو دائیں پاؤں سے شروع کرے، اور جب نکالے تو بائیں پاؤں سے شروع کرے؛ تاکہ دائیں پاؤں میں پہلے جوتا جائے اور آخر میں نکالا جائے۔

افادات:- آستین کو چڑھانے اور اُتارنے میں بھی یہی طریقہ ہے۔ جوتا پہننے کے لئے بھی نبیٔ کریم (ﷺ) نے اہتمام سے ہدایت دی۔ کیا ہم نے بھی اپنے بچوں کو کبھی اس کی طرف متوجہ کیا؟ کیا ہم نے زندگی میں کبھی بھی اپنے بچوں کو بٹھا کر ان کو جوتا پہننے کا طریقہ بتایا؟ ہمیں نبیٔ کریم (ﷺ) کی ان تعلیمات کو سیکھنے کی ضرورت ہے کہ جب آپ (ﷺ) نے اتنے اہتمام سے آدابِ زندگی ہمیں بتائے ہیں، تو ہم ان کی طرف سے اتنی غفلت کیوں برتیں؟ ہم ان کو سیکھنے اور سکھانے کا اہتمام نہیں کرتے، حالاں کہ یہ تو ہماری ذمہ داری ہے۔ اس لئے اِدھر توجہ ہونی چاہیے۔

۲۵۷ حدیث:-

وعن حفصة رضی اللہ عنہا أَنَّ رسول الله (ﷺ) كَانَ يجعل يَمِينَهُ لِطَعَامِهِ وَشَرَابِهِ وَثِيَابِهِ، وَيَجْعَلُ يَسَارَهُ لِمَا سِوَى ذَلِكَ

ترجمہ:- اُمّ المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبیٔ کریم (ﷺ) اپنے دائیں ہاتھ کو کھانے، پینے اور کپڑوں کے لیے استعمال فرماتے تھے (مطلب یہ ہے کہ اچھے کاموں کے لئے استعمال کرتے

تھے اوران کی شروعات دائیں ہاتھ سے کرتے تھے)اور بائیں ہاتھ کو اس کے برعکس کا م یعنی گندی چیزوں میں (مثلاً: قضائے حاجت وغیرہ کے لئے) استعمال فرماتے تھے۔

حدیث ۷۲۶:-

وعن أبي هُريرة رضی اللہ عنہ أنّ رسول الله (ﷺ) قَالَ: إِذَا لَبِسْتُمْ، وَإِذَا تَوَضَّأْتُمْ، فَابْدَأُوا بِأَيَامِنِكُمْ.

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: جب تم لباس (کرتہ، پائجامہ وغیرہ) پہنو، یا وضو کرو؛ تو اپنی دائیں جانب سے شروع کرو۔

افادات:- اب ہم لوگ وضو میں تو اس کا اہتمام کرتے ہیں لیکن کپڑے پہننے میں بہت سے لوگ اس کی طرف توجہ نہیں کرتے، حالاں کہ نبی کریم (ﷺ) اُمت کو بڑے اہتمام سے اس کی تاکید فرما رہے ہیں۔

حدیث ۷۲۷:-

وعن أنس رضی اللہ عنہ أنّ رسولَ الله (ﷺ) أتى مِنىً، فَأَتَى الْجَمْرَةَ فَرَمَاهَا ثُمَّ أَتَى مَنْزِلَهُ بِمِنىً ونحر، ثُمَّ قَالَ لِلحَلاَّقِ: ((خُذْ)) وأشَارَ إِلَى جَانِبِهِ الأَيْمَنِ، ثُمَّ الأَيْسَرِ، ثُمَّ جَعَلَ يُعْطِيهِ النَّاسَ (متفقٌ عَلَيْهِ)

وفي رواية: لما رَمَى الْجَمْرَةَ، وَنَحَرَ نُسُكَهُ وَحَلَقَ، نَاوَلَ الحَلاَّقَ شِقَّهُ الأَيْمَنَ فَحَلَقَهُ ثُمَّ دَعَا أَبَا طَلْحَةَ الأَنْصَارِيَّ رضی اللہ عنہ فَأَعْطَاهُ إِيَّاهُ، ثُمَّ نَاوَلَهُ الشِّقَّ الأَيْسَرَ. فَقَالَ: ((احْلِقْ)) فَحَلَقَهُ فَأَعْطَاهُ أَبَا طَلْحَةَ، فَقَالَ: ((اقْسِمْهُ بَيْنَ النَّاسِ))

ترجمہ:۔حضرت أنس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ (ﷺ) حج کے موقع پر منیٰ میں تشریف لائے تو جمرہ کے پاس تشریف لے گئے ، اس کی رمی فرمائی، پھر منیٰ میں جہاں آپ کی قیامگاہ تھی وہاں تشریف لے گئے اور جانور ذبح کیا(قربانی کی) پھر بال کاٹنے والے سے فرمایا: میرے بال کاٹو، اس وقت آپ نے اپنے سر کے دائیں حصہ کی طرف اشارہ کیا، پھر بائیں طرف اشارہ کیا؛ پھر آپ (ﷺ) وہ بال لوگوں کو عطا فرمانے لگے۔

دوسری روایت میں ہے کہ حضرت أبو طلحہ أنصاری رضی اللہ عنہ کو بلاکر بال ان کے حوالے کئے اور فرمایا: یہ لوگوں میں تقسیم کردو۔ چناں چہ انہوں نے نبیٔ کریم (ﷺ) کے بال مبارک لوگوں کے اندر تقسیم کئے۔

افادات:۔اس سے ہمیں ایک بات یہ سیکھنے ملی کہ جب ہم کسی نائی کے پاس بال بنوانے جائیں ،تو پہلے دائیں طرف ،پھر بائیں طرف سے بال کٹوانے کا اہتمام کرنا چاہیے۔

کتاب آداب الطعام

کھانے کے آداب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

باب التسمیة فی أوله والحمد فی آخره

کھانے سے پہلے بسم اللہ اور کھانے کے بعد الحمدللہ پڑھنا

آدابِ زندگی:

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ یہاں سے کھانے کے آداب بتلارہے ہیں۔

جیسا کہ بتایاتھا کہ زندگی گزارنے کاجو عمدہ سے عمدہ طریقہ ہوسکتا ہے وہ پورا نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ہمیں سکھایاہے۔کھانا کھاناہوتوکس طرح کھایا جائے،کوئی چیز پینی ہو توکس طرح پی جائے، لیٹناہوتوکیسے لیٹیں ، قضائے حاجت کیسے کریں،"معاشرت" یعنی لوگوں کے ساتھ مل جل کرجوزندگی گزارتے ہیں توکس کے ساتھ کس طرح پیش آنا چاہیے، باپ کے ساتھ، ماں کے ساتھ، بھائی کے ساتھ ،بہن کے ساتھ ،بیوی کے ساتھ، پڑوسی کے ساتھ کس طرح کا معاملہ کرناچاہیے، اس کی ساری تفصیلات بتائی ہیں ؛ یہی "معاشرت" کہلاتی ہے،اوریہ سب" آدابِ معاشرت "کہلاتے ہیں۔

حضرت حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں : آج کل لوگوں نے دین کو صرف عبادت کے اندرمحدود کر رکھا ہے کہ نماز روزہ وغیرہ جو عبادتیں ہیں ان کا اہتمام کیا جاتا

ہے،اور”معاشرت“یعنی زندگی گزارنے کا جوطریقہ ہےاس کے متعلق تویوں سمجھتے ہیں کہ شریعت نے کوئی ہدایت دی ہی نہیں ہے،اس معاملہ میں ہم آزادہیں جس طرح چاہیں کریں ؛حالاں کہ ایسی بات نہیں ہے۔شریعت میں تو ہرہرچیز کے متعلق مکمل تفصیلات بتلائی گئی ہیں۔

کھانے سے پہلے بسم اللہ پڑھنے کافائدہ:

حدیث ۷۲۸:-

وعن عُمَرَ بنِ أبي سَلمة رضی اللہ عنہما **قَالَ: قَالَ لی رسول الله** (ﷺ) **:((سَمِّ اللهَ، وَكُلْ بِيَمِينكَ، وكُلْ مِمَّا يَلِيكَ))** متفقٌ عَلَيْهِ

ترجمہ مع تشریح:- حضرت عمربن أبو سلمہ رضی اللہ عنہما (جو أم المؤمنین حضرت أم سلمہ رضی اللہ عنہا کے صاحبزادہ ہیں ،ان کے پہلے شوہرحضرت ابو سلمہ رضی اللہ عنہ سے پیدا ہوئے تھے،حضرت أبوسلمہ رضی اللہ عنہ کے انتقال کے بعد حضرت أم سلمہ رضی اللہ عنہا کا نکاح نبیٔ کریم (ﷺ) کے ساتھ ہواتویہ اپنے چھوٹے بچوں کو ساتھ لے کرحضور (ﷺ) کے یہاں آئی تھیں ،اس لیے حضرت عمر بن أبوسلمہ رضی اللہ عنہما نبیٔ کریم (ﷺ) کی تربیت ونگرانی میں تھے ایک مرتبہ وہ کھانے کے لیے بیٹھے تھے،خود)فرماتے ہیں (کہ میرا ہاتھ اِدھر اُدھر گھومنے لگا،جیسے:بچوں کی عادت ہوتی ہے کہ اِدھر ہاتھ مارا، اُدھر ہاتھ مارا۔تو) حضورِ اکرم (ﷺ) نے مجھے(تین چیزیں)بتلائیں ا: کھانے سےپہلے بسم اللہ پڑھو۲:اپنے دائیں ہاتھ سے کھاؤ ۳:اپنے سامنے سے کھاؤ (اِدھر اُدھر سے مت کھاؤ۔)

افادات:-باب کا عنوان بھی یہی قائم کیا ہے کہ کھانے کے معاملہ میں پہلا ادب یہ ہے کہ کھانے کے شروع میں بسم اللہ پڑھے اور اللہ کا نام لے۔ آدمی کو یہ سوچنا چاہیے کہ روزی اور اس کے علاوہ جو کچھ بھی مَیں استعمال کررہا ہوں ، کھارہا ہوں ، پی رہا ہوں ،پہن رہاہوں ؛ یہ سب چیزیں کس کی دی ہوئی ہیں؟ جتنی بھی چیزیں ہیں ان سب میں پہلے یہ دیکھناہے کہ یہ ساری نعمتیں کہاں سے آئی ہیں ؟ اللہ تعالیٰ ہی نے عطا فرمائی ہیں اوراسی کی دی ہوئی ہیں، توجس نے مجھے دی ہے اسی کے نام سے میں اس کو استعمال کرنا شروع کروں۔ کھانا جس نے دیاہے تو کھانا شروع کرنے سے پہلے مجھے اسی کا نام لیناچاہیے، تبھی تو اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ تعلق پیدا ہوگا اوراس کا استحضار رہے گا، پھر اس کے احکامات پر عمل کی توفیق ہوگی،اور پھر اس کی ذات کے ساتھ رشتہ قوی ہوگا۔

مثلاً:ایک آدمی کو کھاناکھلایاجائےاور بتلایاجائے کہ فلاں صاحب کی طرف سے دعوت ہے،تو اس کے دل میں داعی کے متعلق شکر کا جذبہ پیدا ہوتاہے،پھر شکر کا یہی جذبہ داعی کے ساتھ محبت پیدا کرنے کا ذریعہ بنتاہے، پھر اگر باربار یہی سلسلہ ہوتا رہے تو یہی چیز آگے جاکر اس کی اطاعت وفرمانبرداری کی طرف آمادہ کرے گا۔اس لئے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو استعمال کرتے وقت آدمی اگر یہ سوچے کہ میں جو کھانا کھانے جارہا ہوں ،یہ اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا ہے؛ تو اس سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ رشتہ مضبوط ہوگا۔

کیا ہم نے کبھی سوچا؟:

اور کیا ہم نے کبھی سوچا کہ اللہ تعالیٰ نے کھانے کے لیے کیسا عجیب و غریب نظام چلایا ہے؟ ہم روٹی توڑ کر کھاتے ہیں لیکن کیا کبھی سوچا کہ یہ روٹی کس طرح بنی؟ حضرت شیخ نوراللہ مرقدہٗ نے فضائلِ صدقات میں لکھا ہے کہ ایک بزرگ کے یہاں ایک شخص مہمان ہوئے، روٹیاں رکھی گئیں، تو جیسے بعضوں کی عادت ہوتی ہے کہ اُلٹ پُلَٹ کر دیکھتے ہیں کہ کون سی پکی ہے، اور کون سی جلی ہوئی ہے، تاکہ ان میں جو اچھی ہو اسی کو نکال کر کھائیں۔ انہوں نے بھی اُلٹ پُلَٹ کرنا شروع کی تو ان بزرگ نے کہا: کیا دیکھتے ہو؟ ایک روٹی جو تیار ہو کر ہمارے سامنے آتی ہے، اس پر تین سو ساٹھ (۳۶۰) محنتیں لگ چکی ہیں۔

ظاہر ہے کہ آدمی ذرا سوچے تو سہی کہ دانہ زمین کے اندر بویا جاتا ہے، تو زمین میں بونے سے پہلے زمین کو ہَل کے ذریعہ نرم کیا جاتا ہے، پھر اس کے اندر کھاد ڈالی جاتی ہے، پانی ڈالا جاتا ہے۔ پھر جو پانی بارش کے ذریعہ سے آتا ہے، اس کے متعلق سوچے کہ بارش کیسے تیار ہوئی؟ سورج کی گرمی سمندروں کے اوپر پڑی، وہاں سے بھاپ اٹھی، بادل بنے، اور معلوم نہیں کیسے کیسے فرشتے ان بادلوں کو کہاں کہاں سے چلا کر کہاں لے گئے، اور کہاں انہوں نے پانی برسایا، پھر یہ پانی زمین کے اندر گیا، پھر زمین میں بیج ڈالا گیا، اس کی پوری نگرانی کی گئی، پھر زمین سے کونپل نکلی۔ اور اللہ تعالیٰ کی قدرت دیکھو کہ اس کی کونپل کتنی نازک ہوتی ہے کہ ایک

چھوٹا سا بچہ بھی انگلی مار کر اس کو مسل کر رکھ دے، لیکن اللہ تعالیٰ نے سخت زمین کو پھاڑ کر اسے باہر نکالا، پھر وہ بڑھا اور اس کے اندر سے دانہ نکلا، اور اس دانہ کے اوپر سورج کی گرمی لگی، اس نے اس کو پکایا، اور نہ معلوم کیا کیا محنتیں ہوئیں، نگرانی اور چوکیداری کرنے والوں نے چوکیداری اور نگرانی کی، پھر اس کی کٹائی ہوئی، کھلیان لے جایا گیا، وہاں جانوروں کے ذریعہ سے دانے اور بھوسے کو الگ کیا گیا، پھر وہ بازار میں پہنچا، پہلے بڑے بیوپاری کے پاس گیا، پھر چھوٹے بیوپاری کے پاس گیا، اور پتہ نہیں کہاں کہاں ہوتا ہوا یہاں آیا، پھر چکّی میں پیسا گیا، اس کے بعد آٹا تیار ہوا اور اب اس کو پکایا گیا۔ آدمی سوچے تو سہی کہ ایک روٹی کے تیار ہونے میں کتنی محنتیں ہوئیں؟ شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:-

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کاراند
تا تو نانے بکف آری و بغفلت نہ خوری

بادل، ہوا، اور چاند و سورج؛ یہ سب اللہ تعالیٰ نے تمہاری خدمت کے لیے ایک نوکر کی طرح بے گار کے طور پر لگا رکھے ہیں۔ نوکر تو وہ ہوتا ہے جسے ہمیں تنخواہ بھی دینی پڑتی ہے، لیکن اگر کوئی حاکم کسی کو زبردستی پکڑ کر اپنے ساتھ لے جائے اور کہے کہ یہ کام کرو، اور اس کے اوپر کوئی مزدوری بھی نہ دی جائے؛ اسے بے گاری کہتے ہیں۔ تو اس کائنات کی جتنی بھی چیزیں ہیں، اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے بے گار رکھ دی ہیں، یعنی ہماری خدمت کے لیے مقرر کی ہیں، اس پر ہمیں کوئی تنخواہ و معاوضہ نہیں دینا پڑتا۔ یہ سورج کی روشنی اور گرمی استعمال کر رہے

ہیں، اگر بِل دینا پڑتا تو ہمارا کیا حال ہوتا؟ بجلی کا بِل ادا کرنے سے ہم عاجز ہو جاتے ہیں، تو سورج کی روشنی کا بِل کہاں ادا کرپاتے؟ اسی طرح ہَوا استعمال کررہے ہیں اگر اس کا میٹر لگادیا جاتا؛ تو ہمارا کیا حال ہوتا؟ تو یہ ساری نعمتیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے مفت میں مل رہی ہیں، اس لیے آدمی کھانا کھانے کے لیے جب بیٹھے تو اس کو سوچنا چاہیے کہ میں اللہ تعالیٰ کی نعمت کو استعمال کرنے جارہا ہوں، اسی لئے حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) فرمارہے ہیں کہ: جس ذات نے ہمیں یہ کھانا دیا ہے پہلے اسی کا نام لے کر کھانا شروع کرو، اور بسم اللہ پڑھو، تا کہ اس کے ساتھ تعلق قائم ہو، اس کی محبت دل کے اندر پیدا ہو۔ ہمارے سامنے تو جب کھانا آتا ہے تو ہم بھوک کی وجہ سے ایسے بے تاب ہوتے ہیں کہ اس پر ٹوٹ پڑتے ہیں، بسم اللہ بھی یاد نہیں رہتی، کبھی یہ سوچتے ہی نہیں کہ یہ کھانا کہاں سے آیا؟ حالاں کہ صرف ایک لمحہ کے لئے استحضار کرلینے کی ضرورت ہے۔ آدمی ذرا سوچ کہ اس وقت مجھ سے اللہ کا نام کیوں بلوایا جارہا ہے!

ایک ہی نعمت میں کئی نعمتیں:

ہمارے اکابر فرماتے ہیں: صرف کھانا ہی نعمت نہیں ہے، بلکہ جس وقت آدمی کھانا کھا رہا ہے، اسی وقت اللہ تعالیٰ کی کئی اور نعمتوں کو بھی وہ استعمال کررہا ہے۔ جیسے: اگر کھانا بغیر لذت کا ملتا، تب بھی ہمیں کھانا ہی پڑتا، لیکن اللہ تعالیٰ نے اتنا ہی نہیں کیا کہ صرف کھانا دے دیا، بلکہ لذت والا کھانا دیا۔ تو خود کھانا ایک نعمت ہے، پھر جو لذت اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر رکھی وہ دوسری

نعمت ہے۔ پھر عزت کے ساتھ اللہ تعالیٰ ہمیں دے رہے ہیں ، ورنہ ایسا ہوتا کہ بے عزتی کے ساتھ ڈال دیا جاتا جیسے: بعضوں کے سامنے ذلت کے ساتھ ڈال دیا جاتا ہے، ہمارے ساتھ ایسا تو نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں بے عزتی کے ساتھ کھلایا۔ پھر بھوک دی، یہ مستقل ایک نعمت ہے، ورنہ کھانا بھی ہو، لذت بھی ہو، اور عزت کے ساتھ دسترخوان پر بٹھاکر ہمیں کھلائیں، لیکن ہمارے اندر کھانے کا تقاضہ ہی نہ ہوتا، بھوک ہی نہ لگتی؛ تو کھانے کا کیا لطف آتا! معلوم ہوا کہ بھوک بھی اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت ہے۔ پھر جس وقت ہم کھانا کھارہے ہوتے ہیں تو عافیت کے ساتھ کھارہے ہوتے ہیں ۔ورنہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک آدمی کو کھانا بھی ملا، لذت والا بھی ملا، عزت کے ساتھ ملا، بھوک بھی لگی ہوئی ہے، لیکن کوئی مصیبت آگئی ،ایک دم سے کوئی عزیز بیمار ہوگیا، کسی پر ہارٹ کا حملہ ہوگیا؛ تو اب کھانا کھارہے ہیں، لیکن بالکل بے دلی کے ساتھ کھارہے ہیں، اس میں عافیت نہیں ہے، جب آدمی عافیت کے ساتھ کھانا کھاتا ہے تو پُرسکون انداز سے کھاتا ہے۔ اچھا! پھر دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانے کا مزہ بھی الگ ہی ہوتا ہے، اس لئے کہ اکیلے بیٹھ کر کھانے کی صورت میں اتنا نہ کھاپاتا، جتنا دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر کھاسکتا ہے۔ تو غور کرو کہ اس ایک نعمت کے اندر بے شمار نعمتیں شامل ہوجاتی ہیں۔ اس لئے ضرورت ہے کہ آدمی ان سب چیزوں کو سوچے، جب آدمی یہ ساری چیزیں سوچے گا تو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرے گا، اور پھر اس سے اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ تعلق پیدا ہوگا، اسی تعلق کو پیدا کرنے کے لیے ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ کھانا شروع کرنے سے پہلے اللہ کا نام لو۔

مضطر کو روزی پہنچانے کا سرکاری انتظام:

اورواقعہ یہ ہے روزی کے معاملہ میں اگر آدمی غور کرے تو اس کو ماننا پڑے گا کہ اللہ تعالیٰ روزی کے لیے کیسا عجیب وغریب انتظام فرماتے ہیں۔حضرت مولانا علی میاں صاحب نوراللہ مرقدہٗ کا سنایا ہوا ایک واقعہ آپ کو سناتا ہوں ، ان کو یہ واقعہ افغانستان کے مجددی خاندان کے ایک بزرگ نے بتایا تھا، وہ اپنے خاندان کے بڑے صاحبِ رسوخ عالم بھی تھے ،جس زمانہ میں ظاہر شاہ افغانستان کا حکمران تھااس زمانہ میں ایک موقعہ پر ان کو بادشاہ کی طرف سے یہ پیغام ملا کہ ہم آپ کوایک خاص سفارت کے لیےایک خاص پیغام لے کر موسکو (Moscow) بھیجناچاہتے ہیں،آپ تیاری کرلیں۔چناں چہ انہوں نے تیاری کرلی ،ہوائی جہاز کا سفر تھا، گھر والوں نے ان کوایک بڑاساٹفن تیار کرکے دیا کہ ہوائی جہاز میں کھاناتوملے گا،لیکن کیا معلوم وہ کیسا ہوتا ہے،اس لئے یہ کھاناساتھ لے جایئے،بہت بڑے ٹفن میں بہت کچھ بناکر دیاتھا۔اچھا! ان کو یہاں سے یہ ہدایت دی گئی تھی کہ پہلے آپ کوکابُل سے دو شنبہ (جو وہیں ایک مقام کا نام ہے)جاناہے،پھر وہاں سے آگے جانے کی ہدایت وہیں سے دی جائے گی،پیغام آنے تک آپ کو ایئرپورٹ کے لاؤنج ہی میں انتظار کرنا ہے۔

یہ کہتے ہیں کہ میں دوشنبہ پہنچااور لاؤنج میں بیٹھاہوااس انتظار میں تھا کہ آگے کیاہدایت ملتی ہے۔بیٹھے بیٹھے شیشہ میں سے مَیں نے ایک منظر دیکھا کہ باہر ایک کوڑادان تھا،اس کے

پاس ایک عورت آئی اور کوئی چیز اُٹھا کر کپڑے میں لپیٹی اور جلدی جلدی جانے لگی۔ مَیں اُٹھا اور باہر نکل کر اس سے پوچھا: یہ کیا ہے؟ وہ کہنے لگی: یہ میرا معاملہ ہے۔ انہوں نے کہا: مجھے بتاؤ۔ جب دیکھا تو ایک مری ہوئی مرغی تھی جو اس عورت نے اٹھائی تھی، حالاں کہ وہ عورت شریف معلوم ہورہی تھی، اس سے کہا: یہ کیوں لے جارہی ہو؟ اس نے کہا: میری حالت ایسی ہے کہ میرے لیے اس وقت اس کا کھانا جائز ہے۔ فوراً ان کو خیال آیا، اس سے کہا کہ: اس کو پھینک دو اور ٹھہرو۔ پھر انہوں نے وہ ٹفن جو گھر سے ساتھ لائے تھے، جس میں وافر مقدار میں کھانا تھا وہ پورا اُٹھا کر اس عورت کے ہاتھ میں دے دیا کہ اس کو لے جاؤ، اور واپس آکر اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد ان کے نام کا اعلان ہوا، ان کو بلایا گیا اور بتایا گیا کہ آپ کو جس مقصد کے لیے وہاں بھیجا جارہا تھا، اب اس کی ضرورت نہیں رہی، اس لئے آپ واپس آجائیں، وہ واپس گھر آگئے اور سوچنے لگے کہ، آخر مجھے وہاں کیوں بھیجا گیا تھا؟ بہت سوچنے کے بعد نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ اس عورت کو ٹفن پہنچانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے سرکاری طور پر یہ انتظام کیا تھا۔

دوسروں کے نام سے کھلاتے ہیں:

اس لیے مَیں دوستوں سے کہا کرتا ہوں کہ بہت سی مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ ہمارے یہاں کسی بڑے آدمی نے کہلوایا کہ فلاں وقت آپ کے یہاں آرہے ہیں، اور کھانا کھائیں گے، اس لیے ان بڑے آدمی کے شایانِ شان کھانا تیار کروایا جاتا ہے، لیکن وقت آنے پر اطلاع ملتی ہے

کہ وہ نہیں آئیں گے،اور پھر دوسرے کچھ مہمان آجاتے ہیں ،لہٰذا ان کے سامنے وہ کھانا رکھا جاتا ہے۔اب یہ مہمان اگر پہلے سے اطلاع بھی کرتے تو ان کے لیے اتنا اہتمام نہیں کیا جاتا، لیکن اللہ تعالیٰ کو ان کو یہی سارے پکوان کھلانا منظور تھے تو دوسرے کے نام سے ان کے لئے انتظام کروایا گیا۔

چیونٹی کی روزی کا منظر:

ہم نے اپنے بچپن میں ایک مضمون پڑھا تھا۔ مضمون نگار نے تصورات کے اندر ایک عمدہ منظر قائم کیا تھا کہ افغانستان کے فلاں علاقہ میں بادام کا ایک باغ ہے ، وہاں بادام لگے، جب سیزن آیا تو بادام اتارے گئے،ان کو بوریوں میں بھرا گیا، وہاں سے پاکستان لائے گئے، وہاں کے بازار میں بکے، ایک بیوپاری اسے ہندوستان لایا، دہلی کے کسی بازار میں فروخت ہو کر سورت آئے،اور سورت کے بیوپاری سے آپ نے خریدے، اپنے گھر لائے،پھر کسی مولوی صاحب کی دعوت کی تو اس میں زردہ پکایا جس میں وہی بادام ڈالا گیا، ان صاحب نے کھایا، اور کھاتے وقت دانتوں کے اندر اس بادام کے کچھ ذرّات رہ گئے، وہ واپس لوٹ رہے تھے، پلیٹ فارم پر بیٹھ کر خلال کررہے تھے کہ اس خلال کے دوران ایک ذرّہ دانت میں سے نکلا، انہوں نے اسے پھینکا،وہاں ایک چیونٹی تھی اس نے اس کو اُٹھالیا۔

یہ سارا ایک تصوراتی منظر قائم کیا گیا ہے جس سے وہ یہی بتانا چاہتا ہے کہ چیونٹی کی روزی تو اتنی سی ہی ہے، اس کو تھوڑا کلو دو کلو چاہیے،اس کو تو ایک دو ذرّے ہی چاہئیں ،اس کی روزی پہنچانے کا اللہ تعالیٰ نے کیسا عجیب انتظام کیا کہ اتنی دور ایک چیز پیدا ہوئی جو اس کی روزی تجویز تھی تو اس تک پہنچائی۔ کیا کوئی سوچ بھی سکتا ہے کہ اس چیونٹی کے منھ کے اندر جو ذرّہ پہنچا ہے،وہ کہاں سے کس طرح آیا؟ حقیقت کی دنیا میں اس سے بھی زیادہ عجیب واقعات رونما ہوتے ہیں ؛لیکن ہم غور نہیں کرتے۔

روزی کا انتظام :ہمارے بس کی بات نہیں :

ہم بھی بہت سی مرتبہ کیلا کھا کر اس کا چھلکا پھینک دیتے ہیں اور کوئی بکری آکر اس کو اُٹھا کر کھا لیتی ہے۔اب سوچنے کی ضرورت ہے کہ وہ کیلا کہاں تیار ہوا تھا،کہاں کہاں سے ہو کر ہمارے ہاتھ میں آیا،ہم نے کھایا اور چھلکا پھینکا،اور اس بکری نے کھایا اب بکری کی روزی تو یہی چھلکا ہے،اس کو کیلا نہیں کھانا ہے،اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کے لیے چھلکا ہی مقدر ہے ،لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے یہ چھلکا کہاں سے بھجوایا؛ یہ سوچنے کی بات ہے۔اس لیے صرف انسان ہی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ہر مخلوق کے واسطے- چاہے وہ چھوٹی ہو یا بڑی، چیونٹی ہو یا بکری-روزی کا انتظام کیا ہے،ہر ایک کو اللہ تعالیٰ روزی پہنچا رہا ہے اور روزی پہنچانے کا اس نے جو ذمہ لے رکھا ہے اس کو وہ پورا کر رہا ہے۔انسان اگر یہ چیز سوچے تو واقعہ یہ ہے اس میں اس

کے لئے بڑی عبرت کا سامان موجود ہے، کسی انسان کے بس کی بات نہیں ہے کہ وہ یہ کام کر سکے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کی دعوت:

حضرت سلیمان علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے ایسی حکومت دی تھی کہ اس سے پہلے نہ کسی کو ملی اور نہ بعد میں کسی کو ملے گی۔ ایک مرتبہ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا: باری تعالیٰ! مَیں ایک سال کے لیے تمام مخلوق کی دعوت کرنا چاہتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے کہا : اے سلیمان! یہ تمہارے بس کا کام نہیں ہے۔ کہا: ایک مہینے کی۔ کہا: نہیں کراسکتے۔ کہا: ایک ہفتہ کی۔ کہا: نہیں کراسکتے۔ کہا: ایک دن کی۔ تو کہا: نہیں کراسکتے ، لیکن اچھا چلو، تم کہتے ہو تو ایک دن کی کر کے دیکھ لو۔ انہوں نے کھانا پکوانا شروع کیا، ان کے تابع تو جنات بھی تھے، انہوں نے جنات اور انسان سب کو کام پر لگایا، اور تمام جگہوں سے بہت سارا کھانا منگوایا اور آٹھ روز تک پکوایا جاتا رہا۔ پھر سمندر کے کنارے دستر خوان لگایا گیا، اس لئے کہ اتنی بڑی جگہ اور کہاں ملتی۔ اور جو کھانا پکوایا تھا وہ سب وہاں رکھ دیا، پھر سوچا کہ کس سے شروعات کی جائے، تو خیال آیا کہ سمندر کی مخلوق سے ابتداء کی جائے، چناں چہ اعلان کرایا۔ ایک مچھلی باہر آئی اور ذرا سی دیر میں سب کچھ چٹ کر گئی اور کہنے لگی کہ اور کچھ ہے؟ حضرت سلیمان علیہ السلام کہنے لگے: اب کیا چاہیے؟ اس نے کہا: ابھی تو میری بھوک باقی ہے۔ پھر اس مچھلی نے کہا: آج جو کھایا اس کا ڈبل روزانہ ایک وقت کھاتی

ہوں اور جب سے میں پیدا ہوئی ہوں میر االلہ مجھے دووقت برابر کھلا رہا ہے، لیکن اے سلیمان! آج تمہاری دعوت کی وجہ سے مجھے بھوکا رہنا پڑا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کہنے لگے: روزی دینا اللہ تعالیٰ ہی کا کام ہے، کسی انسان کے بس کا روگ نہیں ہے۔ بہر حال! اللہ تعالیٰ ہی تمام مخلوق کو روزی پہنچانے والا ہے۔

توبسم اللہ پڑھنے کا جو حکم دیا گیا ہے وہ ویسے ہی نہیں ہے، بلکہ اس کے ذریعہ بندہ کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایک تعلق پیدا کیا جارہا ہے۔ صرف اپنے خیال، زاویۂ نگاہ، اور سوچنے کے انداز کو بدلنے کی ضرورت ہے، اگر ادھر دھیان دیا جائے گا تو دھیرے دھیرے یہی چیز اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق پیدا کرنے کا ذریعہ بنے گی۔

اس روایت میں ایک ادب یہ بتلایا کہ کھانا شروع کرنے سے پہلے بسم اللہ پڑھی جائے۔ اور دیکھو! حضرت عمر بن آبو سلمہ رضی اللہ عنہما چھوٹے بچے تھے، لیکن چھوٹا سمجھ کر حضور ﷺ نے ان کو چھوڑ نہیں دیا، بلکہ ان کو ہدایات دیں اور آداب سکھائے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پچھلے کئی ابواب سے علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے زندگی کے آداب سے متعلق نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جو تعلیمات ہیں ان کو پیش کرنا شروع کیا ہے، چناں باب کا عنوان قائم کیا تھا: "التَّسْمِيَةُ فِيْ أَوَّلِهٖ وَالْحَمْدُ فِيْ آخِرِهٖ" کھانے سے پہلے اللہ کا نام لینا اور کھانے کے بعد اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء اور تعریف بیان کرنا۔ یہ کھانے کے آداب میں سے ہے۔ اس باب میں کھانے کے آداب سے متعلق دو چیزیں بتائی ہیں۔ گزشتہ مجلس میں ایک آچکی ہے، آج حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت پیش کررہے ہیں۔

شروع میں نہیں تو جب یاد آئے:

حدیث ۷۲۹:-

وعن عائشة رضی اللہ عنہا قالت قال رسول الله (صلی اللہ علیہ وسلم): إِذَا أَكَلَ أَحَدُكُمْ فَلْيَذْكُرِ اسْمَ اللهِ تَعَالَى، فَإِنْ نَسِيَ أَنْ يَذْكُرَ اسْمَ اللهِ تَعَالَى فِي أَوَّلِهٖ، فَلْيَقُلْ: بسم اللهِ أَوَّلَهُ وَآخِرَهُ.

ترجمہ:- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: تم میں سے کوئی آدمی جب کھانے کا ارادہ کرے؛ تو اللہ تعالیٰ کا نام لے، اور اگر کھانے کے شروع میں بسم اللہ پڑھنا بھول جائے تو درمیان میں جب بھی اس کو یاد آئے: "بِسْمِ اللهِ أَوَّلَهُ وَآخِرَهُ" پڑھ لے۔

افادات:- صرف ''بسم اللہ'' کہا تب بھی سنت تو ادا ہو جائے گی، اور اگر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پوری پڑھے تو بہت اچھا ہے اور عام طور پر کھانے سے پہلے یہ دعا پڑھی جاتی ہے: ''بِسْمِ اللّٰہِ وَبَرَکَۃِ اللّٰہِ'' (المستدرک علی الصحیحین للحاکم النیسابوری / حدیث نمبر: ۷۰۸۴) اصل تو یہ ہے کہ کھانے کا عمل جب شروع ہو، اس وقت اللہ کا نام لیا جائے؛ یہی مستحب اور ادب ہے، لیکن اگر کوئی آدمی شروع میں اللہ کا نام لینا بھول جائے اور درمیان میں یاد آجائے تو یہ نہ سمجھے کہ میں تو محروم ہو گیا، بلکہ نبی کریم (ﷺ) نے اس کا بھی طریقہ بتا دیا کہ درمیان میں جب یاد آجائے تو ''بِسْمِ اللّٰہِ أَوَّلَہٗ وَاٰخِرَہٗ'' پڑھ لے یعنی اللہ کا نام شروع میں بھی اور آخر میں بھی لیتا ہوں (سنن ابی داود، باب التَّسْمِیَۃِ عَلَی الطَّعَامِ) ایک روایت میں یہ بھی ہے: ''بِسْمِ اللّٰہِ أَوَّلَہٗ وَأَوْسَطَہٗ وَاٰخِرَہٗ'' شروع میں، درمیان میں اور آخر میں اللہ کا نام لیتا ہوں (تحفۃ الذاکرین بعدۃ الحصن الحصین من کلام سید المرسلین / ص: ۱۹۲)

بہر حال! نبی کریم (ﷺ) نے یہ بھی ایک طریقہ بتا دیا۔ کھانے کے شروع میں بسم اللہ پڑھنا کوئی فرض اور واجب نہیں ہے کہ اگر چھوٹ گیا تو اس کی قضاء کی جائے، لیکن ایک نیک عمل ہے، اور شریعت کی تعلیمات ہمیں یہ بتلاتی ہیں کہ جو کسی عمل کا اپنے آپ کو پابند بنائے، اس کو چاہیے کہ اپنے عمل پر اہتمام کے ساتھ پابندی کے ساتھ عمل کرتا رہے، اس کو چھوڑنے کی نوبت نہ آئے۔ اللہ تعالیٰ نے جب کسی ایک لائن اور طریقہ سے اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرمانبرداری اور نیکیاں حاصل کرنے کی توفیق دی اور نیکی حاصل کرنے کا جو طریقہ آپ نے اپنی زندگی میں جس وقت جس اعتبار اور جس لائن سے بھی اپنا رکھا ہے، وہ طریقہ اگر کسی وجہ

سے اپنے وقت پر چھوٹ گیا تو اس کو دوسرے وقت ادا کرلو،اگر چہ وہ فرض اور واجب نہیں،نہ اس کی قضاء واجب ہے، لیکن جب وہ نیکی کا ایک کام ہے جو ہم اپنے نامۂ اعمال میں اس وقت پر اندراج نہ کرسکے، اوردرمیان یا اخیر میں یاد آگیا ،تو اسی وقت پڑھ لیں۔

حضرت فقیہ الامت رحمۃ اللہ علیہ کا معمول:

ہمارے بزرگوں نے اسی حکم سے ایک اوربات بتلائی ہے۔ہمارے حضرت مفتی محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خادمِ خاص حضرت مولانا ابراہیم صاحب پانڈور افریقی دامت برکاتہم فرماتے ہیں کہ:بعض مرتبہ سفر میں دیکھا کہ کسی وجہ سے حضرت کے نوافل جن کا معمول ہوا کرتا تھا وہ ادا نہیں ہوپائے،مثلاً:مغرب کے بعد اوابین کی عادت تھی، اور کسی وجہ سے وہ ادانہ ہو پائے ،جیسے: نماز کے بعد کچھ لوگوں سے ملنا ہے،یابیان کا پروگرام رکھ دیا گیاہے،اگر اوابین میں مشغول ہوتے ہیں تو جو لوگ سننے کے لیے بیٹھے ہیں ان کو انتظار کرنا پڑتاہے،ان کوانتظار کی زحمت نہ ہواس لیے ضروری سمجھاجاتاہے کہ اپنی اوابین کوروک کرآدمی پروگرام میں مشغول ہو، تو مولانافرماتے ہیں : حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھاکہ مغرب کے بعد وہ نوافل ادا کرنے کی نوبت نہیں آئی کیوں کہ عشاء تک بیان میں مشغولی رہی تو جب عشاء کی اذان ہوتی تھی تو عشاء کی سنتیں ادا فرماتے تھے اور ساتھ میں ان نوافل کو بھی ادا فرمالیتے تھے

حضرت عارفی رحمۃ اللہ علیہ کا عمل:

حضرت ڈاکٹر عبد الحئی صاحب عارفی رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے خلفاء میں سے تھے، ان کے متعلق لکھا ہے کہ: ایک مرتبہ کسی جگہ جارہے تھے، مغرب کے بعد وہاں پہنچنا تھا، لیکن وقت پر نہیں پہنچ پائے، راستہ میں مغرب کی نماز پڑھنے کی نوبت آئی تو اس خیال سے کہ وہاں لوگ انتظار میں ہوں گے مغرب کی نماز کے بعد کی دو رکعت سنتِ مؤکدہ ادا کیں اور اوابین چھوڑ کر جہاں جانا تھا وہاں پہنچے، لوگ پہلے سے انتظار ہی میں تھے، بیان میں مشغول ہو گئے، اسی میں عشاء کا وقت آگیا۔ عشاء کے بعد پھر کچھ دیر تک مشغولی رہی۔ بعد میں ساتھیوں سے پوچھا: بھائی! اوابین کا کیا ہوا؟ کہا: حضرت! وہ تو چھوٹ گئیں، اس لیے کہ پروگرام میں مشغول ہو گئے تھے، اگر اوابین میں مشغول ہوتے تو لوگوں کو انتظار کی زحمت برداشت کرنی پڑتی، تو حضرت نے اپنے ماتحتوں کی تربیت کے لیے بتایا کہ جب عشاء کی اذان ہوئی تو اذان اور نماز کے درمیان میں جو وقت ملا تھا، ہم نے تو اس وقت اوابین بھی ادا کر لی۔ پھر فرمایا: اگر چہ یہ فرض اور واجب نہیں، لیکن جب ہم اس کے عادی ہو گئے ہیں کہ اپنے نامۂ اعمال میں روزانہ اتنی نفل کا ثواب لکھوائیں، تو آج کیوں خالی جانے دیں، اگر اس مقررہ وقت پر نہ لکھوا پائے تو بعد میں جب اللہ تعالیٰ موقعہ دے اس وقت اس کا اہتمام کر لینا چاہیے۔ بزرگوں سے یہی چیزیں سیکھنے کی ہوتی ہیں۔

ہمارے دیگر اکابر کو بھی دیکھا کہ وہ اس کا اہتمام کرتے ہیں کہ کوئی معمول وقت پر ادا نہ ہوپایا تو دوسرے وقت میں اس کو- قضاء کی نیت سے نہیں، لیکن -ادا کرلیتے ہیں،اس لیے کہ جس نیک عمل کی پابندی کر رہے تھے،کیوں اس عمل سے محروم رہیں۔اس روایت میں نبیٔ کریم (ﷺ) نے جو طریقہ بتایا کہ کھانے کے شروع میں بسم اللہ نہیں پڑھی اور درمیان میں یاد آگیا تو آدمی یہ سوچے کہ شروع میں تو نہیں پڑھ سکا تو اب درمیان میں تو پڑھ لوں۔

مسنون دعائیں ؛حفاظت کا ذریعہ:

حدیث ۷۳۰:-

وعن جابرٍ رضی اللہ عنہ قَالَ : سَمِعْتُ رسول الله (ﷺ) يقولُ : إِذَا دَخَلَ الرَّجُلُ بَيْتَهُ، فَذَكَرَ اللهَ تَعَالَى عِنْدَ دُخُولِهِ، وَعِنْدَ طَعَامِهِ، قَالَ الشَّيْطَانُ لأَصْحَابِهِ : لاَ مَبِيْتَ لَكُمْ وَلاَ عَشَاءَ. وَإِذَا دَخَلَ فَلَمْ يَذْكُرِ اللهَ تَعَالَى عِنْدَ دُخُولِهِ، قَالَ الشَّيْطَانُ : أَدْرَكْتُمُ المَبِيْتَ ؛ وَإِذَا لَمْ يَذْكُرِ اللهَ تَعَالَى عِنْدَ طَعَامِهِ، قَالَ : أَدْرَكْتُمُ المَبِيْتَ وَالْعَشَاءَ. (رواہ مسلم)

ترجمہ:-حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (ﷺ) کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: جب کوئی آدمی اپنے گھر میں داخل ہوتے وقت اللہ کا ذکر کرتا ہے، دعا پڑھتاہے، اور جب کھانے کے لیے بیٹھتا ہے تو اس وقت کی دعا پڑھتا ہے؛تو شیطان اپنے لشکر سے کہتا ہے :اس گھر میں نہ تو قیام کی گنجائش ہے اور نہ کھانے کا کوئی انتظام ہے۔اور جب آدمی اپنے گھر میں داخل ہوتے وقت اللہ کا نام نہیں لیتا تو شیطان اپنے لشکر سے

کہتا ہے: تم کو اس گھر میں ٹھکانہ تو مل گیا۔اور جب کھانے کے لیے بیٹھتا ہے اور بسم اللہ نہیں پڑھتا، تو شیطان اپنے رفقاء سے کہتا ہے: ٹھکانہ بھی مل گیا اور کھانا بھی مل گیا۔

افادات:- لہٰذا جب آدمی گھر میں داخل ہو تو وہ دعا پڑھ لینی چاہیے جو نبی کریم (صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ) نے ہمیں سکھائی ہے: اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ خَيْرَ الْمَوْلِجِ، وَخَيْرَ الْمَخْرَجِ، بِسْمِ اللهِ وَلَجْنَا، وَبِسْمِ اللهِ خَرَجْنَا، وَعَلَى اللهِ رَبِّنَا تَوَكَّلْنَا (سنن ابی داود:۵۰۹۶) اگر دعا یاد نہ ہو تو اس کو لکھ کر گھر کے دروازہ پر لگا دو؛ تاکہ جب داخل ہو تو اس پر نظر پڑے تو یاد آجائے، ایک مدت تک جب یہ معاملہ رہے گا تو ان شاء اللہ عادت پڑ جائے گی، اور پھر آسان ہو جائے گا۔

پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ ایک تو ان دعاؤں کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ ایک خاص نسبت پیدا ہوتی ہے، جب آدمی موقع بہ موقع، ہر کام میں ہر چیز پر اللہ تعالیٰ کا نام لے گا اور اللہ تعالیٰ کو یاد کرے گا تو اللہ تعالیٰ کی محبت دل میں بیٹھے گی، اللہ کی ذات کے ساتھ تعلق قائم ہو گا، اور اللہ تعالیٰ کی یاد ہر وقت باقی رہے گی۔

اور دوسری بات یہ ہے کہ اس طرح آدمی اللہ تعالیٰ سے خیر مانگ رہا ہے، یعنی کہ میرا گھر میں داخل ہونا بھی بہتر اور اچھے انداز میں ہو۔ کیوں کہ کسی کو معلوم نہیں کہ اس کی غیر موجودگی میں گھر میں کیا ہوا ہے، ہو سکتا ہے کہ گھر میں داخل ہوئے اور بیوی نے کہا کہ بچہ کو بخار ہے۔ جب پہلے ہی سے بہتری مانگ لی اور کوئی پریشان کن خبر سن لی یا اور کوئی پریشانی

سے واسطہ پڑا، توچوں کہ پہلے ہی سے دعا مانگ لی ہے کہ بہترین داخل ہونانصیب ہو،تواللہ تعالیٰ خیر عطافرمادیں گے۔اس کے بعد جب گھر سے نکلنے کا وقت آئے تواللہ تعالیٰ اچھے انداز سے نکلنانصیب کرے۔یہ نہیں کہ داخل ہوئے تو پتہ چلاکہ بچہ بیمار ہے تو نکلنا بھی اچھا نہیں ہوا،اگر اللہ تعالیٰ سے دعا مانگ لی ہے تو دونوں چیزیں اچھے انداز میں مل جائیں گی، اورجیساکہ پہلے بھی بتایا تھا کہ آپ (ﷺ) کی تعلیمات میں ان چیزوں کا خاص اہتمام کیا گیاہے۔

شیطانی اثرات کاتوڑ:

حضرات انبیاء ہدایت کے لیے دنیا میں آتے ہیں ، اور اللہ کی مخلوق کا اللہ کی ذات سے تعلق قائم کرتے ہیں ،ہر چیز میں اور ہر موقع پر ان کی تعلیمات کا خلاصہ یہ ہوتا ہے کہ بندہ اپنے رب سے جُڑے، اللہ تعالیٰ سے اس کا تعلق قائم ہو،اس کے لئے مختلف طریقے اور راستے بتلاتے ہیں۔اور شیطان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ سے دورہو،اس کا تعلق کم ہو،یا کٹ جائے۔انسان کا بچہ جونہی دنیا میں قدم رکھتا ہے، اسی وقت سے یہ سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔حدیث ِپاک میں آتا ہے،نبیِ کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا:بچہ جب پیدا ہوتا ہےتو وہ روتا ہے،اس لیے کہ جب وہ دنیا میں قدم رکھتا ہے تو شیطان اس کے دل کو چھوتا ہے(بخاری شریف:باب وإني أعيذها بك وذريتها من الشيطان الرجيم)تو ایک نئی چیز جو آج تک اس کو پیش نہیں آئی تھی وہ اس کوپیش آتی ہے،جس کی وجہ سے وہ بچہ ایک طرح کا اجنبی پن محسوس کرتا ہے، اور روتا ہے۔

دراصل شیطان کو اللہ تعالیٰ نے انسان کے دل پر وسوسہ اندازی کی قدرت دی ہے،اس سے زیادہ اور کچھ طاقت اس کے پاس نہیں ، وہ ڈنڈا لے کر آپ سے گناہ نہیں کروائے گا ،اور نہ آپ کا ہاتھ پکڑ کر گناہ کروائے گا،اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے صرف اتنی ہی طاقت دی گئی ہے کہ وہ انسان کے دل میں وسوسہ اندازی کر سکے،اور اسی کے ذریعہ وہ آدمی کو گناہوں پر آمادہ کرتا ہے۔اب وہ ماں جس کے پیٹ میں بچہ ہے اس کے دل پر تو وسوسہ اندازی کر سکتا ہے،لیکن اس کو اتنی طاقت نہیں کہ جب تک وہ بچہ ماں کے پیٹ میں ہے اس کو ٹچ (Touch) بھی کر سکے،کیوں کہ وہ بچہ ابھی تک دنیا میں نہیں آیا ہے۔جتنے انسان دنیا میں آچکے ہیں ان پر تو وہ اپنا تصرف کر سکتا ہے ،لیکن اس بچہ پر نہیں ،اس لیے کہ جب تک وہ ماں کے پیٹ میں ہے دوسرے عالم میں ہے، حالاں کہ وہ ماں کے پیٹ میں ہے،ماں کا دل بھی اندر ہے اور اس کا بھی دل اندر ہی ہے،لیکن ماں کے دل پر تصرف کر سکتا ہے،اس بچہ کے دل پر تصرف نہیں کر سکتا، کیوں کہ بچہ ابھی دنیا کی چیز نہیں بنا،لیکن اس کے پیدا ہوتے ہی شیطان پہنچ جاتا ہے اور اس کے دل کو ٹٹولنے لگتا ہے۔

شیطان اپنے کام میں بہت ہوشیار ہے، اس لیے کہ اس کی محنت کا میدان انسان کا دل ہے،اور نیا انسان دنیا میں آیا تو جہاں محنت کرنی ہے وہاں جائزہ لینے کے لئے پہنچ جاتا ہے۔ جیسے:چور جب کسی مکان میں چوری کرنے والا ہوتا ہے تو ایک دم سے وہاں نہیں پہنچ جاتا، بلکہ دو چار روز آگے پیچھے سے پلاننگ کرتا ہے ،جائزہ لیتا ہے کہ وہ مکان کہاں ہے، اور کہاں

سے داخل ہونا ہے، ساری معلومات حاصل کرنے کے بعد وقت آنے پر وہ اپنا کام کرتا ہے۔ اسی طرح شیطان کا معاملہ بھی ہے کہ بچہ جب بڑا ہوگا اس وقت وہ مکلّف ہوگا، لیکن دنیا میں اس کے آتے ہی شیطان دیکھ لیتا ہے کہ میرا ایک نیا شکار دنیا میں آیا ہے، اس کا جائزہ لے لو۔ جیسے: دوا بنانے والی کمپنی اپنی دوا فروخت کرنے کے لیے سیلس مین رکھتی ہے، ان کو جیسے ہی معلوم ہوتا ہے کہ کسی شہر میں کسی ڈاکٹر نے نیا شفاء خانہ کھول دیا ہے، تو فوراً وہ پہنچ جاتے ہیں کہ ہماری محنت کا نیا میدان ہے، ان سے ملاقات کرتے ہیں۔ شیطان بھی جب دیکھتا ہے کہ کوئی نیا بچہ دنیا میں آیا ہے تو اس کے دل کو جا کر ٹٹولتا ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اس کے اثرات کو دور کرنے کے لیے اس کا بدل رکھا ہے۔ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ہمیں تعلیم دی ہے کہ بچہ جب پیدا ہو تو جو آلائشیں ماں کے پیٹ سے لے کر نکلا ہے اس کو دھونے کے بعد غسل دے کر دائیں کان میں اذان اور بائیں کان میں اقامت کہی جائے۔ یہ اذان و اقامت کے جو کلمات کہلوائے جارہے ہیں وہ شیطان کے انہی اثرات کو دور کرنے کا کام کرتے ہیں جو اس بچہ کے دل کو چھونے کے نتیجہ میں آتے ہیں۔ اور دوسرے یہ کہ ان میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی رسالت اور اسلام کے بنیادی عقائد ہیں، ان کو گویا اس کے دل میں اتارنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ بچہ اگر چہ ابھی کچھ جانتا نہیں ہے، لیکن اس کا دل ٹیپ ریکارڈر جیسا ہے، اس میں وہ چیز محفوظ ہوگی اور وقت آنے پر اپنا کام کرے گا۔

خود ہی موقع دیں ؛ پھر پریشان ہوں !

اب شیطان اپنے اثرات ڈالنے ، اپنی زمین ہموار کرنے اور وسوسہ اندازی کے واسطے ابھی سے محنت کررہاہے۔جیسے کسی کے اوپر محنت کرنی ہوتی ہے، تو پہلے ماحول کوساز گار بنایاجاتاہے ، جب ماحول ساز گار ہوجائے گا،اس کے بعداس پر محنت کی جائے گی۔اسی لئے اس حدیثِ پاک میں بتایاگیاکہ آدمی جب گھر میں داخل ہوتاہے، توشیطان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اللہ کا نام نہ لے،اس لیے کہ آدمی جب اللہ کا نام لئے بغیرگھر میں داخل ہوتاہے تو شیطان کو بھی اندر آنے کا موقع مل جاتا ہے ،وہ اپنے ساتھیوں سے کہتا ہے کہ آج رات تم کو یہاں ٹھہرنے کا موقع مل گیا ،گویا قیام کی بکنگ ہوگئی۔پھرجب کھانے کے لیے بیٹھا اوربسم اللہ نہیں پڑھی تو کھانے کی بھی بکنگ ہوگئی۔ اب یہ ہوگا کہ جب شیطان پورےلشکر کے ساتھ گھرمیں داخل ہوچکا،تو ویسے باہر رہ کر بھی وسوسہ اندازی کرسکتا تھا، لیکن اب وسوسہ سازی کے لیے جس قسم کا ماحول مطلوب ہے وہ اس کوحاصل ہوگیا،اب اور اچھے انداز میں وہ اپنی محنت کرے گا اورگمراہ کرے گا۔پھر جب اس کوکھانا مل جائے گا تو اب کھانے میں شریک ہوجائے گا،اس لیے کھانے کی جوبرکت اور نورانیت ہے وہ حاصل نہیں ہوگی، اس کے بعد شیطان کو مزید وسوسہ اندازی کا موقع مل جائے گا۔

اسی لیے حضورِ اکرم (ﷺ) نے فرمایا کہ: جب گھر میں داخل ہوؤ تو اللہ تعالیٰ کا نام لے کر داخل ہونا اور جب کھانے کے لیے بیٹھو تو اللہ کا نام لینا، کیوں کہ شیطان کا کام ہے کہ وہ انسان کی ہر چیز میں اپنا حصہ لگانا چاہتا ہے، اس کے گھر میں، کھانے میں، رہائش گاہ میں؛ یہاں تک کہ مرد جب اپنی بیوی کے ساتھ ہم بستری کرتا ہے، تو اس صحبت میں بھی شیطان شریک ہونا چاہتا ہے۔ اس لیے اس موقعہ پر بھی دعا سکھائی گئی ہے۔ وہ دعا یہ ہے: ”بِسْمِ اللهِ، أَللّٰهُمَّ جَنِّبْنَا الشَّيْطَانَ وَجَنِّبِ الشَّيْطَانَ مَا رَزَقْتَنَا“

اسی طرح آدمی جب بیت الخلاء میں جاتا ہے تو وہاں بھی شیطان اس کی شرمگاہ سے کھیلنے کی کوشش کرتا ہے، اس وقت بھی تعلیم دی گئی کہ پہلے بسم اللہ کہو اور پھر یہ دعا پڑھو: ”أَللّٰهُمَّ إِنِّي أَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْخُبُثِ وَالْخَبَائِثِ“ یہ ساری دعائیں معمولی نہیں ہیں، بلکہ ان دعاؤں کے ذریعہ ہمارا تعلق اللہ تعالیٰ کی ذات سے قائم ہوتا ہے، اور اسی کے ذریعہ شیطان کے حملوں سے حفاظت کی راہیں ہموار ہوتی ہیں۔ ہم ان دعاؤں کا اہتمام نہیں کرتے، گویا کہ ہم نے خود شیطان اپنے اوپر حملہ کرنے کا موقع دیا، پھر جب شیطان کی وسوسہ اندازی ہوتی ہے تو پریشان ہوتے ہیں۔ لہٰذا ہم پہلے سے شیطان کو ماحول ساز گار بنانے اور اپنے اوپر حملہ کرنے کا موقعہ ہی کیوں دیں؟ اگر ان دعاؤں اور ان ساری تعلیمات کا اہتمام کریں گے تو اس کے حملوں سے محفوظ ہو جائیں گے، اور اگر تھوڑے بہت ہو بھی گئے تو جب اللہ تعالیٰ سے پناہ حاصل

کریں گے تو شیطان کے شر سے جلدی اور آسانی سے بچ جائیں گے۔اس لیے اس کا خاص اہتمام خود بھی کرنا چاہیے اور اپنے گھر والوں کے پاس بھی کرانا چاہیے۔

شیطان کا ہاتھ میرے ہاتھ میں :

حدیث ۱۳۷۱:-

وعن حُذَیْفَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ کُنَّا إِذَا حضَرْنَا مَعَ رَسُولِ اللهِ (ﷺ) طَعَاماً لَمْ نَضَعْ أيدِينَا حَتَّى يَبْدَأَ رَسُولُ اللهِ (ﷺ) فَيَضَعَ يَدَهُ، وإنَّا حضَرْنَا مَعَهُ مَرَّةً طعَاماً فَجَاءَتْ جَارِيَةٌ كَأَنَّهَا تُدْفَعُ، فَذَهَبَتْ لِتَضَعَ يَدَهَا فی الطَّعَامِ فَأَخَذَ رسول الله (ﷺ) بِيَدِهَا، ثُمَّ جَاءَ أَعْرَابِيٌّ كَأَنَّمَا يُدْفَعُ، فَأخَذَ بِيَدِهِ، فَقَالَ رَسُولُ اللهِ (ﷺ): إِنَّ الشَّيْطَانَ يَسْتَحِلُّ الطَّعَامَ أَنْ لا يُذْكَرَ اسْمُ اللهِ تَعَالَى عَلَيْهِ، وَإِنَّهُ جَاءَ بِهذِهِ الجارية لِيَسْتَحِلَّ بِهَا، فَأَخَذْتُ بِيَدِهَا، فَجَاءَ بهذا الأعرَابِيِّ لِيَسْتَحِلَّ بِهِ، فَأَخذْتُ بِيَدِهِ، والَّذِی نَفْسِی بِيَدِهِ، إنَّ يَدَهُ فی يَدِی مَعَ يَدَيْهِمَا .. ثُمَّ ذَكَرَ اسْمَ اللهِ تَعَالَى وَأَكَلَ.

ترجمہ:- حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم لوگ جب کھانے کے لیے نبی کریم (ﷺ) کے ساتھ کسی دعوت یا کھانے میں حاضر ہوتے تھے تو ہم کھانے کے لیے اپنے ہاتھ آگے نہیں بڑھاتے تھے یہاں تک کہ نبی کریم (ﷺ) کھانا شروع فرمائیں۔ایک مرتبہ ایک دعوت کے موقعہ پر ہم لوگ نبیؑ کریم (ﷺ) کے ساتھ موجود تھے، کھانا دسترخوان پرچن دیا گیا، ابھی نبی کریم (ﷺ) نے کھانا شروع نہیں فرمایا تھا، اپنا دستِ مبارک آگے نہیں بڑھایا تھا کہ ایک بچی تیزی کے ساتھ آئی، ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ کوئی دھکے دے کر اس کو لا رہا ہے، اس نے کھانے میں ہاتھ ڈالنا چاہا تو نبی کریم (ﷺ) نے اس کا ہاتھ پکڑ

لیا(یعنی اس کو کھانے نہیں دیا، اس لیے کہ اس نے بسم اللہ نہیں پڑھی تھی)اس کے بعد ایک دیہاتی تیزی سے آیااور اس نے کھانے کی طرف ہاتھ بڑھاناچاہاتوحضورِاکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس کا ہاتھ بھی پکڑ لیا(کھانے کے اندرہاتھ ڈالنے نہیں دیا، اس لیے کہ اس نے بھی بسم اللہ نہیں پڑھی تھی)اس کے بعد حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: جس کھانے پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو، شیطان اس کھانے کو اپنے لیے حلال کرلیتا ہے۔پھر حضورِاکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے ؛شیطان کا ہاتھ ان دونوں کےہاتھ کے ساتھ میرے ہاتھ میں ہے۔اس کے بعد آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نےبسم اللہ پڑھ کر کھاناشروع فرمایا۔

فوائد حدیث :

افادات:-اس روایت سے مندرجۂ ذیل امور معلوم ہوئے:-

۱:- یہ بھی ادب میں سے ہے کہ بڑوں کے ساتھ جب کھانے کے لیے بیٹھےہوں تو جب تک بڑے کھانا شروع نہ کریں ، چھوٹوں کو کھاناشروع نہیں کرنا چاہیے، جب وہ شروع کریں تب دوسروں کو چاہیے کہ کھانا شروع کریں۔حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتےہیں کہ حضراتِ صحابہ کایہی معمول تھا۔

۲:- یہ بھی معلوم ہوا کہ جو آدمی اپنے چھوٹوں کو اپنے ساتھ لے کر کھانے کے لیے بیٹھا ہو،اس کو چاہیے کہ ان کی نگرانی کرے کہ انہوں نے بسم اللہ پڑھی یا نہیں ، اگر نہ پڑھی ہوتو

ان کو کھانا کھانے نہ دے، ان کا ہاتھ پکڑ لے،اور کہے کہ پہلے بسم اللہ پڑھو، اس کے بعد کھانا شروع کرو۔ تربیت کا یہی تقاضہ ہے۔ دیکھیے! یہاں نبیٔ کریم (ﷺ) نے اس بچی کا ہاتھ پکڑ لیا، اس لیے کہ اس نے بسم اللہ نہیں پڑھی تھی۔اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بچوں کو ادب سکھانا چاہیے۔

آج کل تو ماں باپ اس کا اہتمام ہی نہیں کرتے ، جب بچہ کی مرضی ہو گی تو کھائے گا، خادمہ اور نوکرانی اس کو کھلا دے گی، ماں باپ اپنی اپنی مرضی سے کھائیں گے۔ماں باپ کو یہ پرواہ ہی نہیں کہ بچوں کو اپنے ساتھ بٹھا کر کھلائیں کہ ان کو کھانے کے آداب سے واقفیت ہو؛حالاں کہ ماں باپ کے لیے ضروری ہے کہ باقاعدہ خود بیٹھ کر بچوں کو اپنے ساتھ بٹھائیں اور اس کا اہتمام کرائیں۔

نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آدمی کو چاہیے اپنے چھوٹوں اور ماتحتوں کی نگرانی کرے،ان کی طرف سے اگر ان آداب کی ادائیگی میں کوئی کوتاہی ہو تو اس پر ٹوکے اور آئندہ آداب کے اہتمام کے ساتھ تمام کاموں کی ادائیگی کی تاکید کرے۔

۳:- در اصل شیطان اپنا ہاتھ ڈال کر اس کھانے کو اپنے لیے حلال کرنا چاہتا تھا،اس لیے وہ اس بچی کو دوڑاتا ہوا لایا، وہ چاہتا تھا کہ یہ بچی بغیر بسم اللہ پڑھے جلدی سے اس کھانے میں ہاتھ ڈال دے،تاکہ اس کو واسطہ بنا کر اس کھانے میں شریک ہو جائے،لیکن حضور (ﷺ) نے

بچی کا ہاتھ پکڑ لیا۔جب اس نے دیکھا کہ میں اس تدبیر میں کامیاب نہیں ہوا تو دیہاتی کو لے آیا، وہ دوڑا ہوا آیا اور اس نے بھی بغیر بسم اللہ کہے ہاتھ آگے بڑھا کر کھانا چاہا، تو حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس کا بھی ہاتھ پکڑ لیا، اس لیے کہ اگر حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) اس کو کھانے دیتے تو شیطان اس کے ساتھ شریک ہو جاتا۔

شروع میں نہیں ؛ تو اخیر میں سہی:

حدیث ۷۳۲:-

وعن أُمَيَّةَ بن مَخْشِيٍّ الصحابِيِّ رضی اللہ عنہ قَالَ: كَانَ رسولُ الله (صلی اللہ علیہ وسلم) جَالِسًا، وَرَجُلٌ يَأْكُلُ، فَلَمْ يُسَمِّ اللهَ حَتَّى لَمْ يَبْقَ مِنْ طَعَامِهِ إِلَّا لُقْمَةٌ، فَلَمَّا رَفَعَهَا إِلَى فِيهِ، قَالَ: بِسْمِ اللهِ أَوَّلَهُ وَآخِرَهُ، فَضَحِكَ النَّبِيُّ (صلی اللہ علیہ وسلم) ثُمَّ قَالَ: مَا زَالَ الشَّيْطَانُ يَأْكُلُ مَعَهُ، فَلَمَّا ذَكَرَ اسْمَ اللهِ اسْتَقَاءَ مَا فِي بَطْنِهِ. (رواه أبوداود والنسائی)

ترجمہ:- حضرت اُمیّہ بن مَخْشِی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) تشریف فرما تھے، ایک آدمی کھانا کھا رہا تھا، کھانے کے شروع میں اس نے بسم اللہ نہیں پڑھی تھی (اس لیے شیطان بھی کھانے میں اس کے ساتھ شریک تھا۔اس آدمی کو تو نظر نہیں آرہا تھا لیکن نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) دیکھ رہے تھے) یہاں تک کہ اس کے کھانے میں سے ایک ہی لقمہ باقی بچا تھا کہ اس کو یاد آگیا کہ میں نے شروع میں بسم اللہ نہیں پڑھی ہے، لہٰذا اس نے فوراً کہا: "بِسْمِ اللهِ أَوَّلَهُ وَآخِرَهُ"، یہ منظر دیکھ کر نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) ہنس پڑے،

پھر ارشاد فرمایا: شیطان برابر اس آدمی کے ساتھ شریک رہا، آخر میں جب اس نے یہ دعا پڑھی تو شیطان نے کھایا ہوا قے کر دیا (یعنی شیطان اس کھانے کو ہضم نہیں کر سکا۔)

افادات:- اس سے معلوم ہوا کہ اخیر میں بھی یاد آجائے تو پڑھ لے۔ بعض لوگ سوچتے ہیں کہ شروع میں نہیں پڑھی تو اب اخیر میں کیا پڑھنی؟ یہ بھی شیطانی دھوکہ ہے۔ جو طریقہ ہمیں بتایا گیا ہے ہمیں تو اس پر عمل کرنا ہے۔ اس طرح کی سوچ اور خیال بھی شیطانی وسوسہ ہے، شیطان اپنے کھانے کو محفوظ کرنا چاہتا ہے۔

بعض لوگوں کا مزاج اعتراض والا ہوتا ہے اور آج کل عموماً ایسا مزاج بن گیا ہے کہتے ہیں کہ جب شیطان نے قے کر دی تو اس سے ہمیں کیا فائدہ ملا؟ ایک صاحب نے ایک مرتبہ یہی سوال کیا تھا۔ اس کا جواب ظاہر ہے کہ شیطان کو اس کھانے میں شریک ہونے کی وجہ سے وسوسہ اندازی کا اچھا موقع فراہم ہو جاتا ہے، اور شیطان کے اثرات کھانے میں آجاتے ہیں، لیکن جب بسم اللہ پڑھ لی گئی، چاہے آخری لقمہ سے پہلے ہی کیوں نہ ہو، اور شیطان نے قے کر دی، تو اب شیطان کو اس راہ سے اس پر قابو پانے کا موقع نہیں ملے گا۔ معلوم ہوا کہ آخری لقمہ پر بھی یاد آجائے تو بسم اللہ پڑھ لی جائے۔

بسم اللہ کی برکت:

حدیث ۷۳۳:-

وعن عائشة رضی اللہ عنہا قالت: كَانَ رسولُ الله (ﷺ) يَأْكُلُ طَعَاماً فى سِتَّةٍ مِنْ أَصْحَابِهِ، فَجَاءَ أَعْرَابِيٌّ، فَأَكَلَهُ بِلُقْمَتَيْنِ. فَقَالَ رسولُ الله (ﷺ): أَما إِنَّهُ لَوْ سَمَّى لَكَفَاكُمْ. (رواه الترمذی.)

ترجمہ:- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبیٔ کریم (ﷺ) چھ رفقاء کے ساتھ کھانا کھارہے تھے کہ ایک دیہاتی آیا اس نے دو لقموں میں کھانا ختم کر دیا۔ حضورِ اکرم (ﷺ) نے فرمایا: یہ آدمی اگر بسم اللہ پڑھتا تو یہ کھانا تم سب کو کافی ہو جاتا۔

افادات:- شیطان کے شریک ہونے سے کھانے کی برکت ختم ہوگئی۔ کھانے کی برکت یہی ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ کا نام لے، اور سب شریک ہونے والے بھی اللہ کا نام لیں؛ تاکہ شیطان کو کسی ایک کے واسطہ سے بھی کھانے میں شریک ہونے کا موقع نہ ملے۔ بخاری شریف کی روایت میں ہے کہ مؤمن ایک آنت سے کھاتا ہے (یعنی کم غذا سے اس کا پیٹ بھر جاتا ہے) اور غیر مسلم سات آنت سے کھاتا ہے (خوب ڈٹ کر کھاتا ہے) (باب المؤمن یأکل فی معی واحد) آپ غور کرنا کہ ان کے کھانے کی مقدار مسلمانوں کے کھانے کی مقدار سے بہت زیادہ ہوتی ہے۔ آپ اگر چاہیں تو عملی طور پر تجربہ کرکے دیکھ لیں، وہ زیادہ ہی کھائیں گے۔ اور جو مسلمان بسم اللہ

نہیں پڑھتے وہ بھی زیادہ ہی کھائیں گے۔بسم اللہ پڑھ کر جو لوگ کھانے کا اہتمام کرتے ہیں تو کم غذا میں اللہ تعالیٰ ان کو سکون عطا فرمادیتے ہیں۔

اور بسم اللہ کو جتنے یقین کے ساتھ پڑھنے والا ہوگا اتنی ہی اس کے کھانے کی مقدار گھٹتی جائے گی۔اس لیے ہم اہل اللہ کو دیکھیں گے کہ کم غذا میں بھی ان کا کام چل جاتا ہے۔

دستر خوان اُٹھانے کی دعا:

حدیث ۷۳۴:-

وعن أبي أُمامة رضی اللہ عنہ أنَّ النبيَّ (ﷺ) كَانَ إِذَا رَفَعَ مَائِدَتَهُ، قَالَ: الْحَمْدُ لِلّٰهِ حَمْداً كَثِيراً طَيِّباً مُبَارَكاً فِيهِ، غَيْرَ مَكْفِيٍّ، وَلَا مُوَدَّعٍ، وَلَا مُسْتَغْنًى عَنْهُ رَبَّنَا (رواه البخاری)

ترجمہ:- حضرت ابو اُمامہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (ﷺ) جب دستر خوان اٹھاتے تو یہ دعا پڑھتے تھے: ” تمام تعریف اللہ کے واسطے ہے ،بہت زیادہ پاکیزہ اور برکت والی تعریف۔اس کھانے کی شکرانہ کے ذریعہ سے کفایت نہیں کی گئی(یعنی جیسا شکر کا حق ہے ویسا شکر ہم نے ادا نہیں کیا) اور نہ اس کو چھوڑا جارہا ہے۔اور اے ہمارے رب! نہ ہم اس سے بے پرواہی اختیار کررہے ہیں۔“

افادات:- انسان کی عادت ہے کہ اس کو جس چیز کی حاجت ہوتی ہے اور جس چیز کا وہ محتاج ہوتا ہے، اس کو حاصل کرنے کے لیے بے چین ہوتا ہے، اور جب وہ چیز نظر آتی ہے تو لپک کر اس کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اس پر حملہ کردے

گا، لیکن جہاں اس کی اس سے ضرورت پوری ہوگئی کہ بس! اس چیز کی طرف سے بے پرواہی اختیار کرلیتا ہے۔ کھانا؛ اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے، جب بھوک کی وجہ سے ہم کھانے کے لیے بیٹھتے ہیں، اس وقت کھانے کی طرف ہماری طبیعت کی جو رغبت، میلان و کشش ہوتی ہے، وہ ظاہر ہے۔ لیکن جب پیٹ بھر جاتا ہے اور کھانے سے ہم اپنے ہاتھ کھینچتے ہیں، تو وہ کشش اور میلان جو شروع میں تھا اب باقی نہیں رہتا، اس کی وجہ سے کسی کو یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ کیا یہ کھانے کی طرف سے ایک طرح کا استغناء اور بے پرواہی ہے؟ اس دعا کے ذریعہ بندہ اللہ تعالیٰ کے سامنے یہ عرض کررہا ہے کہ: اے اللہ! میں جو ہاتھ کھینچ رہا ہوں وہ اس لیے نہیں کہ مجھے ضرورت نہیں ہے، بلکہ مجھے تو اس کی ضرورت ہے، مَیں تو ابھی تھوڑی دیر (چار پانچ گھنٹے) کے بعد دوبارہ اسی احتیاج و بے چینی اور رغبت و میلان کے ساتھ کھانے کی طرف دوبارہ ہاتھ بڑھانے والا ہوں، اس وقت بے پرواہی کی وجہ سے ہاتھ نہیں ہٹایا جارہا ہے، اور اس کھانے کے شکرانہ کا جو حق تھا، وہ بھی ہم پوری طرح ادا نہیں کرسکے۔

گناہوں کی معافی کی بشارت:

حدیث ۷۳۵:-

وعن معاذِ بن أنسٍ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رسولُ اللهِ (ﷺ): مَنْ أَكَلَ طَعَامًا، فقال: أَلْحَمْدُ للهِ الَّذِي أَطْعَمَنِي هٰذَا، وَرَزَقَنِيهِ مِنْ غَيْرِ حَوْلٍ مِنِّي وَلَا قُوَّةٍ؛ غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ. (رواہ أبو داود والترمذی)

ترجمہ:- حضرت معاذ بن انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: جو آدمی کھانا کھائے پھر یہ دعا پڑھے: تمام تعریف اس اللہ کے لیے ہے جس نے مجھے یہ کھانا کھلایا اور یہ کھانا مجھے میری کسی تدبیر اور طاقت کے بغیر روزی کے طور پر عطا فرمایا(یعنی مجھ میں یہ طاقت نہیں تھی کہ میں یہ کھانا حاصل کرتا)تو اس کے پچھلے سارے گناہ معاف ہوجائیں گے۔

افادات:- کھانے کے دو ادب بتانے کے لیے یہ باب قائم کیا تھا، ایک تو شروع میں بسم اللہ پڑھنا یعنی اللہ کا نام لینا، اور آخر الحمد للہ یعنی اللہ کی تعریف وشکر ادا کرنا۔ پہلی مجلس میں بتاچکا ہوں کہ کھانے کی جو چیز ہمارے سامنے آتی ہے وہ کتنی محنتوں کے بعد تیار ہوتی ہے، اگر ہم خود ان ساری محنتوں کو استعمال کرکے کھانا تیار کرنا چاہتے تو نہیں کرسکتے، یہ تو اللہ تعالیٰ کا نظام ہے جس کے نتیجہ میں یہ ساری چیزیں ہم تک پہنچتی ہیں۔ اور ہم نے جو کھانا کھایا ہے وہ اللہ تعالیٰ ہی کا دیا ہوا ہے، اس پر شکر تو ویسے بھی ادا کرنا چاہیے تھا، اس کی حمد وثناء ہمارے لیے ضروری ہے ہی، لیکن یہاں شکر ادا کرنے پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ انعام دیا جاتا ہے کہ پچھلے سارے گناہ معاف ہوجاتے ہیں۔ اور گناہوں سے مراد صغیرہ گناہ ہیں، اس لیے کہ کبیرہ تو بغیر توبہ کے معاف نہیں ہوتے۔ بہرحال! اس عمل پر گناہوں کی معافی کی بشارت بھی ہمیں سنائی جارہی ہے۔ غور کیجئے کہ کتنا آسان نسخہ ہے!

اللہ تعالیٰ ہمیں اس پر عمل کے اہتمام کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

باب لا یعیب الطعام واستحباب مدحه

کھانے میں عیب نہ نکالے اور اس کی خوبی بیان کرنے کا پسندیدہ ہونا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ کھانے کے آداب کا بیان چل رہا ہے،اسی سلسلہ میں آج ایک باب قائم کرتے ہیں : کھانے میں نہ کوئی عیب نکالے اورنہ کھانے کی برائی کرے۔اور دوسری بات یہ کہ اس کی تعریف کرنے کا پسندیدہ ہونا۔

کچھ بھی بے کار نہیں قدرت کے کارخانہ میں :

حدیث ۷۳۶:-

وعن أَبِي هُريرة رضی اللہ عنہ قَالَ : مَا عَابَ رسولُ الله (ﷺ) طَعَاماً قَطُّ ،إن اشْتَهَاهُ أَكَلَهُ ،وَإنْ كَرِهَهُ تَرَكَهُ.

(متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ (ﷺ) نے کبھی کسی کھانے میں عیب نہیں نکالا، نہ کبھی اس کی برائی کی۔اگر پسند ہوتا تو آپ اس کو تناول فرمالیتے اور کھالیتے ،اور اگر پسند نہ ہوتا تو اس کو چھوڑ دیتے۔

افادات:- کھانا :یہ اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا رزق ہے ،اس کی نعمت ہے، اس کا ایک عطیہ ہے،تو حق یہ ہے کہ آدمی اس نعمت اور عطیے کے اوپر کوئی عیب نہ لگائے ،اگر طبیعت کی رغبت ہے اوروہ چیز پسند ہے تو شوق سے کھائے،اور اگر پسند نہیں ہے تواس کی برائی نہ بیان کرے۔ بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ اگر کھانا پسند نہیں ہے تو بس اس کی برائی کا دفتر کھول

دیتے ہیں، ایسا کرنے والا درحقیقت اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے رزق، اس کی نعمت اور عطیہ کی ناقدری کرتا ہے، آپ کو اگر پسند نہیں ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ چیز بے کار ہے :-

نہیں ہے کوئی بھی چیز نکمی زمانہ میں
کچھ بھی بے کار نہیں قدرت کے کارخانہ میں

اللہ تعالیٰ نے دنیا میں جتنی بھی چیزیں پیدا کی ہیں ان کی پیدائش میں کوئی نہ کوئی حکمت اور مصلحت ضرور موجود ہے۔ ظاہری اعتبار سے وہ چیز چاہے کتنی ہی بری معلوم ہو، لیکن تکوینی اعتبار سے اس کا وجود اپنے اندر کسی نہ کسی فائدہ، حکمت اور مصلحت کو لیے ہوئے ہوتا ہے، سانپ اور بچھو جیسے موذی اور تکلیف دینے والے جانوروں کا وجود بھی مصلحت سے خالی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو اس کائنات میں جو پیدا کیا ہے، اس کا بھی کوئی مقصد اور مصلحت ہے جس کو اللہ تعالیٰ ہی بخوبی جانتے ہیں ، اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی چیزوں کی مصلحتوں کا انسان کہاں احصاء کر سکتا ہے اور تمام مصلحتوں کو کہاں جان سکتا ہے؟ کوئی چیز اگر آپ کے اور ہمارے علم میں نہیں ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کا کوئی فائدہ بھی نہیں۔

مکھی کی پیدائش کا ایک فائدہ:

ایک متکبر بادشاہ ایک مرتبہ اپنے محل میں تکبر کے ساتھ تخت پر بیٹھا ہوا تھا، ایک مکھی آکر اس کی ناک پر بیٹھ گئی، اس نے اڑایا، پھر آکر بیٹھ گئی ، پھر اڑایا، پھر آگئی۔ بعض مکھیاں

ضدی ہوتی ہے کہ جتنا بھی اڑاؤ، واپس آکر بیٹھ جاتی ہے (ویسے مکھی کو عربی زبان میں "ذُبَابٌ" کہتے ہیں۔ذَبَّ ،یَذُبُّ کا معنٰی کسی چیز کو بھگانا اور دور کرنا، اور "اٰبَ ، یَؤُبُ" کا معنٰی لوٹنا؛ تو "ذُبَّ" اور "آبَ" مل کر "ذُبَابٌ" بناہے، کُلَّمَا ذُبَّ آبَ یعنی اس کو بھگایا گیا تو وہ پھر لوٹ کر آئی، اسی سے عربی زبان میں اس کا نام "ذُبَابٌ" بناہے، اس کی خاصیت ہی یہ ہے کہ اس کو بھگاؤ تو وہ پھر آئے گی۔) تو اس بادشاہ نے اس کو دو تین مرتبہ بھگایا لیکن وہ پھر آکر بیٹھی تو وہ بادشاہ کہنے لگا: معلوم نہیں کہ اللہ میاں نے یہ مکھیاں کیوں پیدا کی ہیں؟ اس کے اندر کوئی منفعت تو ہے نہیں، صرف نقصان ہی نقصان نظر آتا ہے۔ایک اللہ والے وہاں بیٹھے ہوئے تھے، انہوں نے کہا: اس کا ایک فائدہ اس سے بڑا اور کیا ہو سکتا ہے کہ تیرے جیسے مغرور اور متکبر انسان کے غرور کو توڑ رہی ہے، اللہ تعالیٰ نے اس مکھی کے ذریعہ تجھے بتادیا کہ اللہ تعالیٰ کی یہ چھوٹی سی معمولی مخلوق اگر تجھے ستانا چاہے اور تو اپنے آپ کو اس سے بچانا چاہے تب بھی اس کو روک نہیں سکتا۔بار بار تو اسے بھگا رہا ہے اور وہ واپس آکر بیٹھ رہی ہے، تجھ میں تو اتنی بھی طاقت نہیں کہ اسے اپنے پاس سے ہٹا سکے اور دربار سے نکال سکے، تو اس نے تیرے غرور اور تکبر کو خاک میں ملادیا، اس سے بڑا فائدہ اور کیا ہو سکتا ہے!

بچھو کے ذریعہ جان بچائی:

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیرِ کبیر میں سورۂ فاتحہ کی تفسیر بہت تفصیل سے کئی صفحات کے اندر لکھی ہے، اس میں اللہ تعالیٰ کی شانِ ربوبیت کو بیان کرتے ہوئے ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ ایک بزرگ دریائے دجلہ کے کنارہ جارہے تھے، انہوں نے ایک بڑا سا بچھو دیکھا جو تیزی سے چلا جا رہا تھا۔ انہوں نے سوچا کہ اتنا بڑا بچھو یہاں کیسے آگیا، تو یہ بھی اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ کچھ دور کنارے کنارے چل کر جب آگے پہنچے تو دیکھا کہ دریا میں سے ایک کچھوا باہر آیا، یہ بچھو اس کے اوپر سوار ہو گیا اور وہ کچھوا دریا پار کرنے لگا۔ ان بزرگ نے دیکھا تو انہوں نے بھی سامنے والے کنارے پر جانے کے لیے ایک کشتی کرایہ پر لی، اس میں بیٹھے اور سامنے والے کنارہ پر پہنچے، تو وہ کچھوا بھی اس بچھو کو لے کر سامنے والے کنارہ پر پہنچ چکا تھا، وہاں وہ بچھو اُترا اور آگے بڑھنے لگا۔ یہ بزرگ بھی اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگے، ایک جگہ جاکر دیکھا کہ ایک نوجوان شراب پی کر بے ہوش پڑا ہے اور اس کے پاس شراب کا گلاس پڑا ہوا ہے، اور ایک بڑا اژدہا اپنا پھن پھیلائے ہوئے اس کو کاٹنے کے لیے تیار ہے۔ اتنے میں یہ بچھو وہاں پہنچا اور ایک دم کود کر اس اژدہے کے پھن میں ایک ڈنک مارا جس کی وجہ سے وہ اژدہا گرا اور مر گیا۔ پھر وہ بچھو وہاں سے واپس روانہ ہو گیا، دریا کے کنارے پر پہنچا، اسی کچھوے پر سوار ہوا اور وہ اس کو لے کر روانہ ہوا۔ یہ سارا قصہ ان بزرگ نے دیکھا تو سوچنے لگے کہ اللہ تبارک و

تعالیٰ کی شان دیکھو کہ بظاہر تو یہ جانور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آدمی کی جان لیتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ اسی کے ذریعہ انسانوں کی جان کی حفاظت کا بھی کام لیتے ہیں۔جب وہ نوجوان ہوش میں آیا تو ان بزرگ نے اس کو بتایا کہ تو تو شراب کے نشے میں مدہوش تھا، اور تیری حفاظت کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایسا ایسا انتظام کیا۔یہ سن کر اس کو احساس ہوا ، اور اللہ تعالیٰ نے اسے توبہ کی توفیق دی۔

کہنے کا حاصل یہ ہے کہ کوئی بھی چیز دنیا میں بے کار نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے جتنی بھی چیزیں دنیا میں بنائی ہیں وہ کسی نہ کسی مقصد اور منفعت کے لیے ہیں ، اس میں کوئی نہ کوئی حکمت ضرور پوشیدہ ہے۔

پاخانہ کے کیڑے سے علاج !:

ایک کتاب ''قلیوبی'' نامی ہمارے بچپن میں پڑھی تھی جس میں عجیب و غریب قصے لکھے ہوئے ہیں ،ایک قصہ یاد آتا ہے۔پاخانہ کا ایک کیڑا ہوتا ہے جو پیٹ کے اندر پیدا ہوتا ہے، جسے ہم لوگ کِرَم کہتے ہیں ،پاخانہ کے ساتھ نکلتا ہے اور اسی میں چلا جاتا ہے۔ایک مرتبہ اس کو دیکھ کر ایک صاحب سوچنے لگے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو کیوں پیدا کیا ہے،بے کار معلوم ہوتا ہے، اس کا کوئی مقصد تو سمجھ میں نہیں آتا،ان کی زبان سے یہ جملہ نکلا۔ایک مدت کے بعد اس کی آنکھ میں ایک بیماری ہو گئی، مختلف ڈاکٹروں اور حکیموں سے بہت علاج کرایا،بڑی رقمیں خرچ

کیں، لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ ایک بہت پرانہ تجربہ کار طبیب تھا، کسی نے کہا کہ اس کا تجربہ بہت زیادہ ہے اس کے پاس جاؤ، وہ صاحب اس کے پاس گئے، اس نے سارے حالات پوچھے، پھر کہا: پاخانہ کا جو کیڑا ہوتا ہے اس کو پیس کر آنکھ میں لگاؤ، کبھی کبھی یہ بیماری اس سے ٹھیک ہو جاتی ہے۔ وہ آدمی سمجھ گیا کہ میری زبان سے جو جملہ نکلا تھا تو اللہ تعالیٰ نے میری عبرت اور سزا کے لیے مجھے اس بیماری میں مبتلا کیا ہے۔ اس لیے ہمیشہ کچھ بھی بولنے میں آدمی کو بہت ہی احتیاط کرنی چاہیے۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: "اَلْبَلَآءُ مُؤَكَّلٌ بِالْمَنْطِقِ" مصیبت بولنے کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔ بہت سی مصیبتوں کو ہم بول کر دعوت دیتے ہیں، کوئی بڑا بول آدمی بول دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ کو وہ پسند نہیں آتا، پھر اللہ تعالیٰ اس کے اسی بول پر اس کو آزمائش میں ڈال دیتے ہیں۔

یہ کس مرض کی دوا ہے؟:

سید غوث علی پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ ایک بزرگ تھے ان کے حالات میں "تذکرۂ غوثیہ" نامی ایک کتاب ہے، اس میں ان کے ملفوظات کے اندر ایک لطیفہ لکھا ہے کہ: ایک چھپکلی ایک دیوار پر لٹکی ہوئی تھی، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دیکھا تو باری تعالیٰ سے عرض کیا: یا اللہ! اس کو کیوں پیدا کیا؟ یہ کس مرض کی دوا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے موسیٰ! یہ چھپکلی بھی کب سے

مجھ سے یہی پوچھ رہی ہے کہ: اے اللہ! موسیٰ کو آپ نے کیوں پیدا کیا؟ یہ کس مرض کی دوا ہے؟ اگرچہ یہ تو ایک لطیفہ ہے، لیکن سوچنے کی دعوت دیتا ہے۔ جیسے: ہم بچوں کے متعلق رائے قائم کرتے ہیں، تو وہ بچے بھی ہمارے متعلق بہت کچھ تبصرے کرتے ہیں جن کو کبھی کبھی سننے کی ضرورت ہے، اس سے آدمی کو پتہ چل جاتا ہے

کھانے کی نعمت، اور ہمارا طرزِ عمل:

خیر! مَیں نے عرض کیا تھا کہ کھانا اللہ تعالیٰ کی نعمت اور عطیہ ہے، اس کا دیا ہوا رزق ہے، اوراس میں بڑی مصلحتیں ہیں ، اللہ تعالیٰ نے جب اس کو پیدا کیا اس وقت اپنی توجہ اس کی طرف منعطف فرمائی، اس سے اس کی قدرو قیمت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، ہمیں اگر وہ چیز پسند نہیں ہے اور اچھی نہیں لگتی ہے، تو نہ کھائیں ، کوئی زبردستی تو نہیں ہے، لیکن اس کی برائی بیان کرنے میں اپنی زبان کو اور وقت کو لگانے کی آپ کو کس نے اجازت دی؟ شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی ہے۔ نبی کریم (ﷺ) کا معمول بتایا کہ آپ کو اگر وہ چیز پسند آتی تو کھالیتے اور اگر پسند نہ آتی تو چھوڑ دیتے۔ اسلام نے یہی تعلیم دی ہے کہ کھانے پینے کی چیزیں اللہ تعالیٰ کا رزق ہیں، اس کی قدر اور تعظیم کرنی چاہیے، ادب کرنا چاہیے۔

آج کل تو کھانے کی ایسی بے عزتی ہوتی ہے کہ اللہ کی پناہ ! جو کھانا بچتا ہے اس کو لوگ کوڑے دان میں ڈال دیتے ہیں ، خاص کر ہوٹلوں میں اور دعوتوں میں تو بڑی بے دردی اور بے

رحمی کے ساتھ کھانے کو ضائع و برباد کیا جاتا ہے، حالاں کہ شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی۔ ایک ایک دانہ اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے اور بہت ہی قیمتی ہے۔

نعمت کی قدردانی کا عجیب واقعہ:

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک واقعہ بیان کرتے تھے۔ ہمارے بزرگوں میں حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ گزرے ہیں جو میاں صاحب کے نام سے مشہور تھے،راندیر ہی میں ان کا مزار ہے۔ ہمارے مدارس میں سنن ابوداؤد پڑھائی جاتی ہے ،عام طور پر اس کی سند میں میاں صاحب آتے ہیں۔ مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ :مَیں ایک مرتبہ ان کے یہاں گیا، کھانے کا وقت ہوا تو انہوں کہا کہ آپ بھی کھانے میں شریک ہوجایئے ، ہم کھانے کے لیے بیٹھے، جب ہم کھانے سے فارغ ہوچکے تو مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ مَیں دسترخوان لپیٹنے لگا تاکہ اندر جو کچھ ہے اس کو باہر پھینک آؤں۔ حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: کیا کررہے ہو؟ میں نے کہا: حضرت !دسترخوان صاف کرنے کے لیے لپیٹ رہا ہوں۔ تومیاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے کہا : دسترخوان صاف کرنا آتا ہے؟ مَیں نے کہا: حضرت!یہ بھی کوئی علم اورفن ہے جو سیکھنے کی ضرورت ہو؟ فرمایا:ہاں!اسے بھی سیکھنے کی ضرورت ہے۔ پھر کہا: لاؤ!مجھے دو۔ انہوں نے میرے پاس سے لے لیا،اس کو پھر سے کھولا،اور ہم لوگ کھاتے وقت ہڈیاں چوس کراس پر ڈالتے ہیں،اسی طرح کچا گوشت نکال کر ڈال دیتے

ہیں، تو میاں صاحبؒ نے اس طرح کا گوشت الگ کیا، ہڈیاں الگ کیں ، روٹی کے بڑے بڑے ٹکڑوں کو الگ کیا، چھوٹے چھوٹے ذرّات کو الگ کیا۔ اس طرح کل چار حصے بنائے، پھر فرمانے لگے: دیکھو! یہ جو کچا گوشت ہے اس کو مَیں فلاں جگہ پر رکھوں گا، وہاں بلی آتی ہے اور اس کو معلوم ہے کہ میری غذا وہاں رکھی ہوئی ہوتی ہے ،وہ آکر اس کو کھالے گی۔ اور یہ جو ہڈیاں ہیں، اس کو فلاں جگہ رکھوں گا، وہاں کتے آتے ہیں اور ان کو معلوم ہے کہ یہاں ہماری غذا رکھی جاتی ہے، وہ آکر کھالیں گے۔ اور روٹی کے یہ بڑے ٹکڑوں کو اوپر کی دیوار پر رکھ دوں گا، کوے اور چیلیں آکر لے لیں گے۔ اور یہ چھوٹے چھوٹے ذرات کو گھر میں جہاں چونٹیوں کے بِل ہیں ان کے پاس رکھ دوں گا تو وہ کھالیں گی؛ اس لیے کہ یہ سب اللہ تعالیٰ کا رزق ہے، اس کی نعمت ہے، ہم اس کو نہیں کھاتے لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنی دوسری مخلوق کے لیے رزق بنایا ہے، تو ہم اس کو کیوں ضائع کریں!

جنوں کی خوراک کا نظام:

اسی لیے آپ کو معلوم ہو گا کہ استنجاء کے آداب جہاں بیان کیے جاتے ہیں وہاں حدیث ِپاک میں آتا ہے کہ نبی ٔکریم ﷺ نے ہڈی سے استنجاء کرنے سے منع کیا۔ کیوں؟ حدیث میں اس کی وجہ بھی بتلائی ہے کہ ذبح کیے ہوئے جانوروں کی ہڈیاں جو ہم کھانے کے بعد چوس کر صاف کرکے ڈال دیتے ہیں وہ جنوں کی خوراک ہے۔ اگر کوئی جِن اللہ کا نام لے کر

اس کو اُٹھاتا ہے تو اس پر ایسا ہی گوشت چڑھا دیا جاتا ہے جیسے اس پر اصل میں تھا۔ جنوں کی خوراک کے لیے اللہ تعالیٰ کا یہ ایک نظام ہے، اسی لیے آپ (ﷺ) نے ہڈیوں سے استنجاء کرنے سے منع فرمایا کہ جو آدمی اس سے استنجاء کرے گا تو گویا کہ اس کو بے کار اور ضائع کر رہا ہے، جو چیز جنوں کی خوراک کے کام آسکتی تھی، اب ان کے کام میں نہیں آئے گی۔ اسی طرح کوئلے سے استنجاء کرنے سے بھی منع کیا ہے، کیوں کہ کوئلہ جنوں کے جانوروں کی خوارک ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ شریعت نے بڑی تاکید فرمائی ہے کہ کوئی نعمت ضائع نہ ہونے پائے، اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی بڑی قدر ہونی چاہیے۔

ایک گھونٹ پانی کی قدر:

حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں دیکھا کہ کوئی آدمی پانی پیتا اور بچا ہوا پھینک دیتا تو حضرت بہت سخت ناراض ہوتے کہ بھائی! پانی کیوں پھینک دیا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ یہ پانی ہمیں اتنی آسانی سے وافر مقدار میں بغیر زحمت کے مل جاتا ہے اس لیے ہمیں اس کی قدر نہیں ہے۔ میں نے پہلے بتایا تھا کہ چند سال پہلے جب کنڈلا ({ ૫H ૨૩૩૪ }) میں سمندری طوفان آیا تھا تو وہاں رفاہی کام کے لیے ہمارے یہاں سے یوسف علی بھائی گئے تھے، انہوں نے بتلایا کہ جب ہم پہلی مرتبہ وہاں پہنچے تو ہمارے پاس پینے کے پانی کی بوتلیں تھیں جسے دیکھ کر بیسیوں آدمی جمع ہوگئے اور کہنے

لگے کہ: اس میں سے ایک ایک گھونٹ ہمیں دو۔ جن کو پانی میسر نہیں ہوتا ان سے پوچھو کہ اس ایک گھونٹ کی کتنی قدر ہے!

عبرت انگیز واقعہ:

اور اس ایک گھونٹ پر بلکہ ایک قطرہ پر اللہ تعالیٰ کے یہاں کیسا کیسا معاملہ کیا جاتا ہے! ایک عجیب وغریب قصہ یاد آگیا تو سنا دیتا ہوں۔ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات میں یہ قصہ لکھا ہوا ہے کہ ایک آدمی کا انتقال ہو گیا، کسی نے اس کو خواب میں دیکھا کہ عذاب میں مبتلا ہے، اس نے پوچھا: تیرے ساتھ یہ معاملہ کیوں؟ اس نے کہا: میرے گناہوں کی وجہ سے عذاب میں مبتلا ہوں۔ اس نے پوچھا: تیرے پیچھے کوئی دعائے مغفرت اور ایصالِ ثواب کرنے والا نہیں؟ اس نے کہا: میری ایک لڑکی ہے، تم اس کو جا کر کہو کہ وہ میرے لیے کچھ ایصالِ ثواب اور دعائے مغفرت کا اہتمام کرے اور یہاں بھیجے۔ وہ صبح اُٹھا اور معلوم کیا کہ فلاں کا مکان کہاں ہے، وہاں پہنچا تو دیکھا کہ مکان پر تالا پڑا ہوا ہے۔ لوگوں سے پوچھا: اس کی ایک لڑکی تھی وہ کہاں ہے؟ لوگوں نے بتلایا: وہ تو بڑی بد اخلاق نکلی، کوٹھے پر بیٹھ گئی اور بدکاری میں مبتلا ہو گئی، اس وقت کسی کے ساتھ چلی گئی ہے۔ پوچھا: مجھے اس سے ایک کام ہے، کہاں ملے گی؟ کسی نے بتلایا کہ: وہ اپنے کسی آشنا اور دوست کے ساتھ دریائے جمنا پر نہانے کے واسطے گئی ہے۔ یہ آدمی وہاں پہنچا تو دیکھا کہ وہ اپنے دوست کے ساتھ پانی سے کھیل رہی ہے۔ اب یہ سوچنے لگا کہ

میں اس کو بتلاؤں بھی یا نہیں، لیکن پھر سوچا کہ ایک مرے ہوئے آدمی نے اپنی بیٹی کے نام ایک پیغام دیا ہے؛ تو مَیں پہنچا ہی دوں۔ چناں چہ اس نے وہیں کنارے پر کھڑے کھڑے اس کو مخاطب کرکے کہا کہ: مَیں نے خواب میں تیرے باپ کو دیکھا کہ وہ عذاب میں مبتلا ہے اور اس نے میرے ذریعہ تجھ تک یہ پیغام کہلوایا ہے کہ تو اس کے لیے کچھ ایصالِ ثواب اور دعائے مغفرت کا اہتمام کر۔ اب وہ تو اپنی مستی میں تھی، اور چلّو میں پانی لے کر اپنے آشنا کے اوپر ڈال رہی تھی، اس میں سے ایک چلّو اس کے اوپر ڈال کر کہنے لگی: لو! یہ میرے ابّا کے ایصالِ ثواب کے لیے ہے۔ یہ بیچارہ تو بہت شرمندہ ہوا اور واپس چلا آیا کہ اب اس کو کیا کہا جائے۔ دوسری رات کو خواب میں دیکھا تو اس کا باپ اچھی حالت میں تھا۔ اس نے کہا: مَیں تو تیرے پیغام کو پہنچانے کے لیے تیری بیٹی کے پاس گیا تھا، لیکن اس کا ایسا ایسا معاملہ ہے اور اس نے تو مجھے اس طرح سے جواب دیا اور میرے ساتھ بھی ایسا سلوک کیا۔ اس پر اس نے کہا: اس کا عمل اس کے ساتھ؛ لیکن وہ چلّو بھر کر اس نے جو پانی تیرے اوپر یہ کہہ کر ڈالا تھا کہ یہ ابّا کے ایصالِ ثواب کے لیے ہے، اس پانی کا ایک قطرہ ایک جانور کے منھ میں گرا جو ندی کے کنارہ پر دو روز سے پیاسا پڑا ہوا تھا، اور اندر جا کر پانی پی سکنے کی طاقت نہیں رکھتا تھا، اُس ایک قطرے سے اس جانور کی پیاس بجھ گئی، اس کا ثواب مجھے ملا اور اسی پر اللہ تعالیٰ نے میری مغفرت کر دی۔

اس سے آپ اندازہ لگائیے کہ پانی کا ایک قطرہ کتنا قیمتی ہے کہ ایک آدمی کو عذاب سے بچا سکتا ہے؛ تو پھر ایک گھونٹ کتنا قیمتی ہوگا! لیکن ہم اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں کو یونہی ضائع کر دیتے

ہیں۔پرانے زمانہ میں ہمارے دیہاتوں میں دیکھاکہ کھانااگر بچتاتھاتووہ لوگ اس کوپھینکنے کی اجازت نہیں دیتے تھے کہ مختلف قسم کے غریب غرباء، بھنگی چمار،مزدورقسم کےلوگ ہر آبادی کے اندررہتے ہی ہیں ؛ان کو دے دیاجائے۔آج کل اس کی بالکل پرواہ نہیں کی جاتی،اور بچاہوا کھانا ایسے ہی پھینک دیتےہیں۔لہٰذا اس بات کا ضروراہتمام ہوکہ کھانااللہ تعالیٰ کی قیمتی نعمت ہے جو ضائع نہیں ہونی چاہیے۔

اکابر کی کڑھن:

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کےپاس بیماری کے زمانہ میں ایک آدمی دودھ لایا،حضرت نےنوش فرماکرایک دوگھونٹ بچ گئےتھے اس کووہیں رکھ دیا اورحضرت کی آنکھ لگ گئی، جب آنکھ کھلی تودیکھاکہ وہ دودھ وہاں نہیں ہے۔ایک صاحب کھڑے تھے ان سےپوچھاکہ یہاں دودھ رکھاتھا؛کہاں گیا؟انہوں نے کہا: مَیں نےپھینک دیا۔اس پر حضرت بہت ناراض ہوئے کہ اللہ کے بندے!وہ اللہ تعالیٰ کی نعمت تھی،تونے اس کو پھینک کیوں دیا؟ توہی پی جاتا،ورنہ کسی جانورکوپلادیتاتب بھی کارآمد توہوتا۔ایسے ہی پھینکنا کیا معنیٰ رکھتاہے!

ہمارے بزرگوں کے یہاں اس بات کابڑااہتمام رہتاتھاکہ کوئی چیزبھی ضائع ہونےنہ پائے،اگرایک ذرّہ بھی ضائع ہوجاتاتواس پربہت کڑھتے۔کبھی کسی پھل کا مزہ تھوڑا سابدل جاتاہے ،یا ایک طرف سے تھوڑا سا زیادہ پک جانےکی وجہ سے بہت سی طبیعتیں اس کو کھانا پسند

نہیں کرتیں ،توحضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں دیکھا کہ اگر کوئی پھل اس طرح کا ہو جاتا تھا تو حضرت ایک مخصوص انداز سے فرماتے تھے کہ :کون اس کو وصول کرے گا؟ یہ سن کر جن کی طبیعتیں اس کو پسند نہیں کرتی تھیں وہ بھی مانگ لیا کرتے تھے،اور جب کوئی اس کو کھالیتا تو حضرت کو اس پر بڑی خوشی ہوتی تھی کہ یہ چیز ضائع ہونے سے بچ گئی۔

اورواقعہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے،اس لیے ضائع نہیں ہونی چاہیے،اگراس کی ناقدری ہو جاتی ہے تو بہت سی مرتبہ آدمی اللہ تعالیٰ کی دوسری بہت ساری نعمتوں سے محروم ہو جاتا ہے،اللہ تعالیٰ اس سے ہماری حفاظت فرمائے۔

پسندوناپسند کے معاملہ میں معتدل تعلیم:

یہاں حضورِاکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا کھانے کے معاملہ کا ایک ادب بتلایا :"مَاعَابَ رسولُ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم) طَعَامًاقَطُّ" حضورِاکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کبھی کسی کھانے پر عیب نہیں لگایا"إن اشْتَهَاهُ أَكَلَهُ، وَإِنْ كَرِهَهُ تَرَكَهُ"اگر طبیعت میں رغبت ہوتی تو آپ تناول فرمالیتے ،اور اگر رغبت نہیں ہوتی تو نہیں کھاتے تھے۔اس سے ایک بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ یہ ضروری نہیں کہ ہر چیز ہماری طبیعت کو پسند ہی ہو،بعض کھانے ایسے بھی ہوتے تھے جو حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طبیعت کو بھی پسند نہیں تھے لیکن حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کبھی اس کی برائی نہیں فرماتے تھے،اس پر عیب نہیں لگاتے تھے۔

طبیعت کا کسی چیز کی طرف میلان اور اس کو پسند کرنا، نہ کرنا؛ ایک غیر اختیاری چیز ہے، یہ طبیعت کا ایک تقاضہ ہوتا ہے، کبھی طبیعت کسی چیز کو پسند کرتی ہے اور کبھی کسی چیز کو ناپسند کرتی ہے۔ تو اگر آپ کی طبیعت کو یہ کھانا ناپسند ہے تو یہ کوئی گناہ کی بات نہیں ہے، اور یہ کوئی ضروری بھی نہیں کہ ہر چیز کو آپ پسند ہی کیجئے، لیکن یہ ہے کہ اگر آپ کی طبیعت کو پسند نہیں ہے تو آپ اس کی برائی نہ کریں، اس پر عیب نہ لگائیں، اس کی خوردہ گیری نہ کریں۔ اگر عیب لگائیں گے تو یہ اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کی ناقدری ہوگی، اس سے اپنے آپ کو بچانے کی ضرورت ہے۔

سرکہ بہت اچھا سالن ہے:

حدیث ۷۳۷:-

وعن جابر رضی اللہ عنہ أَنَّ النَّبِيَّ (صلی اللہ علیہ وسلم) سَأَلَ أَهْلَهُ الأُدُمَ، فقالوا: مَا عِنْدَنَا إِلاَّ خَلٌّ، فَدَعَا بِهِ، فَجَعَلَ يَأْكُلُ، ويقول: نِعْمَ الأُدُمُ الخَلُّ، نِعْمَ الأُدُمُ الخَلُّ. (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایک مرتبہ اپنے گھر والوں سے سالن مانگا (کہ روٹی کے ساتھ کھانے کے لیے کوئی سالن ہے؟) گھر والوں نے کہا: ہمارے پاس تو صرف سرکہ ہے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کہا: لاؤ۔ پھر نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) سرکہ میں روٹی ڈوبا ڈوبا کر کھانے لگے اور فرمانے لگے: سرکہ بہت اچھا سالن ہے، سرکہ بہت اچھا سالن ہے۔

سال بھر کا اناج بھر لینا توکل کے خلاف نہیں :

افادات:–حالاں کہ حدیثِ پاک میں موجود ہے کہ حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا معمول یہ تھا کہ تمام ازواجِ مطہرات کے لیے سال بھر کا غلہ بھر دیا کرتے تھے۔اس سے علماء نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ جو لوگ سال بھر کا اناج خرید کر رکھ لیتے ہیں ؛یہ توکل اور تقویٰ کے خلاف نہیں ہے،خود نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) ازواجِ مطہرات کو سال بھر کا دے دیا کرتے تھے،لیکن ازواج بھی تو آپ ہی کی تھیں جو کثرت سے صدقہ وخیرات کرنے والی تھیں،اس لیے ان کو سال بھر کا جو دیا جاتا تھا وہ اپنی خوشی سے اللہ کے راستہ میں خرچ کر دیتی تھیں۔اسی لیے حدیث ِ پاک میں آتا ہے،حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ تین تین چاند ہم ایسے دیکھتے تھے کہ حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے گھر میں آگ نہیں جلتی تھی، چولہا نہیں جلتا تھا۔پوچھا گیا: پھر کیا کرتے تھے؟ فرمایا: کھجور کھا کر اس پر پانی پی لیتے تھے: یہی ہماری غذا ہوا کرتی تھی۔

کھانے کی اور بنانے والے کی تعریف :

خیر! یہ روایت لا کر باب کا جو عنوان قائم کیا تھا اس کے دوسرے جزو "إِسْتِحْبَابُ مَدْحِهِ" کو ثابت کرنا چاہتے ہیں۔دیکھو! آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) سرکہ کی تعریف فرما رہے ہیں،حالاں کہ ہم لوگ تو سرکہ کو کبھی سالن کے طور پر استعمال بھی نہیں کرتے،کبھی زبان کے چٹانے کے لیے کچھڑا،

حلیم وغیرہ میں ڈال لیتے ہیں، ورنہ اگر سالن کی جگہ پیش کر دیا جائے کہ آج تو سالن میں سرکہ ہی ہے، روٹی اور سرکہ کھالو؛ تو کون ہے جو اس پیشکش کو بہ رضا و رغبت قبول کرلے؟ طبیعت پر بڑا گراں گزرے گا کہ اچھا! سالن کی جگہ پر سرکہ کھائیں ؟ اس کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے، لیکن نبیٔ کریم (ﷺ) سرکہ کھا رہے ہیں اور تعریف فرما رہے ہیں کہ: بڑا اچھا سالن ہے، بڑا اچھا سالن ہے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کھانے کی تعریف کرنی چاہیے، اس لیے کہ یہ بھی نعمت کا شکر ادا کرنے کا ایک طریقہ ہے، جیسے: کوئی آدمی کوئی چیز لاکر پیش کرے، اور آپ کہیں کہ ماشاء اللہ! بڑی عمدہ چیز ہے، آپ نے تو بڑے موقع سے یہ چیز پیش کی۔ بس! آپ کے ان دو جملوں سے اس کا جی خوش ہو جائے گا، اور اللہ تعالیٰ کی نعمت کے شکر کا حق ادا ہو جائے گا۔

پھر یہ ہے کہ اگر وہ سالن ہے تو جس نے وہ سالن بنایا ہے اس کی محنت کا بھی تو حق ہے کہ اس کا شکریہ ادا کیا جائے۔ اس نے اس سالن کو بنانے کے واسطے دھواں برداشت کیا، آگ کی گرمی برداشت کی، اپنا وقت لگایا، تکلیف و زحمت اٹھائی، اور آپ اتنے بخیل بن رہے ہیں کہ آپ کی زبان سے اس کی تعریف کے دو بول بھی نہیں نکل رہے ہیں ؟ یہ کیسی بات ہوئی! ایسا نہیں ہونا چاہیے ، بلکہ اس کا حق ہے کہ آپ کہیں کہ ماشاء اللہ ! بہت اچھا کھانا بنایا ہے۔

حضرت ڈاکٹر عارفی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ:

حضرت حکیم الامت نوراللہ مرقدہٗ کے خلیفہ حضرت ڈاکٹر عبدالحئی عارفی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق مولانا مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم نے لکھاہے کہ حضرت ایک قصہ بیان کیا کرتے تھے: ایک مرتبہ ایک آدمی نے ان کی دعوت کی، وہ حضرت سے بیعت تھے، اور ان کی گھروالی بھی حضرت سے بیعت تھی، حضرت وہاں کھانے کے لئے تشریف لے گئے۔ اور حضرت کی عادت تھی کہ کھانے کے بعد گھروالوں کا شکریہ اداکیاکرتے تھے کہ آپ نے کھاناپکایا، ماشاء اللہ بڑا لذیذ اوراچھاوعمدہ پکاتھا۔ اللہ والے دوسروں کاجی خوش کرنے کااہتمام کرتے ہیں۔

معترض کاحال مکھی جیسا:

اس پر بھی بعض لوگوں کواعتراض ہوتاہے۔ اگر کسی نے ایسا کہہ دیاتو بعض لوگ اس کوغلط جامہ پہناتے ہیں، حالاں کہ وہ لوگ یہ نہیں سمجھتے کہ ان کے یہ دوجملے بولنے میں کیاحکمت ہے، اللہ والے دراصل گھروالوں کی دلجوئی کرناچاہتے ہیں، اور یہ نبی کریم ﷺ کی سنت ہے۔ لیکن جن کا مزاج ہی ٹیڑھا ہواور جس کی طبیعت ہی میں کجی ہو، ان کاحال مکھی جیسا ہوتا ہے: مکھی جب کسی باغ میں جائے گی توپورے باغ میں پھل اورپھول ہیں، لیکن کسی کونہ میں پاخانہ پڑاہوگا تووہ سب چھوڑ کروہیں جائے گی اور اسی پر بیٹھے گی، پورے باغ میں پھل ہوتے ہیں وہ

اس کو نظر ہی نہیں آتے، پاخانہ ہی نظر آتا ہے۔ تو جن لوگوں کا مزاج تنقیدی اور عیب جوئی والا ہوتا ہے، وہ اسی طرح کی باتیں کیا کرتے ہیں۔

خیر! حضرت ڈاکٹر عارفی رحمۃ اللہ علیہ جب کھانے سے فارغ ہو کر جانے لگے تو چوں کہ گھر والی بھی بیعت تھی اس لئے پردہ کے پیچھے سے اس نے بھی سلام کیا، حضرت نے سلام کا جواب دینے کے بعد شکریہ کے کلمات کہے کہ: آپ نے کھانا ماشاء اللہ بڑا عمدہ پکایا تھا، ہمیں بہت پسند آیا۔ ایسا کہنا بھی چاہیے تاکہ اللہ تعالیٰ کی نعمت کا شکر ادا ہو، اور ان کا حوصلہ بڑھے، دلجوئی بھی ہو جائے۔ حضرت ڈاکٹر صاحب کے اس کہنے پر پردے کے پیچھے سے رونے کی اور سسکیوں کی آواز آنے لگی۔ حضرت ڈاکٹر صاحب بھی سہم گئے کہ پتہ نہیں، کیا بات ہوئی! کیا میری طرف سے کوئی ایسی چیز پیش آئی کہ وہ خاتون رونے لگ گئی۔ حضرت نے پوچھا: کیا میری طرف سے کوئی تکلیف پیش آئی؛ تو میں معافی چاہتا ہوں۔ تو اس خاتون نے رونے کو ضبط کرتے ہوئے کہا: نہیں حضرت! ایسا کچھ بھی نہیں ہے، بلکہ یہ جو آپ کے ساتھ میرے شوہر کھڑے ہیں نا، چالیس سال سے کھانا پکا کر ان کو کھلا رہی ہوں، آج تک ایک دن بھی انہوں نے ایسا کوئی جملہ نہیں کہا ہے کہ تم نے کھانا بہت اچھا پکایا، آج آپ کی دعوت تو ہم نے پہلی مرتبہ کی اور آپ یہ کہہ رہے ہیں؛ اس لئے میرا جی بھر آیا۔

اس کا احسان اور ہمارا بخل!:

آپ اور ہم اس مجلس میں جتنے بھی بیٹھے ہوئے وہ اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھ لیں کہ یہ واقعہ ہے یا نہیں ؟ ہم کبھی ایسا کرتے ہیں ؟حالاں کہ وہ بیچاری ہماری جو خدمتیں کرتی ہے، اس کا مسئلہ بھی مَیں آپ کو بتادوں (یہاں سے آواز گھروں تک بھی جارہی ہے ،خواتین بھی سن رہی ہیں)مسئلہ کے اعتبار سے بیوی کے لیے ضروری نہیں ہے کہ آپ کے لیے کھانا پکائے، بلکہ وہ آپ سے یہ مطالبہ کرسکتی ہیں کہ ہمیں پکا پکایا کھلاؤ،لیکن جب وہ پکاکر ہمیں دے رہی ہے تو وہ ہم پر بڑا احسان کررہی ہے۔جب وہ اتنا بڑا احسان کررہی ہے تو ہم اتنے کیوں بخیل بن رہے ہیں کہ ہماری زبان سے اس کی تعریف کا ایک جملہ بھی نہیں نکلتا؟ہم صرف اتنا ہی کہہ دیں کہ آج کھانا بہت اچھا اور عمدہ پکایا ہے۔

بیوی کے مزاج سے واقفیت رکھنا سنت طریقہ ہے:

واقعہ یہ ہے کہ جس کے دل پر گزرتی ہے وہی اس چیز کو محسوس کرسکتا ہے۔ایک عورت جو آپ کے ساتھ پوری زندگی گزاررہی ہے؛اس کے مزاج سے واقفیت رکھو۔ویسے شوہر کے لیے ضروری ہے کہ اپنی بیوی کی دلجوئی کرتا رہے اوراس کے مزاج کے مطابق اس کے ساتھ معاملہ کرتا رہے۔پہلے بھی ایک حدیث گزری ہے اس کو تازہ کرادیتا ہوں۔نبیؐ کریم (ﷺ) نے

ایک مرتبہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا: اے عائشہ! جب تم مجھ سے خوش ہوتی ہو تو وہ بھی مَیں جان لیتا ہوں ،اور جب تم مجھ سے ناراض ہوتی ہو تو وہ بھی مَیں جان لیتا ہوں۔حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ یہ کیسے جان لیتے ہیں ؟آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا:جب تم مجھ سے خوش ہوتی ہو اور دورانِ گفتگو کسی بات پر قسم کھانے کی نوبت آتی ہے تو تم یوں کہا کرتی ہو:"لَا! وَرَبِّ مُحَمَّدٍ" محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے رب کی قسم۔اور جب تم مجھ سے ناراض ہوتی ہو، اور دورانِ گفتگو کسی بات پر قسم کھانے کی ضرورت پیش آتی ہے تو تم یوں کہا کرتی ہو:"لَا!وَرَبِّ اِبْرَاهِيْمَ"اس وقت میرا نام نہیں لیتی۔حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا:اے اللہ کے رسول! صرف آپ کا نام ہی زبان سے نہیں لیتی،ورنہ میرے دل میں تو آپ کی محبت بھری ہوئی ہے

عرض یہ کرنا ہے کہ دیکھئے!نبی ٔکریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان کے مزاج کا کیسا مطالعہ کیا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا مزاج کب کیسا ہوتا ہے؛وہ بھی آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو پتہ چلتا تھا۔

ہم اگر واقف نہیں تو بیوی کے مزاج سے!:

ہماری تو ساری زندگیاں بیوی کے ساتھ گزر جاتی ہیں لیکن ہمیں پتہ ہی نہیں چلتا کہ بیوی کا مزاج کیا ہے! کبھی ہم نے اس کی طرف دھیان ہی نہیں دیا! کبھی اس کا مطالعہ کرنے کی توفیق ہی نہیں ہوئی! آپ فیکٹری اور دکان کے ایک ایک نوکر کے مزاج سے واقف ہیں ، اپنی آفس

کے ہر ہر ملازم کے مزاج سے واقف ہیں کہ کس سے کب کس طرح کام لینا ہے، اگر واقف نہیں تو بیوی ہی کے مزاج سے واقف نہیں۔ یہ بات تو ٹھیک نہیں ہے۔

کہنے کا حاصل یہ ہے کہ وہ بیچاری اتنی خدمتیں کرتی ہے کہ آپ کے کپڑے دھوتی ہے، کھانا پکا کر دیتی ہے، بستر تیار کرتی ہے، لہٰذا اگر نیند نہ آئی ہو تب بھی کہہ دو کہ ماشاءاللہ! کیسا عمدہ بستر تیار کیا تھا کہ لیٹتے ہی آنکھ لگ جانے والی تھی، اس سے اس کا جی خوش ہو جائے گا۔ اور ایک مسئلہ آپ کو بتا دیتا ہوں کہ جن مواقع پر شریعت نے توریہ (یعنی خلافِ واقعہ بات) کی اجازت دی ہے، اس میں بیوی کو خوش کرنے والی بات بھی ہے۔

تو کھانے کی تعریف بھی ہونی چاہیے، یہ حرص ولالچ کی علامت نہیں ہے، بلکہ نبی کریم (ﷺ) کی سنت اور آپ کا طریقہ ہے۔

بَاب مَا يقوله من حضر الطعام وهو صائم إِذَا لَمْ يفطر

دعوت میں حاضر ہونے والا اگر روزہ دار ہے تو کیا کہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دعوت قبول کرنا سنت ہے:

حدیث ۷۳۸:-

وعن أَبِي هريرة رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رسولُ الله (ﷺ) : إِذَا دُعِيَ أَحَدُكُمْ فَلْيُجِبْ، فَإِنْ كَانَ صَائِماً فَلْيُصَلِّ، وَإِنْ كَانَ مُفْطِراً فَلْيَطْعَمْ.

قَالَ العلماءُ: معنى ((فَلْيُصَلِّ)): فَلْيَدْعُ، ومعنى ((فَلْيَطْعَمْ)): فَلْيَأْكُلْ.

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: جب تم میں سے کسی کو کھانے کے لیے دعوت دی جائے تو قبول کرنی چاہیے (روزہ ہو تب بھی دعوت قبول کرو اور اس کے مکان پر تشریف بھی لے جاؤ) اگر آپ روزہ دار ہیں تو اس کے گھر جا کر (چاہے کھانا مت کھانا، لیکن) اس کے لیے دعا کر دیجئے۔ اور اگر روزہ نہیں، تو کھانا بھی کھا لیجئے۔

افادات:- اگر میزبان کا کھانے کے لیے اصرار ہو، اور مہمان کے نہ کھانے سے میزبان کی دل شکنی کا اندیشہ ہو، تو میزبان کی دلجوئی کے واسطے اس مہمان کے لیے نفل روزہ توڑنے کی اجازت ہے، پھر بعد میں اس کی قضا کر لے۔ یہ بات صرف نفل روزہ کی ہے، فرض یا قضا روزہ

رکھاہوتونہیں توڑناچاہیے۔ویسے اس کے مکان پرجاکرکہہ دے کہ مَیں روزہ سے ہوں، اوردعا کردے۔

ایک مؤمن کے دوسرے مؤمن پرجوحقوق ہیں ان میں سے ایک یہ حق بھی ہے کہ اگرکوئی شرعی رکاوٹ نہیں ہے تودعوت قبول کرنی چاہیے۔ دعوت کے قبول کرنے کے لیے کچھ شرائط بھی ہیں (اس موضوع کی تفصیل [جلد:۴/ص:۲۵۷ تا ۲۶۵]پردیکھئے۔مرتب)

اس سے یہ بھی معلوم ہواکہ مہمان اگردعادینے پر اکتفاء کرتا ہے تو میزبان کو اس پر بھی راضی ہوجاناچاہیے،بلاوجہ کھانے پراصرارنہ کرے، خاص کر کھانے کی وجہ سے مہمان کوتکلیف ہوتی ہوتوپھرکیوں اصرار کیا جائے۔مقصدتومہمان کوخوش کرنا اور دعا لیناہے ،اور جب دعامفت میں مل رہی ہے توپھر آپ کیوں فیس دیناچاہتے ہیں؟

باب مَا یقوله من دُعِیَ إِلَی طَعَامٍ فَتَبِعَهُ غیره

کسی کو کھانے کی دعوت دی گئی، اور کوئی دوسرا بھی اس کے ساتھ ہو گیا، تو وہ کیا کہے؟

بسم اللہ الرحمن الرحیم

طفیلی کے احکام:

حدیث ۷۳۹:-

عن أَبِي مسعود البَدْرِيِّ رضی اللہ عنہ قَالَ: دعا رَجُلٌ النَّبِيَّ (صلی اللہ علیہ وسلم) لِطَعَامٍ صَنعَهُ لَهُ خَامِسَ خَمْسَةٍ، فَتَبِعَهُمْ رَجُلٌ، فَلَمَّا بَلَغَ البَابَ، قَالَ النَّبِيُّ (صلی اللہ علیہ وسلم): إِنَّ هَذَا تَبِعَنَا، فَإِنْ شِئْتَ أَنْ تَأْذَنَ لَهُ، وَإِنْ شِئْتَ رَجَعَ. قَالَ: بل آذَنُ لَهُ يَا رَسُولَ الله. (متفق علیه)

ترجمہ:- حضرت ابو مسعود بدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ پانچ آدمیوں کی دعوت کی (گویا اس نے یوں کہا: اے اللہ کے رسول! آپ کے ساتھ مزید چار آدمیوں کی یعنی کل پانچ کی مَیں دعوت کرتا ہوں، ان چار کی آپ ہی تعیین فرمالیجئے) جب آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) تشریف لے جارہے تھے تو مزید ایک آدمی ساتھ ہو گیا (کل چھ ہوگئے) جب میزبان کے دروازہ پر پہنچے تو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے میزبان سے کہا: یہ ایک زائد آدمی ہمارے ساتھ آگیا ہے، اب اگر تم اس کو اجازت دو تو آئے گا، ورنہ چلا جائے گا۔ میزبان نے کہا: اے اللہ کے رسول! مَیں اس کو اجازت دیتا ہوں (بے تکلفی کی بات تھی تو وہ بھی شریک ہو گیا)

افادات:- ویسے بلا اجازت چپکے سے کسی کی دعوت میں شریک ہو جانا، جیسے: بعضوں کی عادت ہوتی ہے کہ شادیوں کے کھانوں میں چپکے سے پہنچ جاتے ہیں اور دعوت وصول کر کے آجاتے ہیں؛ یہ جائز نہیں ہے۔ پرانے زمانہ میں مستقل ایک طبقہ تھا جن کو طفیلی کہا جاتا تھا۔ علامہ

ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ کا مستقل ایک رسالہ ہے، جس میں انہوں نے طفیلیوں کے اس قسم کے قصہ بیان کئے ہیں کہ وہ مختلف حیلے بہانوں سے لوگوں کے یہاں دعوتوں میں پہنچ جاتے تھے، ایسوں کے لیے تو حدیث پاک میں وعید آئی ہے، حضورِ اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ ایسا آدمی جو بغیر دعوت کے کہیں چلا جائے اور کھاکر آجائے وہ چور بن کر گھستا ہے اور غاصب و ڈاکو بن کر نکلتا ہے (ابوداود شریف: باب مَا جَاءَ فِي إِجَابَةِ الدَّعْوَةِ) اس لیے ایسی چیزوں سے اپنے آپ کو بچانے کا اہتمام کیا جائے۔

جہاں وہ برا ہے؛ وہاں یہ بھی برا ہے:

لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ اگر میزبان کی طرف سے اجازت دی جائے تب بھی کھانے سے انکار کیا جائے۔ جہاں وہ برا ہے وہاں یہ بھی برا ہے، جیسے: بعضوں کی عادت ہوتی ہے کہ اتفاق سے ان کو دعوت نہیں دی گئی تھی، اور وہ پہنچ گئے، اب صاحبِ خانہ بڑے شوق اور رغبت سے ان کو دیکھ کر خوش ہو کر کہتا ہے: آیئے، تشریف لایئے، لیکن یہ یوں سوچتا ہے کہ مجھے پہلے سے دعوت کیوں نہیں دی تھی، اس لیے میں نہیں کھاتا۔ اب ساری دنیا سمجھا رہی ہے کہ آجاؤ، بھائی! آجاؤ۔ صاحبِ خانہ بھی اس کا پیر پکڑ رہا ہے، تب بھی یہ جناب کھانے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ یہ بھی بہت برا ہے۔ شریعت اس کی بھی اجازت نہیں دیتی۔ دعوت کے لیے ایسا کوئی اصول نہیں ہے کہ پہلے سے کہا جائے تو ہی دعوت؛ اور اگر وقت پر کہا جائے تو عداوت۔

ایسا کسی حدیث میں نہیں آیا ہے۔ جو لوگ ایسا مزاج رکھتے ہیں انہوں نے اگر کہیں کسی حدیث میں دیکھا ہو تو ہمیں بھی بتادیں تاکہ ہم دوسروں کو بتاسکیں۔

گم راہ طفیلی کا قصہ:

ایک طفیلی کا قصہ ہے کہ چند شعراء کسی بادشاہ کی خدمت میں جارہے تھے، ایک طفیلی نے دیکھا تو یوں سمجھا کہ دعوت ہوگی، اس لیے وہ بھی ساتھ ہوگیا، اس کو پتہ نہیں تھا کہ یہ شاعر لوگ ہیں، اور بادشاہ کی شان میں قصیدہ کہنے کے لیے جارہے ہیں، اب ان کے ساتھ اندر داخل تو ہوگیا، جب وہ سب دربار میں پہنچے تو بادشاہ کی طرف سے اجازت ملی اور تمام شاعروں نے اپنا اپنا قصیدہ پیش کیا اور انعام پایا۔ یہ اخیر میں بیٹھا سوچ رہا تھا کہ میں تو دعوت سمجھ کر آیا تھا، یہاں تو مَیں پھنس گیا؛ اب کیا کروں۔ جب اس کی باری آئی تو پوچھا گیا: آپ کون ہیں ؟ اس نے کہا: "وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُونَ وَأَنَا مِنَ الْغَاوِيْنَ الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ" میں ان گمراہوں میں سے ہوں جو شعراء کی اتباع کرتے ہوئے یہاں پہنچ گئے ہوں۔

دعاء

أَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى آلِ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ
كَمَا تُحِبُّ وَتَرْضٰى بِعَدَدِ مَا تُحِبُّ وَتَرْضٰى

اے اللہ! تو ہمارے گناہوں کو معاف فرما، ہماری خطاؤں سے درگزر فرما۔ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے زندگی کے جو آداب تعلیم و تلقین فرمائے ہیں، اے اللہ! ایک ایک ادب کو پورے عظمت واحترام کے ساتھ اختیار کرتے ہوئے اپنی زندگیوں میں اپنانے کی تو ہمیں توفیق وسعادت نصیب فرما۔ اے اللہ! تو ہم سے راضی ہوجا، اپنی مرضیات پر زیادہ سے زیادہ چلا کر نامرضیات سے پوری پوری حفاظت فرما۔ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سنتوں اور طریقوں کو اپنی زندگی کے ہر شعبے میں جاری کرنے کی ہمیں توفیق عطا فرما۔ نفس و شیطان کی شرارتوں سے ہماری حفاظت فرما۔ اے اللہ! بیماروں کو صحت ِ کاملہ عاجلہ مستمرہ عطا فرما۔ اے اللہ! جو مقروض ہیں ان کے قرضوں کی ادائیگی کی شکلیں پیدا فرما، جو پریشان حال ہیں ان کی پریشانیوں کو دور فرما۔ جو حاجت مند ہیں ان کی حاجتوں کو پوری فرما۔ اے اللہ! تمام مصائب، آفات وبلاؤں سے تیری پوری مخلوق کی پوری حفاظت فرما۔ اے اللہ! جس آندھی اور طوفان کے خطرے بتائے جاتے ہیں، اس سے تیری مخلوق کی پوری پوری حفاظت فرما۔ اے اللہ! ان بلاؤں کو تو محض اپنے فضل سے ہٹالے۔ ہمارے گناہوں کو معاف فرما۔ ہماری جن بداعمالیوں کی وجہ سے یہ بلائیں آسکتی ہیں، محض اپنے فضل سے ان بداعمالیوں کو معاف فرما۔ اپنی شانِ کریمی سے معاف فرما۔ تمام شرکاءِ مجلس کی اور جنہوں نے بھی دعاؤں کی درخواستیں کی ہیں ان کی بھی جائز مرادوں کو پورا

فرما۔ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جتنی خیر و بھلائی تجھ سے مانگی وہ سب ہمیں اور پوری امت کو عطا فرما، اور حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جن شرور اور برائیوں سے پناہ چاہی، ان سے ہماری اور پوری امت کی حفاظت فرما۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ وَتُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ

وَصَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ سَيِّدِنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ

بِرَحْمَتِكَ يَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ

باب الأكل مِمَّا يليه ووعظه وتأديبه من يسيء أكله

اپنے سامنے سے کھانا اور خلافِ ادب کھانے والے کو نصیحت کرنا اور ادب سکھانا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کھانے کے آداب کی نصیحت:

حدیث ۷۴۰:-

عن عمر بن أَبِی سَلَمَة رضی اللہ عنهما قَالَ: کُنْتُ غُلاماً فِی حِجْرِ رسولِ اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) وَ کَانَتْ یَدِی تَطِیشُ فِی الصَّحْفَةِ، فَقَالَ لِی رسولُ اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم): یَا غُلامُ، سَمِّ اللہَ تَعَالَی، وَکُلْ بِیَمِینِكَ، وَکُلْ مِمَّا یَلِیكَ. (متفقٌ علَیهِ)

ترجمہ:- حضرت عمر بن ابو سلمہ رضی اللہ عنهما فرماتے ہیں کہ میں چھوٹا بچہ تھا اور حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تربیت ونگرانی میں تھا، ایک مرتبہ کھانے کے دوران میرا ہاتھ پیالہ میں اِدھر اُدھر گھوم رہا تھا تو نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مجھے فرمایا: اے بچے! اللہ کا نام لے کر کھاؤ، اور دائیں ہاتھ سے کھاؤ، اور اپنے سامنے سے کھاؤ۔ (یہ روایت پہلے بھی کئی مرتبہ آچکی ہے)

حدیث ۷۴۱:-

عن سلمةَ بن الأَکْوَعِ رضی اللہ عنه أَنَّ رَجُلاً أَکَلَ عِنْدَ رَسُولِ اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) بِشِمَالِهِ، فَقَالَ: کُلْ بِیَمِینِكَ. قَالَ: لا أَسْتَطِیعُ. قَالَ: لاَ اسْتَطَعْتَ! مَا مَنَعَهُ إِلاَّ الکِبْرُ! فَمَا رَفَعَهَا إِلَی فِیهِ. (رواه مسلم)

ترجمہ مع تشریح:- حضرت سلمہ بن اَکوع رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس بیٹھ کر بائیں ہاتھ سے کھانا کھا رہا تھا۔ حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس سے فرمایا: دائیں ہاتھ سے کھائو (تو حق بات

کو قبول نہ کرتے ہوئے)اس نے جواب میں کہا:میں دائیں ہاتھ سے کھانہیں سکتا(حالاں کہ ایسی بات نہیں تھی۔وہ دائیں ہاتھ سے کھاسکتا تھا لیکن اس نے تکبر کی وجہ سے انکار کیا تھااور بات نہیں مانی)توحضورِاکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: ٹھیک ہے! اب نہیں کھاسکوگے(حضرت سلمہ بن اَکوع رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں)اس کے بعد کبھی وہ اپنادایاں ہاتھ اٹھاہی نہیں سکا (ہمیشہ کے لئے اس کادایاں ہاتھ بیکار ہوگیا۔)

(نوٹ:-یہ روایت پہلے بھی کئی مرتبہ آچکی ہے۔جلد:۸/روایت نمبر۶۱۳ پر بھی گزری ہے۔مرتب۔)

النّهی عن القِرَانِ بین تمرتین ونحوهما إذَا أُكل جماعة إِلاَّ بإذن رفقته

مجمع کے ساتھ کھاتے وقت کھجور وغیرہ دو، دو نہ لے

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

کھانے کے آداب میں ایک اورادب بتلارہے ہیں کہ جب کئی آدمی مل کر کھانا کھارہے ہوں اور سب کے لیے مشترک طورپر کھانا رکھا گیا ہو، مثلاً:اگر کھائی جانے والی چیز کھجوریں ہیں ؛ تو کھانے والے ان کھجوروں کو دو دو دانے نہ اٹھائیں ،بلکہ ایک ایک دانہ اُٹھا کر استعمال کریں۔مطلب یہ ہے کہ کھانے کے دوران کوئی ایسا طریقہ اختیارنہ کرناچاہیے جس کی وجہ سے ساتھ میں کھانے والوں کی حق تلفی ہوتی ہو۔یہ ایک بہت اہم تعلیم ہے جو نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ہمیں دی ہے۔

ساتھ بیٹھ کرکھانے کے اہم آداب:

حدیث ۷۴۲:-

عن جَبَلَة بن سُحَيم قَالَ:أصَابَنَا عَامُ سَنَةٍ مَعَ ابن الزُّبَيرِ؛ فَرُزِقْنَا تَمْراً،وَكَانَ عبدُ اللهِ بن عمر رضی اللہ عنہما **يَمُرُّ بنا ونحن نَأكُلُ، فيقولُ: لاَ تُقَارِنُوا، فإنَّ النَّبِيَّ** (صلی اللہ علیہ وسلم) **نَهَى عنِ القِرَانِ، ثُمَّ يَقُولُ: إلاَّ أنْ يَسْتَأذِنَ الرَّجُلُ أخَاهُ.** (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت جبلہ بن سُحَیم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کے دورِخلافت میں ایک مرتبہ قحط پڑ ا(قحط کے زمانہ میں ویسے بھی کھانے پینے کی چیزوں کی قلت ہوا کرتی ہے) توہمیں حکومت کی طرف سے کچھ کھجوریں مل گئی اورہم سب ساتھ بیٹھ کرکھارہے تھے،جب حضرت عبد

اللہ بن عمر رضی اللہ عنھما ہمارے پاس سے گزرے تو فرمایا: کھانے کے دوران دو دو کھجوریں ایک ساتھ نہ اُٹھاؤ، اس لیے کہ نبیِ کریم (ﷺ) نے دو کھجوریں ساتھ اُٹھانے سے منع کیا ہے، البتہ اگر آدمی اپنے بھائی سے اجازت سے لے لے (اور وہ بہ رضا و رغبت اجازت دیدے، تو دو کھجوریں بھی ایک ساتھ اُٹھا سکتے ہیں۔ اسی طرح اگر انگور کھا رہے ہیں، تو دو دانہ انگور کے ایک ساتھ نہ اُٹھائے جائیں۔)

افادات:- یہاں ایک خاص تعلیم دی گئی ہے کہ ہر وہ چیز جس میں سب کا حق ہو- جیسے کہ یہاں جو کھانا رکھا گیا تھا اس میں سب برابر کے شریک تھے، اور سب کا برابر کا حق تھا- تو اس چیز میں سے اپنا حق وصول کرتے ہوئے ہر آدمی کو اس بات کا لحاظ رکھنا چاہیے کہ کسی دوسرے کی حق تلفی نہ ہو، کوئی بھی دوسرے سے زیادہ وصول نہ کرلے، یہ بہت ضروری تعلیم ہے۔ جب سب ساتھ مل کر کھا رہے ہوں تو ایک ساتھ دو کھجوریں اُٹھانے سے نبیِ کریم (ﷺ) نے جو منع فرمایا اس کی بنیاد یہی ہے۔

ہاں! اگر آپ اپنی ذاتی کھجوریں خرید کر لائے ہیں، تو پھر وہاں دو کیا، چار بھی ایک ساتھ اُٹھا کر کھا سکتے ہیں۔ لیکن اگر سب نے مل کر خریدی ہیں، یا کسی اور نے سب کے لیے رکھی ہیں، مثلاً: کسی کے یہاں دعوت ہے، اور وہاں سب کے سامنے کھانا رکھا گیا ہے، تو اس صورت میں جتنے بھی کھانے والے ہیں ان تمام کا اس کھانے میں برابر کا حق ہے، گویا سب شریک ہیں اور یہ چیز مشترک ہے، اب آپ کو اس میں سے اپنا حق وصول کرنا ہے، اور اس میں اس بات کا لحاظ رکھنا ہے کہ اپنا حق وصول کرتے ہوئے کوئی ایسا طریقہ اختیار نہ کیا جائے جس کی وجہ سے

دوسروں کے حق میں کمی آجائے اور حق تلفی ہوجائے۔ دو کھجوریں ایک ساتھ اُٹھانے سے جو منع فرمایا ہے اس کی وجہ یہی ہے۔

آپ کسی کے یہاں دعوت میں جائیں تو ایک شکل تو یہ ہوتی ہے کہ داعی کی جانب سے ہر ایک کے سامنے الگ الگ پلیٹ رکھی گئی ہے، جیسے: آئس کریم ہر ایک کو الگ الگ پلیٹ میں دی گئی ہے، تو اس صورت میں چمچ میں آپ زیادہ لیں، یا کم لیں، اس سے کوئی فرق پڑنے والا نہیں ہے، کیوں کہ پلیٹ میں آپ کو جو حصہ دیا گیا ہے وہ آپ پورا کررہے ہیں، کسی دوسرے کے حصہ میں آپ ہاتھ نہیں مار رہے ہیں۔ لیکن اگر ایک ہی پلیٹ میں آئس کریم رکھی گئی ہے اور کہا گیا کہ سب اس میں سے کھاؤ، تو اس صورت میں آپ اپنے چمچ میں دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ اٹھائیں، جس سے دوسروں کے حق میں کمی آتی ہو؛ اس کی شریعت اجازت نہیں دیتی۔ آپ اس انداز سے کھایئے کہ دوسرے کے حق کو ضائع کرنے والے نہ بنیں۔

یا جیسے آج کل عام طور پر دعوتوں میں ایک بڑے برتن میں سالن لا کر رکھ دیا جاتا ہے، دوسرے برتن میں چاول رکھ دیے جاتے ہیں، اور ہر ایک کے سامنے خالی پلیٹ ہوتی ہے، تا کہ ہر ایک اپنے طور پر نکال کر کھائے، تو اس میں بھی یہ بات ملحوظ رہے کہ جو چیز آپ نکال رہے ہیں اس میں کسی کی حق تلفی نہ ہو۔

بعضوں کی عادت ہوتی ہے کہ سالن والا بڑا برتن ہاتھ میں آگیا تو ساری بوٹیاں پہلے ہی اپنی پلیٹ میں نکال لیتے ہیں اور بعد والے صرف شوربے پر قناعت کرتے ہیں؛ ایسا نہ کریں۔ آپ کو دیکھنا ہے کہ برتن میں یہی ایک سالن آیا ہے، اور اس میں اتنی بوٹیاں ہیں کہ اگر سب کو برابر تقسیم کی جائے تو میرے حصہ میں ایک یا دو بوٹیاں ہی آتیں ، توجب آپ پہلے نکال رہے ہیں تو اپنی پلیٹ میں ایک یا دو سے زیادہ بوٹیاں نہ نکالیں ، تاکہ ہر ایک کو اس کے حصہ کے بقدر مل جائے۔ بعضوں کی جو عادت ہوتی ہے کہ پہلے برتن ہاتھ میں آ جانے کی صورت میں پورا اپنی پلیٹ میں ہی اتار لیتے ہیں، یہ بالکل غلط طریقہ ہے، اس میں دوسروں کی حق تلفی ہوتی ہے جس کی شریعت اجازت نہیں دیتی، اس صورت میں تو آپ زیادہ وصول کرکے گویا اپنے بھائی کا حق مار رہے ہیں ، یہ گناہ ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنھما نبیٔ کریم (ﷺ) سے یہی نقل فرماتے ہیں۔ اسی لیے ہمارے اکابر فرماتے ہیں کہ جب بھی کسی کے دسترخوان پر جائیں تو یہ چیز ہمیشہ ملحوظ رہنی چاہیے، اپنی پلیٹ میں زیادہ اتارلینا عار کی چیز سمجھی جاتی ہے ، اور اس کو بدتہذیبی پر محمول کیا جاتا ہے۔

مہذب گیر تعلیم:

ایک مؤمن کو اللہ تعالیٰ اور آپ (ﷺ) کی طرف سے جو بھی آداب تعلیم دیئے گئے ہیں وہ سب ایسے ہیں کہ جس سے آدمی مہذب اور با ادب بنتا ہے۔ زندگی کے تمام شعبوں میں یہی

تعلیم ہے کہ آپ اپنا حق وصول کرنے میں ایسا کوئی طریقہ اختیار نہ کریں جس سے دوسروں کی حق تلفی ہوتی ہو۔

مثلاً: ٹرین میں آپ کو سفر کرنا ہے، آپ نے سورت سے بمبئی کا ٹکٹ لیا، جب اسٹیشن پر پہنچے اور ٹرین میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ دوسرے پسینجر ابھی آئے نہیں ہیں، اب آپ نے سیٹیں خالی دیکھ کر اپنا بستر بچھالیا اور ایک کے بجائے چار سیٹوں پر قبضہ کرکے لیٹ گئے، حالاں کہ آپ نے جو کرایہ ادا کیا ہے جس کی وجہ سے آپ کا حق تو صرف ایک سیٹ کا بنتا ہے، لیکن آپ دوسری تین سیٹوں پر جو قبضہ کررہے ہیں، تو اس طرح ظاہر ہے کہ آپ بعد میں آنے والوں کی حق تلفی بھی کررہے ہیں اور دوسروں کو تکلیف میں بھی ڈال رہے ہیں، پھر ہوتا یہ ہے کہ بعد میں آنے والے تو کھڑے ہیں اور آپ آرام سے لیٹے ہوئے ہیں، یہ بالکل گناہ کا کام ہے، شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی۔ ایک تو آپ نے اپنے حق سے زیادہ وصول کیا اور ساتھ ہی ساتھ دوسروں کی حق تلفی بھی کی، یعنی دوسرے لوگ اگر موجود نہ ہوتے تب بھی آپ ایک سے زیادہ سیٹ پر بیٹھ کر ایک سیٹ سے زیادہ وصول کرنے والے قرار دیئے جاتے۔

ترقی کا راز:

کسی زمانہ میں پڑھا تھا کہ ایک صاحب یورپ کے کسی سفر پر گئے تھے، انہوں نے بتلایا کہ فرانس میں ٹرین میں سفر کررہا تھا، دیکھا کہ ایک آدمی بیٹھا ہوا ہے اور اس پر خوب نیند

طاری ہے، باقی سیٹیں خالی تھیں،پورا ڈبہ خالی تھا لیکن وہ بیٹھے بیٹھے اپنی نیند پوری کررہاتھا۔میں نےاس سے کہا:باقی سیٹیں خالی ہیں،لیٹ جاؤ۔تو اس نے کہا: میں نے کرایہ ایک ہی سیٹ کا دیا ہے،اس لیے مجھے ایک ہی سیٹ استعمال کرنے کا حق ہے، چاہے باقی سیٹیں خالی ہیں لیکن مجھے اس سے فائدہ اٹھانے کی اجازت نہیں۔یوروپ والوں کی ترقی کارازیہی ہے،اس لیے کہ دنیاتو دارالاسباب ہے۔

اسی لیے ہمارے اکابرفرماتے ہیں کہ نبیؐ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے زندگی گزارنے کا جو طریقہ ہمیں تعلیم فرمایا ہےاس میں ایسی تعلیمات ہیں جس میں دنیا وآخرت دونوں کی بھلائی،راحت اور فائدہ موجودہے۔معاشرت یعنی زندگی گزارنے اور آپس کے تعلقات کو نبھانے کاجوطریقہ بتلایا ہےاس میں اگرہم شریعت کے احکام کا لحاظ کریں گےتوہماری دنیوی زندگی بھی راحت و آرام،سکھ، چین واطمینان والی بن جائے گی۔اور اگرہم شریعت کالحاظ صرف عبادات، نماز،روزہ وغیرہ میں کریں،اور معاشرت،اخلاق ومعاملات میں نہ کریں ؛تو دنیوی اعتبارسے پریشانیوں کا شکارہوں گے۔یوروپ والے اگر چہ ایمان نہیں رکھتے جس کی وجہ سے آخرت کی نجات یعنی جہنم سے بچاؤ تو نصیب نہیں ہوگا ،لیکن معاشرت کے اندران چیزوں کو وہ اپنائےہوئے ہیں جن کی نبیؐ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ہمیں تعلیم دی ہےجس کا نتیجہ یہ ہے کہ دنیوی اعتبار سےوہ راحت ، چین اوراطمینان سے ہیں۔

اسی طرح وہ لوگ معاملات کے اندر دیانت وامانت کا پوراپورا لحاظ کرتے ہیں کسی چیز میں کوئی عیب ہے ،اور دیکھنے میں چاہے وہ چیز معمولی ہو لیکن وہ فوراً بتا دیتے ہیں کہ اس میں یہ نقص ہے۔استعمال شدہ چیز کے بارے میں بتادیتے ہیں کہ یہ چیز استعمال شدہ ہے۔بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ خریدنے والا چاہے کتنا ہی ماہر ہو لیکن اس کو پتہ بھی نہیں چلتا کہ یہ چیز استعمال شدہ ہے مگر وہ بتا دیتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کی تجارت بھی برابر ترقی کر رہی ہے، کاروبار میں اضافہ ہورہا ہے۔ہمارے یہاں یہ ہے کہ ہم اپنے کاروبار میں غبن اور دھوکہ بازی سے کام لیتے ہیں ،تو اچھا خاصہ کاروبار چل رہا ہوتا ہے،لیکن تھوڑی سی دھوکے بازی کے نتیجہ میں سارا اعتماد ختم ہو جاتا ہے اور ہمیشہ کے لیے آدمی نقصان اُٹھاتا ہے۔

شرعی قانون پر عمل کا ایک کافر کو فائدہ:

کسی رسالہ میں پڑھا تھا کہ جنوب کے کسی علاقہ میں ایک صاحب تھے، وہاں بارش نہیں ہوئی پھر بھی ان کی کھیتی باڑی کو نقصان نہیں ہوا، دوسروں کی کھیتیوں کو روگ لگتے،لیکن اس کی کھیتی کو کبھی کوئی روگ بھی نہیں لگتا تھا، بارش کی کمی کی وجہ سے دوسروں کی پیداوار میں کمی آتی تھی لیکن اس کو کبھی کمی نہیں ہوتی تھی۔کسی نے پوچھا: بھائی !کیابات ہے؟اس نے کہا:میں نے پڑھا ہے کہ مسلمانوں کے یہاں یہ حکم ہے کہ اگر بارش کے پانی سے کھیتی ہو تو دسواں حصہ،اور اگر خود پانی پلایا ہو تو بیسواں حصہ نکال کر اس کا صدقہ کیا جائے؛مَیں جب سے اس پر

عمل کرتا ہوں تو آج تک کبھی میری کھیتی کو نقصان نہیں ہوا۔ تو شریعت کا قانون بہت قیمتی ہے، وہ بھلے ہی کافر تھا لیکن اس نے دنیا میں اس حکم پر عمل کیا تو دنیوی طور پر اس کا جو فائدہ ہے وہ اس کو حاصل ہوا، اگرچہ ایمان نہ ہونے کی وجہ سے آخرت کا فائدہ نہیں ملے گا۔

معاملہ کتنا سنگین ہے:

خیر! مَیں یہ بتلا رہا تھا کہ مشترک چیزوں کے استعمال کے لیے شریعت نے ہمیں باقاعدہ یہ طریقہ بتایا ہے کہ ایسا کوئی طرز اختیار نہ کیا جائے جس میں کسی کا حق مارا جائے، یا کسی کو تکلیف ہو۔ مثلاً: ہم ٹرین میں سفر کر رہے ہیں، اور دوسروں کی سیٹوں پر قبضہ کر کے سو گئے اور دوسرے لوگ کھڑے رہے تو قرآنِ پاک میں آیا ہے: ﴿وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ﴾ جو ساتھی تھوڑی دیر کے لیے ساتھ ہو گیا اس کا بھی حق ہے، لیکن اس طرح ہم نے اس کی حق تلفی کی۔ دو چار گھنٹے کے بعد وہ اور ہم جدا ہو گئے، پھر چند سالوں کے بعد کسی کے بتانے سے ہمیں احساس ہوا کہ ہم نے یہ جو کیا تھا وہ غلط تھا اور گناہ کا کام تھا، اب توبہ کی توفیق ہوئی تو جو لوگ موجود ہیں اور جن کو جانتے بھی ہیں ان سے تو معافی مانگ لیں گے، لیکن وہ ساتھی جو سفر میں ہنگامی طور پر ساتھ ہو گیا تھا جس کو تو ہم جانتے بھی نہیں ہیں، اور نہ اس کا کوئی ایڈریس ہے، ہم نے اس کی جو حق تلفی کی ہے اس کی تلافی کا کیا راستہ ہو گا! اب چاہے راتوں کو اللہ تعالیٰ کے سامنے ہم کتنا ہی روئیں،

لیکن جب تک وہ معاف نہ کرے وہاں تک معاف ہونے والا نہیں ہے، اس لیے سوچو کہ معاملہ کتنا سنگین ہے!۔

معمولی سی غفلت سے حرام کا ارتکاب:

اسی لیے جو چیزیں مشترک ہوا کرتی ہیں اس میں سے اپنے حق کی وصول یابی کے لیے شریعت نے ہمیں باقاعدہ یہ طریقہ بتلایا ہے کہ ایسا انداز اختیار کیا جائے کہ جس سے کسی کو تکلیف بھی نہ ہو، اور کسی کا حق بھی مارا نہ جائے۔ مثلاً: گھر میں یا دار الاقامہ (Boarding) میں چند لوگ ساتھ میں رہتے ہیں، تو سب کے غسل کے واسطے ایک ہی بالٹی ہوتی ہے، یا بیت الخلاء میں لوٹا ہوتا ہے، تو اس کو مشترک سمجھ کر استعمال کیا جائے، اور پھر استعمال کر کے اسی جگہ رکھا جائے جہاں اس کی جگہ متعین ہوتی ہے۔

آج کل ایک مزاج ایسا بن گیا ہے کہ ایسی چیزوں کو استعمال کے بعد جہاں جی چاہا ڈال دیتے ہیں، جب دوسرے آدمی کو ضرورت پیش آتی ہے تو وہ اس کی مقررہ جگہ پر تلاش کرتا ہے، اور جب اس کو وہ نہیں ملتی تو تکلیف میں مبتلا ہوتا ہے۔ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ حرام ہے۔ ایک معمولی سی غفلت کی بنا پر ہم حرام کام کا ارتکاب کر لیتے ہیں، اور دوسروں کو تکلیف میں ڈال دیتے ہیں۔

اسی طرح بیت الخلاء مشترک استعمال کی چیز ہے، تو آپ اس کو استعمال کر کے اس کی صفائی کا جو طریقہ ہے وہ اپنائیے، اس میں پانی ڈالنے اور فلش کرنے کا اہتمام بھی ضروری ہے۔ بعضوں کی عادت ہوتی ہے کہ فراغت کے بعد نجاست کو ویسا ہی چھوڑ کر نکل آتے ہیں، اگر ہم کبھی جاتے ہیں اور ایسی صورت پیش آتی ہے تو ہماری طبیعت اس کا بڑا برا اثر لیتی ہے اور اس سے ہمیں بڑی تکلیف ہوتی ہے، ہم سوچتے ہیں کہ کیسے نامعقول آدمی نے اس کو استعمال کیا ہے؟ پھر اگر ہم بھی ایسی ہی شکل اختیار کریں تو اس کا نتیجہ بھی تو یہی نکلے گا؛ حالاں کہ شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی۔ تو جب آپ بیت الخلاء کو استعمال کر رہے ہیں تو فراغت کے بعد اس کی صفائی کا جو طریقہ ہے اس کو عمل میں لاتے ہوئے اس کو صاف کر کے نکلیے، ایسا نہیں کہ ویسا ہی چھوڑ کر نکل آئے۔ اسی طرح چھوڑ دینے کی شکل میں دوسروں کو جو تکلیف ہوگی اس کی ذمہ داری آپ پر ہوگی۔

اہلِ یوروپ کے یہاں اصول کی پابندی:

حضرت مولانا مفتی محمد تقی صاحب عثمانی دامت برکاتہم فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ مَیں انگلینڈ میں ٹرین کے اندر سفر کر رہا تھا، مجھے استنجاء کا تقاضہ ہوا تو میں بیت الخلاء کے پاس گیا، وہاں دیکھا کہ ایک خاتون کھڑی ہوئی تھی تو مَیں یوں سمجھا کہ اندر کوئی ہے ، اس کے نکلنے کے انتظار میں یہ کھڑی ہے، مَیں واپس جا کر اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا، تھوڑی دیر کے بعد پھر دیکھا تو وہ عورت وہیں کھڑی تھی، مَیں بیت الخلاء کے پاس گیا تو دیکھا کہ دروازہ پر لکھا ہوا تھا کہ خالی ہے، تو مَیں

نے اس خاتون سے کہا: اگر آپ اندر جانا چاہتی ہیں تو جائیں، ورنہ مَیں جاؤں؟اس نے کہا: مَیں ایک خاص وجہ سے یہاں کھڑی ہوں، دراصل مَیں اپنی ضرورت کے لیے اندر گئی تھی، فراغت کے بعد فلش کرنا چاہتی تھی کہ ٹرین اسٹیشن پر آکر کھڑی ہوگئی، اب چوں کہ اندر لکھاہے کہ جب گاڑی اسٹیشن پر کھڑی ہو تو بیت الخلاء کو استعمال بھی نہ کیا جائے اور فلش بھی نہ کیا جائے، اب مَیں اس انتظار میں ہوں کہ گاڑی چلے تو مَیں فلش کرکے اس کو صاف کروں۔

دیکھئے! یوروپ والے اصول کی پابندی کا کتنا زیادہ اہتمام کرتے ہیں۔

علامہ انورشاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ ڈابھیل میں :

حضرت علامہ انورشاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں لکھاہے کہ جس زمانہ میں ڈابھیل میں قیام تھا، تو جہاں آج بھی اساتذہ کی قیام گاہ ہے، اس کے سامنے اس وقت بیت الخلاء تھے، آج کل تو وہ بند کردیئے گئے ہیں، انہی بیت الخلاء میں حضرت شاہ صاحب تشریف لے جاتے تھے، پانی باہر سے لے کر جانا پڑتا تھا، اوراس کا قدمچہ جو بناہوا تھا وہ فلش کے انداز کا بناہوا تھا، اور ایسے انداز کا جو بیت الخلاء بناہوا ہوتا ہے اس میں پانی زیادہ ڈالنے کی ضرورت پیش آتی ہے، تو حضرت شاہ صاحبؒ فراغت کے بعد بار بار باہر سے لوٹے میں پانی بھر کر لے جاتے اور ڈالا کرتے تھے، تاکہ اندر بدبو بھی باقی نہ رہے اور کسی کے استعمال کے نتیجہ میں جو بدبو پیدا ہوتی ہے اس بدبو سے بھی بعد میں جانے والے کو کوئی تکلیف نہ ہو۔

دیکھو! ہمارے اکابر اس کا بھی کتنا زیادہ خیال رکھتے تھے۔ تو کسی بھی مشترک چیز کو اس طرح استعمال کرنا جس سے دوسروں کو تکلیف ہو شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی۔

مشترک کاروبار کی بدنظمی:

اسی طرح ہمارے یہاں جو کاروبار عام طور پر مشترک ہوتے ہیں ، اس کے اندر بھی ایسا انداز اختیار کیا جائے کہ سب کو برابر کا حق ملے، یعنی سب کے حقوق اور حصے معلوم ہونے چاہئیں۔ آج کل ہمارے سماج میں یہ بھی ایک مصیبت ہے کہ باپ کے ساتھ کاروبار میں جب بیٹے وغیرہ شریک ہوتے ہیں تو ہر ایک کا کتنا حصہ رہے گا وہ متعین نہیں کیا جاتا، کسی بھی تعین کے بغیر ساتھ میں کام کرتے ہیں۔ اگر شروع میں کہا جاتا ہے تو لوگ کہتے ہیں کہ ایک باپ کی اولاد ہے، اس کی کیا ضرورت ہے؟ اور ایسی بھی کیا غیریت دکھلانی؟ لیکن پھر ہوتا یہ ہے کہ جب بڑوں کی شادی ہو جاتی ہے اور ان کی اولاد ہوتی ہے، تو ایک کے یہاں چار اولاد ہوئی اور دوسرے کے یہاں ایک ہی ہے، تیسرے کے یہاں دس ہے، اب چقمق شروع ہوتی ہے کہ دس والا تو بہت کھاتا پیتا ہے، اس کے یہاں زیادہ پیسہ استعمال ہوتا ہے، اور اس کے یہاں زیادہ چیزیں جاتی ہیں۔ اب اگر کسی کے یہاں شادی کی نوبت آئی تو کہا جاتا ہے کہ اس کے یہاں تو زیادہ خرچ کیا گیا، میرے یہاں کے موقع پر کم خرچ کیا گیا۔ ایک زمانہ تک یہ سلسلہ چلتا ہے، لیکن یہی چیزیں دھیرے دھیرے آگے بڑھتی رہتی ہیں ، اور دلوں کے اندر میل پیدا ہوتا رہتا ہے، پھر یہی لاوا

کسی دن جب باہر آتا ہے، تو ایسا آتا ہے کہ زندگی بھر ایک دوسرے کا منہ دیکھنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ یہ سب کیوں ہوتا ہے؟ اسی بدنظمی کی وجہ سے ہوتا ہے جس کی شریعت اجازت نہیں دیتی۔ شریعت تو یہ کہتی ہے کہ پہلے ہی سے سب کے حصے متعین کردئے جائیں۔ والد کو بھی چاہیے کہ سب کے حصے ان کی حیثیت کے مطابق طے کردے کہ منافع (Profit) میں سے ہر ایک کو اتنا اتنا حصہ دیا جائے گا؛ تاکہ بعد میں پریشانی کی نوبت ہی نہ آئے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا عمل:

گھر کی چیزیں بھی متعین کردی جانی چاہئیں، ایک ہی گھر میں سب ساتھ رہتے ہیں تو کون کس چیز کا مالک ہے، اس کا بھی خصوصی اہتمام ہونا چاہیے۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے: آج اگر میرا انتقال ہوجائے تو میری چیزوں کے معاملہ میں کسی کو کوئی پریشانی نہیں ہوگی، اس لیے کہ حضرت کی دو اہلیہ تھیں، اور حضرت فرماتے تھے کہ: مَیں نے لکھ دیا ہے کہ بڑی اہلیہ کے گھر میں جو بھی ہے وہ ان کا ہے، اور چھوٹی اہلیہ کے گھر میں جو بھی ہے وہ ان کا ہے، اور میری چیزیں خانقاہ کے میرے کمرے میں رکھی ہوئی ہیں۔

مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا وصیت نامہ:

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق مولانا محمد تقی صاحب فرماتے ہیں کہ: آخری زمانہ میں جب صاحب ِفراش تھے تو ان کا یہ حال تھا کہ اگر پانی منگاتے اور ہم گلاس میں پانی لاتے تو پانی پی لینے کے بعد تقاضہ فرماتے کہ یہ گلاس لے جاؤ، اگر کبھی وہیں رکھ کر ہم کسی دوسرے کام میں مشغول ہو جاتے تو بہت ناراض ہوتے۔ایک مرتبہ ہم نے پوچھا کہ: ابّا جان! اگر کسی کام میں مشغول ہونے کی وجہ سے گلاس یا برتن لے جانے میں ذرا دیر ہو جاتی ہے؛ تو آپ اتنا زیادہ ناراض کیوں ہوتے ہیں ؟تب فرمایا: بات دراصل یہ ہے کہ مَیں نے اپنے وصیت نامہ میں یہ لکھا ہے کہ میرے اس کمرے میں جتنی چیزیں ہیں اس کا مالک میں ہوں، اور گھر میں دوسری جگہوں میں جو چیزیں ہیں اس کی مالک تمہاری والدہ ہیں ،اب اگر تم وہاں سے میرے لیے کوئی چیز برتن وغیرہ لائے اور فراغت کے بعد میں فوراً بھیجنا چاہتا ہوں لیکن تم لے جانے میں دیر کرتے ہو تو مجھے یہ خیال ہوتا ہے کہ خدانہ کرے اس دوران اگر میری موت آگئی اور یہ برتن میرے کمرے میں رہا تو میرے وصیت نامہ میں لکھے ہوئی تحریر کے مطابق لوگ یوں سمجھیں گے کہ یہ میرے کمرے میں ہے، اس لیے اس کا مالک میں ہوں، اور اس کو بھی میراث میں شمار کرلیں گے۔

خلاصۂ روایت:

بہر حال! یہ ساری چیزیں ہیں جس کا لحاظ بہت ضروری ہے۔ مشترک چیزوں میں دوسروں کی حق تلفی نہ ہو، یہ بھی بہت ضروری ہے، اور اپنا حق بھی اپنی حد کی مقدار میں ہی وصول کرنا چاہیے، اس کا بھی ہمیں پورا خیال رکھنا چاہیے۔

اسی کو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے دو کھجوریں ساتھ لینے سے منع فرمایا۔ ہاں! ساتھی اگر اجازت دیں تو اس صورت میں کوئی بات نہیں۔ یا دوسری شکل یہ ہے کہ میزبان نے کھانے کا اتنی وافر مقدار میں انتظام کیا ہے کہ اگر آپ دو دو چار چار کھجوریں ایک ساتھ اُٹھائیں گے تب بھی کسی دوسرے کا حق ضائع ہونے والا نہیں ہے، جس کو جتنا چاہیے اتنا ملے گا، تو اس صورت میں بھی گنجائش ہے۔

باب مَا يقوله ويفعله من يأكل وَلاَ يشبع

کھانے سے سیری نہیں ہوتی؛ کیا کرے؟

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نیاباب قائم کیاہے کہ جو آدمی کھانا کھائے پھر بھی اس کا پیٹ نہ بھرتا ہو؛تو وہ کیا طریقہ اختیار کرے؟اوراس بے برکتی سے اپنے آپ کو بچانے کے لیے کیا کہے؟

الگ الگ کھانے کی نحوست:

حدیث ۷۴۳:-

عن وَحْشِيِّ بن حرب رضی اللہ عنہ أَنَّ أصحابَ رسولِ الله (ﷺ) قالوا: يَارسولَ اللهِ، إِنَّا نَأْكُلُ وَلاَ نَشْبَعُ ؛ قَالَ : فَلَعَلَّكُمْ تَفْتَرِقُونَ. قالوا : نَعَمْ. قَالَ: فَاجْتَمِعُوا عَلَى طَعَامِكُمْ، وَاذْكُرُوا اسْمَ اللهِ، يُبَارَكْ لَكُمْ فِيهِ. (رواه أبو داود)

ترجمہ:- حضرت وحشی بن حرب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنھم میں سے کچھ لوگوں نے آکر نبیٔ کریم (ﷺ) سے عرض کیا: یا رسول اللہ! ہم کھاتے ہیں اور پیٹ نہیں بھرتا (کھاتے ہیں لیکن ایسا معلوم ہوتاہے کہ جیسے بھوکے ہی ہیں)حضور (ﷺ) نے فرمایا: ایسا معلوم ہوتاہے تم لوگ الگ الگ کھاتے ہو؟(ساتھ میں مل بیٹھ کر نہیں کھاتے)انہوں نے کہا: جی ہاں !ایساہی ہے۔تو حضور (ﷺ) نے

فرمایا: ساتھ مل کر کھایا کرو (الگ الگ مت کھاؤ) اور کھاتے وقت اللہ کا نام لیا کرو، اس میں تمہیں برکت دی جائے گی۔

افادات:- پہلے بھی آچکا ہے کہ اگر آدمی شروع میں بسم اللہ نہیں پڑھتا، اللہ کا نام نہیں لیتا تو شیطان کھانے میں شریک ہوجاتا ہے اس کی وجہ سے برکت ختم ہوجاتی ہے۔ تو حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ دو کام کرنے ہیں، ایک تو شروع میں بسم اللہ پڑھو، اور دوسرا یہ کہ ساتھ میں مل کر کھاؤ، الگ الگ مت کھایا کرو، گویا بے برکتی سے بچنے کا یہ ایک طریقہ بتلایا۔

الأمر بالأکل من جانب القصعة والنهی عن الأکل من وسطها

برتن کے ایک طرف سے کھانے کا حکم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کھانے کا ایک اور ادب:

یہ بھی آداب میں سے ہے کہ برتن کے بیچ میں سے نہ کھائے، یا چاروں طرف ہاتھ نہ مارے؛اس لیے کہ اگر سب طرف سے کھائے گا اور کھانا بچے گا تو وہ اس قابل نہیں رہے گا کہ دوسرا آدمی اس کو استعمال کرے۔اور بہت سی مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ دوسرے لوگ ایسے کھانے کو استعمال کرنے سے کراہیت اور ناگواری محسوس کرتے ہیں اگر ایک طرف سے کھایا ہوگا تو جو کھانا بچا ہوا ہوگا وہ ایسا محسوس ہوگا کہ کسی نے اس کو کھایا نہیں ہے،اور دوسرے لوگ اس کو استعمال کرنا چاہیں گے تو کریں گے۔

دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ درمیان میں برکت نازل ہوتی ہے اب اگر برکت اترنے کی جگہ ہی آپ نے اُڑادی؛تو پھر برکت کہاں آئے گی؟جیسے: ہیلی کوپٹر کا جو ہیلی پیڈ ہوتا ہے ، وہی اگر آپ نے نکال دیا تو اب ہیلی کوپٹر کہاں اُترے گا؟ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ: برکت بیچ میں اترتی

ہے،اس لیے اس جگہ کو باقی رکھو،ورنہ برکت نہیں اترے گی۔اور یہ حضورِ اکرم (ﷺ) کی بتلائی ہوئی بات ہے،اس لیے اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے کہ بیچ میں ہی کیوں اترتی ہے، دوسری طرف کیوں نہیں اترتی؟

برکت برتن کے بیچ میں اترتی ہے:

حدیث ۷۴۴:-

وعن ابن عباس رضی اللہ عنہما عن النبیِ (ﷺ) قَالَ: البَرَكَةُ تَنْزِلُ وَسَطَ الطعَامِ؛ فَكُلُوا مِنْ حَافَتَيْهِ، وَلاَ تَأْكُلُوا مِنْ وَسَطِهِ. (رواہ أبو داود والترمذی)

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: برکت؛ کھانے کے بیچ میں اترتی ہے، اس لیے اس کے کناروں سے کھاؤ،بیچ میں سے مت کھاؤ۔

حدیث ۷۴۵: -

وعن عبد الله بن بُسْرٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: كَانَ للنَّبِيِّ (ﷺ) قَصْعَةٌ يُقَالُ لَهَا: الغَرَّاءُ يَحْمِلُهَا أَرْبَعَةُ رجالٍ؛ فَلَمَّا أَضْحَوْا وَسَجَدُوا الضُّحَى أُتِيَ بِتِلْكَ الْقَصْعَةِ؛ يعني وَقَدْ ثُرِدَ فِيهَا فَالتَفُّوا عَلَيْهَا. فَلَمَّا كَثُرُوا جَثَا رسول الله (ﷺ). فَقَالَ أعرابيٌّ: مَا هذِهِ الجِلْسَةُ؟ فَقَالَ رسولُ الله (ﷺ): إنَّ اللهَ جَعَلَنِي عَبْداً كَرِيماً، وَلَمْ يَجْعَلْنِي جَبَّاراً عَنِيداً. ثُمَّ قَالَ رسولُ الله (ﷺ): كُلُوا مِنْ حَوَالَيْهَا، وَدَعُوا ذِرْوَتَهَا؛ يُبَارَكْ فِيهَا. (رواہ أبو داود بإسنادٍ جيد)

((ذِرْوَتها)): أعْلاَهَا بكسر الذال وضمها.

ترجمہ:-حضرت عبد اللہ بن بسر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (ﷺ) کا ایک بڑا پیالہ تھا جس کا نام "غَرَّآء" تھا،وہ اتنا بڑا تھا کہ اس میں کھانا رکھنے کے بعد اس کو چار آدمی چار طرف سے اُٹھاتے تھے، اور کئی آدمی ایک ساتھ بیٹھ کر اس میں کھا لیا کرتے تھے۔ایک روز صبح لوگوں نے چاشت کی نمازادا کرلی تو وہ پیالہ لایا گیا اوراس میں ثرید تیار کیا گیا تھا (''ثرید'' یعنی گوشت کے شوربہ میں روٹیاں توڑ کر ڈال دی جائیں اوروہ نرم ہوجائیں ؛یہ ثرید کہلاتا ہے،جس کو ہم ''ملیدہ'' کہتے ہیں)اور لوگ اس کے اِرد گرد بیٹھ گئے۔جب زیادہ آدمی ہوگئے تو نبیٔ کریم (ﷺ) دوزانو سرسری نشست سے بیٹھ گئے(جب لوگ زیادہ ہوجاتے ہیں تو جگہ بھی تنگ پڑتی ہے اورلوگوں کو کھل کر جم کر بیٹھنے کی نوبت نہیں آتی۔تو آپ (ﷺ) بھی سرسری نشست سے بیٹھ گئے)ایک دیہاتی نے نبیٔ کریم (ﷺ) کو اس طرح بیٹھاہوا دیکھا تو کہنے لگا:یہ بیٹھنا کیسا ہے؟حضورِاکرم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مجھے شریف غلام بنایاہے،متکبر و سرکش نہیں بنایاہے(یعنی جم کر بیٹھنے والی اورزیادہ جگہ روکنے والی نشست اوربیٹھک سرکش اور متکبر لوگوں کی ہے)پھر حضور (ﷺ) نے فرمایا: اس کے کناروں پر سے کھاؤ،اوربیچ کا حصہ چھوڑ دو؛وہاں اللہ تعالیٰ کی طرف سے برکت نازل ہوتی رہتی ہے۔

کراھیة الأکل متکئاً

ٹیک لگا کر کھانے کا ناپسندیدہ ہونا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کھانے کے آداب کا بیان چل رہا تھا، ایک اور عنوان قائم کیا ہے کہ ٹیک لگا کر کھانے کا ناپسندیدہ اور مکروہ ہونا۔ چناں چہ روایت لائے ہے۔

کھانے کے لیے حضور اکرم (ﷺ) کی پسندیدہ بیٹھک:

حدیث ۷۴۶:-

عن أبي جُحَيْفَةَ وَهْبِ بن عبد الله رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رسولُ الله (ﷺ): لاَ آكُلُ مُتَّكِئاً. (رواہ البخاری)

قَالَ الخَطَّابِيُّ: المُتَّكِئُ هاهُنَا: هُوَ الجَالِسُ مُعْتَمِداً عَلَى وِطَاءٍ تحته. قَالَ: وأرادَ أنَّهُ لا يَقْعُدُ عَلَى الوِطَاءِ وَالوَسَائِدِ كَفِعْلِ مَنْ يُريدُ الإكْثَارَ مِنَ الطَّعَامِ، بل يَقْعُدُ مُسْتَوفِزاً لاَ مُسْتَوطِئاً، وَيأكُلُ بُلْغَةً. هَذَا كلامُ الخَطَّابِيِّ. وأشارَ غَيْرُهُ إِلَى أنَّ الْمُتَّكِئَ هُوَ المائِلُ عَلَى جَنْبِهِ. والله أعلم.

ترجمہ:- حضرت ابو جُحیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: میں ٹیک لگا کر نہیں کھاتا۔

افادات:- ٹیک لگانے سے کیا مراد ہے؟بعض حضرات نے ٹیک لگانے کا مطلب یہ بیان کیاہے کہ کوئی آدمی کھانے کے لیے دائیں طرف یا بائیں طرف جھک کر ٹیک لگائے ہوئے بیٹھے تواس کو''ٹیک لگانا'' کہیں گے، جس کو عربی میں ''إِتِّكَاء'' کہتے ہیں۔لیکن علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے علامہ خطابی رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے ایک مطلب ذکر کیا ہے کہ آدمی نیچے کوئی چیز بچھا کر جم کر بیٹھ کر کھائے۔جس آدمی کا ارادہ پہلے ہی سے زیادہ کھانے کا ہوتا ہے ،وہ یہ کوشش کرتا ہے کہ ذرااچھی طرح جم کر بیٹھے تاکہ برابر کھاسکے۔

دیکھو!پہلے سے زیادہ کھانے کی جونیت ہوتی ہےاس کواسلام پسند نہیں کرتا،نبیٔ کریم ﷺ کی تعلیم بھی یہ نہیں ہے،بلکہ ہمیں تو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ کھاناتو زندگی باقی رکھنے کے لیے بقدرِضرورت ہوتا ہے، اس لیے آدمی کھانے کواپنی زندگی کامقصود نہ بنائے۔جولوگ کھانے کو زندگی کا مقصودبنائے ہوئےہوتےہیں ان کامزاج اور سوچ ہی یہ ہوا کرتی ہے کہ اس طرح کھانےکے لیے بیٹھو کہ خوب اطمینان سے برابرجم کرکھانا وصول کرسکیں۔یہاں علامہ خطابی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اپنے نیچے کوئی اچھابچھونا بچھاکراورنرم چیز رکھ کرجم کر بیٹھنے سے نبیٔ کریم ﷺ نے منع فرمایا اور اس کو پسند نہیں کیا۔بلکہ کھانے کے لیے نبیٔ کریم ﷺ کی نشست اور بیٹھک سرسری ہواکرتی تھی اور آپ ﷺ جم کر نہیں بیٹھتے تھے، بلکہ ایک آدمی کوئی کام عجلت اور جلدی میں انجام دینا چاہتا ہو تو وہ جس طرح بیٹھتا ہے،اسی طرح بیٹھتے تھے۔جیسے: آپ کسی کے ساتھ عجلت میں بات کرنے کے لیے بیٹھتے ہیں تو اکڑو بیٹھ جاتے ہیں ،یا ایسی

بیٹھک ہوتی ہے کہ بس جلدی سے فارغ ہو کر اُٹھ جاؤں گا۔ معلوم ہوا کہ کھانے کے لیے بھی اسی انداز کی بیٹھک ہونی چاہیے کہ جس میں آدمی جم کر نہ بیٹھے، بلکہ سرسری نشست ہو۔ سرسری بیٹھک کو عربی میں "إِسْتِيْفَازْ" کہتے ہیں کہ اگر اُٹھنے کے لیے کہا جائے تو دیر نہ لگے۔ جب آدمی جم کر بیٹھتا ہے تو اُٹھنے میں ذرا تکلّف ہوتا ہے اور دیر لگتی ہے، اور جو سرسری نشست ہوتی ہے اس میں اُٹھنے میں دیر نہیں لگتی، بلکہ آدمی فوراً کھڑا ہو جاتا ہے۔ تو نبیِ کریم (ﷺ) کھانے کے لیے اسی طرح کی ہیئت، اور بیٹھک و نشست کو پسند فرماتے تھے کہ جس میں جم کر نہ بیٹھا جائے، اور زیادہ کھانے کا ارادہ بھی نہ ہو۔ اور آپ (ﷺ) بقدرِ ضرورت یعنی اتنا تھوڑا سا کھانا کھاتے تھے کہ جس سے آدمی کی جان بچ جائے اور ضرورت پوری ہو جائے، جس کو بقدرِ سدِّ رَمَق کہا جاتا ہے۔ ہمیں بھی یہی تعلیم دی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ کھانے کے لیے اس نوع کی بیٹھک اختیار کرنا جس میں پہلے ہی سے زیادہ کھانے کا ارادہ ہو اس کو نبیِ کریم (ﷺ) نے پسند نہیں فرمایا، اور اس سے آپ (ﷺ) نے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: "لَآ آكُلُ مُتَّكِئاً" میں ٹیک لگا کر نہیں کھاتا، یعنی جم کر بیٹھ کر نہیں کھاتا، بلکہ میرا کھانا سرسری نشست کے ساتھ بڑی عجلت میں ہوا کرتا ہے۔

ویسے بھی کھانا ایک طبعی ضرورت ہے جس کو آدمی پورا کرتا ہے، اس لیے آدمی کو چاہیے کہ اس میں اپنا زیادہ وقت صرف نہ کرے، بلکہ کم سے کم وقت میں اپنی اس ضرورت کو پوری کرلے۔

بیٹھک کا اصولی طریقہ:

حدیث ۷۴۷:-

وعن أنس رضی اللہ عنہ قَالَ: رَأَيْتُ رسولَ الله (صلی اللہ علیہ وسلم) جَالِساً مُقْعِياً يَأْكُلُ تَمْراً. (رواہ مسلم)

((المُقْعِي)): هُوَ الَّذِي يُلْصِقُ أَلْيَتَيْهِ بالأرض، وَيَنْصِبُ سَاقَيْهِ.

ترجمہ:- حضرت أنس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مَیں نے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو دیکھا کہ آپ اُکڑو بیٹھے ہوئے کھجور تناول فرمارہے تھے۔

افادات:- ”مُقْعِياً“ کا مطلب یہ ہے جیسا کہ خود علامہ نووی رضی اللہ عنہ نے اس کی تشریح فرمائی ہے کہ: آدمی اپنی سرین زمین کے ساتھ ملا کر پاؤں کی پنڈلیاں کھڑی کرکے بیٹھے، اس کو عربی میں ”إِقْعَاء“ کہتے ہیں، اسی کو ہم ”اُکڑو بیٹھنا“ کہتے ہیں۔

اب کھانے کے لیے بیٹھک کون سی ہونی چاہیے؟ تو اصولی طور پر علماء نے لکھا ہے کہ: آدمی کھانے کے لیے ایسی نشست اختیار کرے جس میں کھانے کا اکرام ظاہر ہوتا ہو۔ اگر ایک

آدمی کرسی پر ٹیک لگا کر پیچھے ہو کر اس طرح بیٹھتا ہے کہ گویا کھانے کی طرف سے استغناء اور بے فکری معلوم ہوتی ہے کہ وہ محتاج نہیں ہے بلکہ کھانا اس کی طرف آرہا ہے؛ اس کو پسند نہیں کیا گیا، بلکہ آدمی اس انداز سے بیٹھے جس سے یہ پتہ چلے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اس نعمت یعنی کھانے کا محتاج ہے، اور جس ہیئت میں زیادہ سے زیادہ تواضع وانکساری معلوم ہوتی ہو، ایسی ہی بیٹھک پسندیدہ ہے۔

اب بیٹھنے والوں اور جو کھانا رکھا جاتا ہے دونوں کی سطح اگر یکساں ہو تو زیادہ پسندیدہ ہے۔ چناں چہ زمین پر کوئی دستر خوان -چاہے وہ چمڑے، پلاسٹک، یا کپڑے کا ہو- بچھا کر اس پر کھانا رکھا جائے اور آدمی بھی زمین پر ہی بیٹھے، یعنی کوئی نرم بچھونا نہ بچھائے؛ یہ زیادہ پسندیدہ ہے۔ ہاں! کوئی باریک بچھونا بچھایا جائے جس سے آرام مقصود نہ ہو، بلکہ زمین کی گرد سے اپنے آپ کو بچانا مقصود ہو؛ تو اس میں کوئی حرج کی بات نہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ ایسی بیٹھک جس میں آدمی کی تواضع وانکساری کا پتہ چلتا ہو اور کھانے کی تعظیم و احترام معلوم ہوتی ہو، اس کو پسندیدہ قرار دیا گیا ہے۔ اسی وجہ سے زمین پر بیٹھ کر کھانے، اور کھانے اور کھانے والے کی سطح دونوں کے یکساں ہونے کو زیادہ پسندیدہ قرار دیا گیا ہے۔

علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق:

اب کھانے والے کی تواضع والی بیٹھک اور ہیئت کیا ہو؟ تو علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے شامی میں تین طرح کی بیٹھکیں ذکر کی ہیں :-

۱:-"اُکڑو" یعنی آدمی سرین پر بیٹھے اور گھٹنوں کو کھڑا رکھے؛اسی کو انہوں نے پہلا درجہ دیا ہے۔

۲:-"دو زانو" یعنی جیسے ہم نماز میں قعدہ کے اندر بیٹھتے ہیں ، لیکن اس میں یہ ہے کہ نماز میں بیٹھنے کے دوران تو بائیں پاؤں کو بچھا کر دائیں پاؤں کو کھڑا رکھتے ہیں ، اور کھانے کے لیے بیٹھنے میں دونوں پاؤں کو بچھایا جائے گا،اور ایک کی پشت دوسرے پر رکھ کر اور آگے کی طرف جھک کر بیٹھیں گے۔

۳:- اور تیسری ہیئت یہ ہے کہ بایاں پاؤں نیچے موڑ کر،اور دایاں پاؤں کھڑا رکھ کر بیٹھے۔

یہ تین ہیئتیں علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے ترتیب سے ذکر کی ہیں کہ یہ تینوں ہیئتیں گویا عاجزی و انکساری والی ہیں ، ان میں سے کوئی بھی اختیار کرے۔

ٹیبل کرسی پر کھانا کیسا ہے؟:

اب یہ بات آتی ہے کہ ٹیبل کرسی پر کھانا کیسا ہے؟تو پہلے زمانہ کے اندر وہ متکبرین کا شعار سمجھا جاتا تھا ،لیکن اب وہ بات باقی نہیں رہی،اس لیے نفس جائز ہونے میں توکوئی کلام نہیں ہے۔اسی لیے علماء فرماتے ہیں کہ کرسی ٹیبل پر کوئی آدمی کھائے گاتو وہ جائز ہے،البتہ اگر زمین پر بیٹھ کر کھائے گاتویہ نشست سنت سے زیادہ قریب ہے، اور اس میں انکساری پائی جاتی ہےاورثواب کاحق دار زیادہ ہوگا، اس لیے کبھی اگرٹیبل کرسی پربیٹھ کرکھانے کی نوبت آجائےتو اس کو منع نہیں کریں گے ،بلکہ اس کی گنجائش ہے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کاطرز:

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نےایک مرتبہ ٹیبل کرسی پر بیٹھ کر کھایا، اورچوں کہ اُس زمانہ میں ٹیبل کرسی کااتنا زیادہ چلن نہیں تھاجتناآج کل ہے،اوراُس وقت یہ متکبرین کا شعار سمجھا جاتاتھا،اس لیےحضرت نے ان کے تشبہ سے بچنے کے لیے ٹانگیں اوپر لے لیں ،یعنی کرسی کے اوپردونوں ٹانگیں لے لیں اور کھانا کھایا۔لیکن اب تو اس کی بھی ضرورت نہیں ہے، بلکہ جوازکی حیثیت سے اس کی بھی پوری گنجائش ہے۔باقی یہ ہے کہ سنت سے زیادہ قریب یہی ہے کہ آدمی زمین پر بیٹھ کر کھائے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

باب استحباب الأكل بثلاث أصابع واستحباب لعق الأصابع، وكراهة مسحها قبل لعقها واستحباب لعق القصعة وأخذ اللقمة الّتي تسقط منه وأكلها وجواز المسحه بعد اللعق بالساعد والقدم وغيرها

کھانے کا ایک ادب / تین انگلیوں سے کھانا:

اس باب میں کھانے کے چند اورآداب بتارہے ہیں۔ایک تو یہ کہ آدمی کھانا تین انگلیوں سے کھائے ، نبی ٔکریم (ﷺ) عام طور پر تین انگلیوں سے ہی کھانا کھاتے تھے ویسے چار سے بھی آپ کا کھانا ثابت ہے،اور ایک موقعہ پر آپ (ﷺ) نے پانچ انگلیاں بھی استعمال فرمائی ہیں، لیکن عام طور پر آپ تین انگلیوں سے ہی کھاتے تھے، بیچ کی انگلی، شہادت کی انگلی اور انگوٹھا۔ اور طبی اعتبار سے بھی اس کو اس لیے پسند قرار دیا گیاہے کہ اس میں لقمہ اتنا ہی بنتا ہے جو منھ میں جاکر اچھی طرح چبے گا اور ہاضمہ میں بھی سہولت رہے گی،جب کہ پانچ انگلیوں میں لقمہ بڑا ہوگا اور چبانے میں دیر لگے گی اور ہضم میں بھی پریشانی ہوگی، لیکن اس کے باوجود کسی آدمی کو پانچ انگلیوں کے بغیر چلتا ہی نہیں تو جائز ہے،لیکن اولیٰ یہ ہے کہ آدمی تین انگلیوں سے کھانے کی کوشش کرے۔

آج کل ہمارے زمانہ کے کھانے ایسے ہوتے ہیں جو اس زمانہ کے کھانے جیسے نہیں رہے، ہمارے زمانہ کے کھانے ذرا نرم قسم کے بنتے ہیں کہ اس کا لقمہ بنانے کے لیے پانچ انگلیاں استعمال میں لانی پڑتی ہیں۔ ویسے روٹی کا لقمہ اگر آپ تین انگلیوں سے لیں گے تو آسانی سے لقمہ بن جائے گا،اور کھچڑی تین انگلی سے لینے میں ذرا دشواری ہوجاتی ہے ،اس لیے اگر کوئی آدمی پانچ انگلیاں استعمال کرتا ہے تو جواز میں کوئی اشکال نہیں ہے۔

چھوٹے چھوٹے لقمے لینا:

دوسرا یہ ہے کہ چھوٹے چھوٹے لقمہ اگرلیں گے تو سیری جلدی ہوجائے گی یعنی آپ کی بھوک کا تقاضہ جلدی ختم ہوجائے گا، اسی طرح پانی پینے میں بھی اگر آپ چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیں گے تو سیری جلدی ہوجائے گی۔ گویا کم کھانے سے ضرورت پوری ہوجائے گی،اس لیے بھی یہ طریقہ پسندیدہ ہے۔

انگلیاں چاٹ لینا:

ایک اور ادب یہ بتلایاہے: انگلیاں چاٹنا۔اس لیے کہ جب آدمی کھانےسے فارغ ہوتا ہے تو انگلیوں پر بھی کچھ کھانا لگاہوارہ جاتا ہے، اگر ہاتھ دھونا ہے تو دھونے سے پہلے ،یا اگر کسی وجہ سے ہاتھ دھوتے نہیں ہیں ،بلکہ ٹیشو پیپر یاکسی اورچیز سے پونچھ رہے ہیں ،تواس صورت

میں بھی پہلے انگلیوں کو چاٹ لینا مستحب اور پسندیدہ ہے۔ دھونے یا پونچھنے سے پہلے انگلیاں نہ چاٹنے کی صورت میں کھانے کے وہ اجزاء جو انگلیوں پر رہ گئے ہیں، ان کو دھونے میں نکال دینا، یا پونچھنے میں ضائع کر دینا ناپسندیدہ ہے، کھانے کے ادب کے خلاف ہے۔ تو انگلیوں کا چاٹنا بھی آداب میں سے ہے۔

پرانا عیب؛ آج کا فیشن / لطیفہ:

جو لوگ جدید فیشن کے حامی ہوتے ہیں اور جنہوں نے اپنی زندگی کو فیشن ہی کے تابع بنا رکھا ہے، وہ کہتے ہیں کہ انگلیاں چاٹنا بظاہر کچھ ناشائستگی سی معلوم ہوتی ہے۔ تو پہلی بات تو یہ ہے کہ فیشن کیا چیز ہے؟ تو ذہن میں بٹھا لیجئے کہ فیشن کوئی چیز نہیں ہے، بلکہ فیشن کا حال تو یہ ہے کہ وہ بدلتا رہتا ہے، پہلے زمانہ میں جس کو عیب سمجھا جاتا تھا؛ آج وہی فیشن سمجھا جاتا ہے۔

حضرت مولانا عبد الباری صاحب ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک کتاب ’ مذہب اور سائنس ‘ نامی ہے، اس میں انہوں نے ایک لطیفہ لکھا ہے کہ انسان کا مزاج تغیر پسند ہے، پھر لکھا ہے کہ ایک آدمی نے کپڑا خریدا اور دوڑتا ہوا گھر جارہا تھا۔ کسی نے پوچھا: اتنی تیزی سے کیوں دوڑ رہے ہو؟ تو کہنے لگا: اس لیے دوڑ کر جا رہا ہوں کہ جلدی سے اس کو پہن لوں تاکہ ایسا نہ ہو کہ اس کو پہننے سے پہلے ہی فیشن بدل جائے۔

تو فیشن کا حال یہ ہے کہ بدلتا رہتا ہے۔اس لیے نبی کریم (ﷺ) نے جو طریقہ بتلایا ہے اسی پر ہمیں فخر کرنا چاہیے۔جو لوگ فیشن کو اور جدید طور وطریق کو پسند کرتے ہیں اس میں انہوں نے اپنے آپ کو ختم کردیا ہے، اپنا لباس بھی بدل دیا،اپنے آداب واطوار بدل دیئے، اپنا چہرہ مہرہ اور شکل وصورت تک بدل دی، اس کے باوجود یہ لوگ توراضی ہونے والے ہیں ہی نہیں: ﴿وَلَن تَرْضَىٰ عَنكَ الْيَهُودُ وَلَا النَّصَارَىٰ حَتَّىٰ تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ (البقرة:۱۲۰)﴾ باری تعالیٰ نے قرآنِ پاک میں فرمادیا ہے کہ یہود ونصاریٰ کبھی آپ سے خوش ہونے والے نہیں ہیں ،یہاں تک کہ آپ اپنا مذہب چھوڑ کر ان کا مذہب اختیار نہ کرلیں ، آپ اپنے مذہب پر باقی رہتے ہوئے کبھی ان کو خوش نہیں کرپائیں گے اس لیے ہمارے لیے تو نبی کریم (ﷺ) کا طریقہ ہی فخر کی چیز ہے۔ جیسے وہ لوگ فیشن پر فخر کرتے ہیں ،ہمیں سنتوں پر فخر کرنا چاہیے۔

فیشن کا حال !:

اور فیشن کا حال تو یہ ہے کہ پہلے جس چیز کو برا سمجھا جاتا تھاوہی چیز آج کل فیشن سمجھی جاتی ہے، جیسے:پہلے زمانہ میں کھڑے کھڑے کھانے کو عیب سمجھا جاتا تھا،لیکن آج کل بوفے سسٹم ایسا نکلا ہے کہ ہاتھ میں پلیٹ لے کر کھڑے رہو۔اور جب کھانا کھولا جاتا ہے تو سب ٹوٹ پڑتے ہیں اور چھینا جھپٹی ہوتی ہے ،اور ایک ہی پلیٹ میں ساری چیزیں ایک ساتھ لے کر

کھڑے کھڑے جانوروں کی طرح کھاتے ہیں ،اوراسی کو فیشن سمجھا جارہاہے۔یہ کون سا طریقہ ہے!پہلے اسی کو برا سمجھا جاتا تھا،لیکن آج یہی چیز اچھی سمجھی جارہی ہے۔

لباس کے معاملہ میں بھی دیکھ لیجئے کہ مرد جتنازنانہ بنتاجائے گا،وہ اچھا سمجھا جاتاہے اور عورت جتنی مردانی بنتی جائے اسی کوپسندیدہ سمجھتے ہیں۔یہ فیشن کا حال ہوگیا ہے۔امریکہ جانا ہوا تھاتووہاں دیکھاکہ لوگ بھوؤں میں سوراخ کرواتے ہیں ،اوربالی جیسا لٹکاتے ہیں ،زبان کے اندر سوراخ کرواکر اس کے اندر کڑا ڈالتے ہیں۔رخسار کے اوپر سوراخ کرکے بالی ڈالتے ہیں، اوریہ سب مرد کرتے ہیں۔مَیں نے پوچھا:یہ کیا مصیبت ہے؟توبتلایا کہ: آج کل یہی فیشن ہے۔

آنکھوں دیکھاواقعہ:

اوریہ فیشن اپنانے والے کیسے مست ہوتے ہیں ! مجھے خوب یاد ہے،بہت سال پہلے کا قصہ ہے کہ ایک مرتبہ میں دہلی گیاتھا، وہاں فتح پوری مسجد کے پاس چاندنی چوک ہے،مَیں وہاں گیا تومَیں نے دوچاریوروپین کودیکھاجنہوں نے بالکل عورتوں جیسا لباس پہنا ہوا تھا،کان میں بالیاں ڈالی ہوئی تھیں، گلے کے اندر کچھ دانے والی تسبیح وغیرہ لٹکائی ہوئی تھیں ،وہ بازارمیں سے گزر رہے تھے اورتمام دوکان والے ان کودیکھ کر ہنس رہے تھے ،لیکن ان کے اوپر ذرّہ برابر بھی کوئی اثر نہیں ہورہاتھا۔میں دیکھ کر سوچ رہا تھاکہ سب لوگ ان کودیکھ کر ہنس رہے ہیں لیکن ان کو کوئی پرواہ نہیں ہے، بلکہ اپنے لباس پراوراس ہیئت پران کواتنااطمینان اورشرح صدر

ہے کہ ساری دنیا ہنس رہی ہے پھر بھی وہ اپنے حال میں مست ہیں۔ اور ہمارا یہ حال ہے کہ ہم نبیِ کریم (ﷺ) کا طریقہ اپنا رہے ہیں اور کسی ایک نے کوئی بات کہہ دی تو اس کو چھوڑنے کے لیے تیار ہوجاتے ہیں، حالاں کہ سنتوں کو اپنانے کے معاملہ میں ہمارا مزاج یہ ہونا چاہیے کہ کوئی کچھ بھی کہے ہمیں اس کی بالکل پرواہ ہی نہ ہو۔

یہ دل و دماغ میں نوٹ کرلو:

حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ کا قصہ معروف ہے کہ وہ کسریٰ کے دربار میں تشریف لے گئے تھے، وہاں کھانا کھا رہے تھے، کھانے کے دوران لقمہ نیچے گر گیا، تو جیساکہ نبیِ کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا ہے کہ: لقمہ اگر گر جائے تو اس کو شیطان کے لیے نہ چھوڑو، بلکہ اس کو اُٹھاکر صاف کرکے کھا لو۔ چناں چہ جب انہوں نے اٹھا کر صاف کرکے کھانا چاہا تو آپ کے ساتھ آپ کا جو ایرانی خادم وغلام تھا، اس نے کہا کہ آقا! یہ چیزیں یہاں معیوب سمجھی جاتی ہیں، لوگ آپ کو ایسا کرتے ہوئے جب دیکھیں گے تو سوچیں گے کہ انہوں نے کبھی کھانا دیکھا بھی ہے یا نہیں؟ آپ کو نادیدہ کہیں گے۔ تو حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے جو جواب دیا تھا وہ ہمیں اپنے دل و دماغ میں نوٹ کرلینا چاہیے، فرمایا: "أَأَتْرُكُ سُنَّةَ حَبِيبِي لِهٰؤُلَاءِ الْحُمَقَاءِ؟" ان بے وقوفوں کے لیے مَیں اپنے حبیب کی سنت کو چھوڑدوں گا؟

نبیٔ کریم (ﷺ) کی ہر ہر سنت کو ہمیں اس تصور کے ساتھ اپنانا ہے کہ جس وقت ہم وہ سنت ادا کر رہے ہوں تو یہ سوچیں کہ ہم اللہ تبارک وتعالیٰ کی نگاہوں میں محبوب ہیں ﴿قُلْ إِنْ كُنتُمْ تُحِبُّونَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ﴾ باری تعالیٰ فرماتے ہیں : اے نبی! آپ کہہ دیجئے کہ اگر تم لوگ اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو، میرے طریقوں پر چلو، میری سنتیں اپناؤ؛ تو اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے گا۔ جس وقت ہم نبیٔ کریم (ﷺ) کی سنت پر عمل کر رہے ہوں تو یہی تصور اپنے دل ودماغ میں تازہ رکھنا چاہیے کہ ہم حضور (ﷺ) کے طریقے کو اپنا رہے ہیں، تو اس وقت ہم اللہ تعالیٰ کے محبوب ہیں۔ تو جب اللہ تعالیٰ کی نگاہوں میں محبوب ہیں تو اب ساری دنیا ہمیں کچھ بھی سمجھتی ہو اور کچھ بھی کہتی ہو، ہمارا مذاق اُڑاتی ہو؛ اس سے ہمیں کیا فرق پڑتا ہے!

لوگ سمجھیں مجھے محرومِ وقار و تمکیں
پروہ نہ سمجھیں کہ مری بزم کے قابل نہ رہا

ہمیں تو اللہ تعالیٰ کے یہاں عزت چاہیے، ان دنیا داروں کی عزت کا کیا ہے ، آج اگر کسی نے واہ واہ کر بھی دی، تو اس سے ہماری کون سی دنیا بن جانے والی ہے، اور کون سی دولت گھر میں آجانے والی ہے! اس لیے اس کا خاص اہتمام ہونا چاہیے۔

ایک بزرگ کا عمل:

انگلیوں کو چاٹنے سے پہلے دھولینا، یا پونچھ لینا نا پسندیدہ ہے، اس لیے کہ اس میں غذا ضائع ہوتی ہے۔ ہمارے اکابر میں سے حضرت قاری فتح محمد صاحب پانی پتیؒ تھے ان کے متعلق لکھا ہے کہ کھانے کے بعد کلی کے لیے پانی منھ میں لے کر اس کو بھی نگل لیتے تھے، تاکہ غذا کے جو اجزاء منھ کے اندر ہیں وہ بھی ضائع نہ ہوں۔ ہم لوگ تو پہلی کلی کا پانی منھ سے باہر نکال دیتے ہیں، اور وہ پہلی کلی کا پانی باہر نہیں نکالتے تھے بلکہ پی جاتے تھے؛ تاکہ غذا کے وہ اجزاء بھی بے کار نہ جائیں۔

پلیٹ صاف کرنے والے ادب کی تفصیل:

اسی طرح کھانے کے برتن کو بھی صاف کرلینا اور چاٹ لینا پسندیدہ ہے۔ لیکن یہ اس وقت ہے جب کہ آپ نے غذا پوری کرلی ہو۔ پہلے تو یہ ہے کہ آدمی شروع ہی سے اپنی پلیٹ کے اندر اندازہ لگا کر کھانے کی اتنی ہی مقدار نکالے جس کے متعلق اس کا خیال یہ ہو کہ مَیں اس کو آسانی سے پورا کرلوں گا۔ پھر جب کھانا پورا ہو جائے تو اب پلیٹ کے اندر کھانے کے جو اجزاء چپکے ہوئے ہیں، ان کے متعلق شریعت اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ ان کو ضائع ہو جانے دے، بلکہ ان کو بھی صاف کرلو۔ اس کی وجہ آگے حدیث کے اندر آرہی ہے، لیکن اگر پلیٹ

میں پہلے ہی سے کھانا زیادہ ہے اور اسی میں سے کھانے کے لیے کہا گیا ہے تو اس صورت میں پہلا طریقہ جو بتلاچکاہوں کہ ہمیں اپنے سامنے سے کھاناچاہیے،تواب اپنے سامنے کی جگہ کواچھی طرح صاف کرلیا جائے اورباقی کھانااس انداز سے چھوڑا جائے کہ دوسراآدمی اگراس کوکھاناچاہے تواس کی طبیعت کوناگواری محسوس نہ ہو۔

بعض لوگ سمجھتےہیں کہ پلیٹ میں جتناکھاناہووہ سب پوراہی کیاجائے۔ حالاں کہ ایسا ضروری نہیں ہے،بلکہ اصل سنت یہ ہے کہ اگر آپ پلیٹ کاکھاناپورا کرچکےہیں ، تواب کھانے کے جواجزاء پلیٹ کے اندرچپکے رہتے ہیں اس کوصاف کرلیجئے۔ایسانہیں ہے کہ اگر پلیٹ میں ایک کلو ہے تو ایک کلو کھانا ہی پڑے گا،چاہے آپ کی طاقت ہویا نہ ہو۔

ایک قصہ:

کئی سال پہلے کا قصہ ہے، ایک مرتبہ گنگوہ جانا ہوا، ہم لوگ رات میں دیرمیں پہنچے تھے، وہاں معلوم کیاکہ کوئی ہوٹل ہے؟ایک پراناہوٹل ملا، وہاں کھانےکے لیے گئے۔ہم سب بھوکے تھے،کھانے کے لیے بیٹھے۔جب کھانا آیا تواس کو پورا نہیں کرسکے،پلیٹ میں کھانابچ گیا۔وہاں کے دیہاتی لوگ بیٹھے ہوئے تھے،وہ یوپی کی دیہاتی اندازمیں کہنے لگے:اجی مولوی جی!تم نے پلیٹ کو صاف نہیں کیا؟ مَیں نے کہا:یہ کھانا ہی ہم سے پورا نہیں ہوا؛ تو صاف کرنے کا کیامطلب!اس لیے کہ پلیٹ صاف کرنےکامطلب تو یہ ہوتاہے کہ پلیٹ کاکھانااگرہم پورا

کرلیتے اور چند دانے بچ جاتے تو ان کو صاف کرنا مستحب ہے، باقی اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ پلیٹ کے اندر جتنا کھانا آیا ہے وہ سب پورا ہی کیا جائے۔اس پر ایک دیہاتی کہنے لگا: اجی یہ مولوی تو باتیں بناوے ہے۔ خیر! تو اصل مسئلہ اپنی جگہ پر یہی ہے کہ جب پلیٹ کا بڑا حصہ کھا چکے ہیں تو اب اس کے اندر جو اجزاء رہ گئے ہیں ان کو صاف کرلیا جائے،اس لیے کہ ہوسکتا ہے کہ اسی میں برکت ہو۔

"وأخذ اللقمة الّتي تسقط منه وأكلها" اسی طریقہ سے وہ لقمہ جو کھانے کے درمیان ہاتھ سے گر جائے، تو اس کو اُٹھالینا اور صاف کرکے کھا لینا بھی مستحب ہے۔

"وجواز مسحها بعد اللعق بالساعد والقدم" اور آدمی کھانے سے فارغ ہو کر اپنی انگلیاں چاٹ چکا ہے، اور دھونے کے لیے پانی موجود نہیں ہے، یا ہاتھ بہت زیادہ ملوث نہیں ہوئے ہیں، جیسے: کبھی ہم کسی ہوٹل میں ناشتہ کرتے ہیں، چائے بسکٹ وغیرہ کھالیے؛ تو ہاتھ دھونے کی ضرورت نہیں ہوتی، تو ایک ہاتھ کو دوسرے میں مل کر صاف کرلیتے ہیں، یا پیر سے صاف کرلیں ؛ تو اس میں کوئی حرج کی بات نہیں ہے

انگلیاں چاٹنا اور چٹوانا:

حدیث ۷۴۸:-

عن ابن عباس رضی اللہ عنھما قَالَ قَالَ رسولُ الله (ﷺ) :إِذَا أَكَلَ أَحَدُكُمْ طَعَاماً فَلاَ يَمْسَحْ أَصَابِعَهُ حَتَّى يَلْعَقَهَا أَوْ يُلْعِقَها. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: جب تم میں سے کوئی آدمی کھانا کھا چکے، تو اپنی انگلیوں کو نہ پونچھے جب تک اس کو خود چاٹ نہ لے، یا کسی کو چٹوا نہ لے۔

افادات:- بچے؛ بڑوں کی انگلیاں چاٹنا اپنی سعادت سمجھتے ہیں، جیسے: چھوٹے بچوں کو ماں اپنی انگلیاں چاٹنے کے لیے دیتی ہے، تو وہ بڑی خوشی سے چاٹتے ہیں، تو آپ خود اپنی انگلیاں چاٹ لیجیے، یا پھر کوئی ایسا ہو جو آپ کی انگلیاں چاٹنا اپنی سعادت سمجھتا ہو؛ اس سے چٹوا لیجیے۔ یا کوئی پالتو جانور بلی وغیرہ ہے، اور وہ آپ کے ساتھ رلی ملی ہوئی ہے، اگر اس کو دیں گے تو وہ صاف کر لے گی، تو اس سے صاف کروا لیجیے مطلب یہ ہے کہ انگلی کے اوپر کھانے کے جو اجزاء لگے ہوئے ہیں، ان کو آپ بے کار نہ جانے دیں، بلکہ ان کو خود کام میں لے لیں، یا کسی اور کے کام میں آجائیں۔

حدیث ۷۴۹:-

وعن كعب بن مالك رضی اللہ عنہ قَالَ: رأيتُ رسولَ الله (ﷺ) يَأْكُلُ بِثَلاَثِ أصابعَ، فإذا فرَغَ لَعِقَهَا. (رواہ مسلم)

ترجمہ:-حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبیٔ کریم (ﷺ) کو دیکھا کہ آپ تین انگلیوں سے کھارہے تھے، اور جب آپ کھانے سے فارغ ہوئے تو آپ نے تین انگلیوں کو چاٹ لیا۔

افادات:-چاٹنے میں ترتیب یہ ہے کہ پہلے درمیان کی انگلی کو، پھر شہادت کی انگلی کو،اور پھر انگوٹھے کوچاٹیں گے۔

حصولِ مقاصد کانام برکت ہے:

حدیث ۷۵۰:-

وعن جابر رضی اللہ عنہ أنَّ رسول الله (ﷺ) أمر بلعق الأصابع والصحفة، وقال: إنَّكُمْ لاَ تَدْرُونَ فى أيِّ طَعَامِكُمُ البَرَكَةُ. (رواہ مسلم)

ترجمہ:-حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (ﷺ) نے انگلیوں کو بھی چاٹنے کا حکم دیا اور پلیٹ کو صاف کرنے کا بھی حکم دیا(یہ دونوں ادب پہلے بتا چکاہوں۔اور اس کی وجہ یہ بتائی)اس لیے کہ تمہیں معلوم نہیں کہ برکت کھانے کے کون سے حصے میں ہے۔

افادات:-ہوسکتا ہے کہ کھانے کاوہ حصہ جو تمہاری انگلیوں کے اوپرلگاہواہے اسی میں برکت ہو۔

برکت کیا چیز ہے؟اوربرکت کا مطلب کیاہے؟برکت کامطلب یہ ہے کہ آدمی جس مقصد کے لیے کھانا کھا رہا ہے وہ مقصد اس کو حاصل ہو۔ہر چیز میں یہی قاعدہ ہے۔جیسے:ایک آدمی

کماتا ہے، محنت مزدوری کرتا ہے،اور پیسے اس لیےلاتا ہے تاکہ محنت مزدوری سے حاصل کی ہوئی کمائی سے اس کی ضرورتیں پوری ہوں۔ اگر اس کی ضرورتیں پوری نہیں ہورہی ہیں تو وہ لوگوں سے کہتا ہے کہ میری کمائی میں برکت نہیں ہے۔بھائی! کیسے معلوم ہوا کہ برکت نہیں ہے؟ تو کہتاہے کہ: میری ضرورتیں پوری نہیں ہوتیں۔تو جو کام جس مقصد کے لیے کیا جاتا ہے،اگر وہ مقصد اس سے پورا حاصل ہوجائے ؛ اسی کا نام برکت ہے۔

جیسے: آپ ملازمت کرتے ہیں اورآپ کو تنخواہ پانچ ہزار روپے ملتی ہے، لیکن ان سے آپ کی ضرورتیں پوری نہیں ہوتیں ،یہ پانچ تو ختم ہوجاتے ہیں اورآپ لوگوں سے مانگتے پھرتے ہیں ،اورآپ کی ضرورتیں باقی رہتی ہیں، تویوں سمجھاجائے گا کہ آپ کی کمائی میں برکت نہیں ہے۔لیکن اگر آپ پانچ سو تنخواہ لاتے ہیں لیکن اس سے آپ کی ضرورتیں پوری ہوجاتی ہیں، تواس صورت میں یوں کہاجائے گا کہ آپ کی کمائی میں برکت ہے۔اس فرق کواچھی طرح سمجھنااوردل نشین کرناچاہیے۔

توکھانے کی برکت کامطلب یہ ہے کہ کھاناجن مقاصد کے لیے کھایا جاتا ہے اس میں نمبراول پر یہ ہے کہ آدمی اپنی بھوک مٹائے،اس کے بعد دوسرامقصدیہ ہے کہ کھا کر لذت حاصل کرےاور راحت پائے، پھر یہ کھانا پیٹ میں جائے اوراس سے خون بنے، اور اس کو

طاقت حاصل ہو، اور پیٹ میں جاکر وہ ہضم ہو۔تو یہ ساری چیزیں کھانے کے مقاصد میں سے ہیں ،لہٰذا اگر یہ ساری چیزیں حاصل ہو ں تو کہا جائے گا کہ کھانے میں برکت ہے۔

لیکن کوئی آدمی کھا رہا ہے اور اس سے اس کو شکم سیری ہو ہی نہیں رہی ہے ، پیٹ بھر ہی نہیں رہاہے،تو یوں کہیں گے کہ اس کے کھانے میں برکت نہیں ہے۔یا پیٹ تو بھر گیا لیکن بد ہضمی ہو گئی،اس کھانے سے خون بننا چاہیے تھا لیکن نہیں بنا،تب بھی کہا جائے گا کہ برکت نہیں ہوئی۔اس سے جو راحت پہنچنی چاہیے تھی وہ نہیں پہنچی، بلکہ کھانے کے بعد پیٹ میں درد ہو گیا،کوئی بیماری ہو گئی،تو یہ بے برکتی ہی ہے۔یا اس سے جو طاقت حاصل ہونی چاہیے تھی وہ نہیں ہوئی،ڈاکٹر کہتے ہیں کہ تمہارے پیٹ میں جو کھانا جاتا ہے وہ ویسے ہی نکل جاتا ہے،اس سے بدن کو جو فائدہ ملنا چاہیے وہ نہیں ملتا،تو یہ بے برکتی ہے۔خلاصہ یہ ہوا کہ کھانا جن مقاصد کے لیے کھایا جاتا ہے، وہ مقاصد پورے طور پر حاصل ہوں ؛اسی کا نام برکت ہے۔

حصولِ اسباب اصل نہیں :

آج کل ہم مادیت اور اسباب کے ایسے غلام بن گئے ہیں کہ ہماری نگاہوں میں مادّہ ہی مادّہ اور اسباب ہی سب کچھ ہیں ،اسی کے اِردگرد ہماری سوچ گھومتی رہتی ہے،چیزوں کے جو حقائق ہیں اس کی طرف سے ہم غفلت برتتے ہیں،حالاں کہ اسباب مقصود نہیں ہیں ،بلکہ اسباب جس چیز کے لیے مہیا کیے جاتے ہیں،وہ اصل مقصود ہے۔اگر آپ نے اسباب مہیا کیے لیکن اصل

مقصود حاصل نہیں ہوا، تو کچھ حاصل نہیں ہوا۔ جیسے: آپ نے مکان بنوالیا،اور اس میں کمرہ بھی بہترین اورشاندار بن گیا، اوراس کے اندر شاندار مسہری بھی آپ نے بچھوادی،اس کے اوپراچھاساگدّالگوادیا،بہترین چادر اور تکیے بھی لگوادیئے، کمرے کا پورا فرنیچر بھی ایساشاندار ہے جس کو دیکھ کر کمرہ میں جی لگتا ہے، A.C بھی لگالیا،یہ سب انتظامات کیے؛ لیکن رات کو سوتے ہیں تو نیندہی نہیں آتی،اب نیند کا کیاکریں گے؟ حالاں کہ یہ سب اس لیے کیا جاتا ہے تاکہ ہمیں راحت ملے اور نیند پوری حاصل کرکے ہم اپنے جسم میں نشاط کی کیفیت پاویں ،اپنی اس ضرورت کو پورا کریں،اب یہ سارے اسباب تومہیاکرلیے،لیکن نیند ہمارےاختیار میں نہیں ہے،وہ اللہ تعالیٰ ہی دیتے ہیں ، اللہ تعالیٰ چاہے گا تواپنی یہ نعمت عطا فرمائے گا، ورنہ سارےاسباب کے ہوتے ہوئے بھی وہ چیز آپ کو حاصل نہیں ہوگی۔

آپ نےمال خوب کمالیااورشاندارسے شاندارچیزیں خریدیں ،اچھاباورچی لائے،اچھاسے اچھا کھانا پکوایا،دسترخوان پرانواع واقسام کے کھانے لگوادیئے، یہ سب کرکے جب کھانے کے لیے بیٹھے توبھوک ہی نہیں لگتی؛اب بھوک کہاں سے لاؤگے؟ بھوک تواللہ تعالیٰ ہی ڈالتاہے۔یابھوک تولگی اور کھانابھی کھایا،لیکن ہضم نہیں ہوتا اوراس سے خون نہیں بنتا۔

تومعلوم ہواکہ ان چیزوں کے جو مقاصد ہیں وہ حاصل ہوں ؛اسی کا نام برکت ہے۔اگر آدمی ملازمت یا تجارت وکاروبار کرکے خوب مال ودولت اورپیسے کمائے،تویہ سب اسباب ہوئے،

ان سب کے بعد جو اصل چیز ہے وہ تو اللہ تعالیٰ ہی کے اختیار میں ہے ،ان سب کے بعد بھی اگر اللہ تعالیٰ چاہے گا تو وہ چیز حاصل ہو گی؛ ورنہ نہیں ہو گی۔

یہ بے برکتی نہیں تو اور کیا ہے؟:

تو حضورِ اکرم (ﷺ) فرماتے ہیں کہ تمہیں معلوم نہیں کہ برکت کس میں ہے؟ تم چاہتے ہو کہ اس کھانے کے ذریعہ سے تمہارا مقصد حاصل ہو؟ اس کھانے سے تمہیں قوت ملے ؟خون بنے؟ اور اس سے تمہاری صحت مضبوط ہو؟ یہ سب چاہتے ہو تو حضور (ﷺ) کی اس ہدایت پر عمل کرو کہ اگر تمہاری انگلیوں پر کھانے کے ذرّات لگے ہوئے ہیں تو ان کو چاٹ لو،ضائع نہ جانے دو۔ پلیٹ کے اندر کھانے کے ذرّات بچے ہوئے ہیں، اس کو صاف کرلو؛ ہو سکتا ہے کہ برکت اسی میں ہو۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطائے برکت کا جو فیصلہ کیا جاتا ہے کہ اس کھانے پر اس کے اثرات اور مقاصد کا مرتب ہونا؛ وہ دراصل اللہ تعالیٰ کی نعمت کی قدردانی پر ہوتا ہے، جو آدمی ان ذرّات کو ضائع کرتا ہے ، گویا وہ اللہ تعالیٰ کی نعمت کی ناقدری کرتا ہے، اور جو ناقدری کرے گا تو قاعدہ ہے ﴿وَلَئِن كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ. (ابراھیم:7)﴾ اگر ناشکری کروگے تو میرا عذاب بڑا سخت ہے۔ تو اس سے بڑا سخت عذاب اور کیا ہو گا کہ آدمی کھانا کھائے اور اس سے جو مقصد ہے وہ حاصل نہ ہو۔ یہ بے برکتی نہیں تو اور کیا ہے ؟

اگر برکت حاصل کرنا چاہتے ہو تو...:

اس لیے نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) فرماتے ہیں کہ تمہیں معلوم نہیں کہ کھانے کے کون سے حصے میں برکت ہے۔اور یہ برکت حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے طریقہ کو اپنانے ہی کی وجہ سے ہوتی ہے۔ اگر فیشن کے پیچھے پڑا رہے گا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ سب کچھ ہوگا لیکن برکت نہیں ہوگی۔ پھر وہ ڈاکٹروں کے چکر وں میں پڑا رہتا ہے،اور کہتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب ! کھانا ہضم نہیں ہوتا، خون نہیں بنتا، جسم میں قوت وطاقت نہیں آتی۔ارے بھائی!پہلے یہ سب کرلو، نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جو ہدایتیں دی ہیں، کھانے کی برکت جس چیز سے حاصل ہوتی ہے؛ وہ کرلو،تو پھر ان شاء اللہ کسی ڈاکٹر کے پاس جانے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئے گی۔

لقمہ گر جائے تو اُٹھالو:

حدیث ۱۵۷:-

وعنه أنَّ رسول الله (صلی اللہ علیہ وسلم) قَالَ: إِذَا وَقَعَتْ لُقْمَةُ أَحَدِكُمْ، فَلْيَأْخُذْهَا فَلْيُمِطْ مَا كَانَ بِهَا مِنْ أَذىً، وَلْيَأْكُلْهَا، وَلاَ يَدَعْهَا لِلشَّيْطَانِ، وَلاَ يَمْسَحْ يَدَهُ بِالْمِنْدِيلِ حَتَّى يَلْعَقَ أَصَابِعَهُ، فَإِنَّهُ لاَ يَدْرِى فِى أَيِّ طَعَامِهِ الْبَرَكَةُ. (رواه مسلم)

ترجمہ:-حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: لقمہ اگر گر جائے تو اس کو اُٹھا لو ،اور جو کچھ گرد وغبار لگا ہو اس کو صاف کرلو اور کھالو، شیطان کے لیے نہ چھوڑدو،اور کھانے سے

فارغ ہونے کے بعد رومال سے ہاتھ نہ پونچھو یہاں تک کہ انگلیوں کو چاٹ لو ، اس لیے کہ معلوم نہیں کہ کھانے کے کون سے حصے میں برکت ہے۔

حدیث ۷۵۲:-

وعنه أنَّ رسول الله (ﷺ) قَالَ : إنَّ الشَّيْطَانَ يَحْضُرُ أحَدَكُمْ عِنْدَ كُلِّ شَيْءٍ مِنْ شَأْنِهِ، حَتَّى يَحْضُرَهُ عِنْدَ طَعَامِهِ، فَإذَا سَقَطَتْ لُقْمَةُ أحَدِكُمْ فَلْيَأْخُذْهَا فَلْيُمِطْ مَا كَانَ بِهَا مِنْ أذىً، ثُمَّ لِيَأْكُلْهَا وَلاَ يَدَعْهَا لِلشَّيْطَانِ فَإذَا فَرَغَ فَلْيَلْعَقْ أصَابِعَهُ، فَإنَّهُ لاَ يَدْرِي فِي أيِّ طَعَامِهِ البَرَكَةُ. (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: شیطان تمہاری ہر ہر چیز میں حصہ لگانے کے لیے تمہارے پاس آجاتا ہے، یہاں تک کہ کھاتے وقت بھی تمہارے پاس آتا ہے، لہٰذا جب کوئی لقمہ گر جائے تو اس پر سے مٹی وغیرہ کو صاف کر کے پھر اس کو کھالیا کرو، اس لقمہ کو شیطان کے لیے مت چھوڑو، اور جب کھانے سے فارغ ہو جاؤ تو اپنی انگلیوں کو چاٹ لو، اس لیے کہ معلوم نہیں کہ کھانے کے کون سے حصے میں برکت ہے۔

افادات:- جو لقمہ گرا ہے وہ اگر اتنا زیادہ خراب اور گرد وغبار میں ملوث ہو گیا ہو کہ صاف کر کے بھی کھانا ممکن نہیں ہے، تو اس کو چھوڑ دینے کی اجازت ہے، لیکن پھر بھی کوشش یہ ہو کہ وہ کسی جانور چیونٹی وغیرہ کو کھلا دیا جائے، اس کو ویسے ہی چھوڑ دینا کہ اس سے کسی کو بھی فائدہ نہ پہونچے، یہ گویا شیطان کے لیے چھوڑنا ہوا؛ اس لیے حضورِ اکرم (ﷺ) نے اس سے منع فرمایا ہے۔

یاکوئی ایسی چیز گری ہے جس کواُٹھاکر کھانا ممکن ہی نہیں ، جیسے: شوربہ گرگیا تو اس کوکیسے اُٹھایاجاسکتاہے، لہٰذاوہاں توکوئی سوال ہی پیدانہیں ہوتا۔ لیکن اگر صاف کرکے فائدہ اُٹھانا ممکن ہے، جیسے:روٹی کاٹکڑاہے کہ اس کو آسانی سے اُٹھاکرصاف کرسکتے ہیں؛توصاف کرکے کھالینا چاہیے۔ اگراُٹھاکر نہیں کھائے گاتویہ تکبر کی علامت اوراللہ تعالیٰ کی نعمت کی ناقدری ہے،گویا اسے شیطان کے لیے چھوڑنا ہے ؛تو پھر برکت نہیں رہے گی۔

حصولِ برکت کے لیے ان چیزوں کااہتمام کرو:

حدیث ۷۵۳:-

عن أنسٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: كَانَ رسولُ الله (صلی اللہ علیہ وسلم) إِذَا أَكَلَ طَعَاماً ، لَعِقَ أَصَابِعَهُ الثَّلاَثَ، وقال: إِذَا سقطَتْ لُقْمَةُ أحدِكُمْ فَلْيَأْخُذْهَا، وَلْيُمِطْ عنها الأذى، وَلْيَأْكُلْهَا، وَلاَ يَدَعْهَا لِلشَّيْطَانِ. وأَمَرَنَا أَنْ نَسْلُتَ القَصْعَةَ، وقال: إِنَّكُمْ لاَ تَدْرُونَ فِي أَيِّ طَعَامِكُمُ البَرَكَةُ. (رواه مسلم)

ترجمہ مع تشریح:- حضرت أنس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی ٔکریم (صلی اللہ علیہ وسلم) جب کھاناتناول فرمالیتے تھے تو (کھانےسے فارغ ہونے کے بعدہاتھ دھونے سے پہلے یا رومال وغیرہ سے پونچھنے سے پہلے)اپنی تینوں انگلیوں کو چاٹ لیاکرتے تھے(تاکہ کھانے کے بچےہوئےاجزاء ہاتھ پرلگےنہ رہ جائیں ،اوردھونے کی وجہ سے ضائع نہ چلے جائیں،اس کی وجہ وہی ہے کہ کھانے کے کون سے حصہ میں برکت ہے یہ ہمیں معلوم نہیں، لہٰذا آدمی کو اس بات کاحریص ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے دانہ دانہ پرجو برکتیں رکھی ہیں ان کوحاصل کرے) اور حضورِاکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یہ بھی ارشاد فرمایاکہ: کھانے کے دوران اگرلقمہ گرجائے،تواس کو اُٹھالو،اوراس

پر جو بھی گرد وغیرہ لگی ہے اس کو دور کرلو، اوراس کو کھالو، اس کو شیطان کے لیے نہ چھوڑدو(اگر اس کو ویسے ہی چھوڑدیں گے تو وہ ضائع ہوجائے گا، گویا شیطان اس سے فائدہ اُٹھالے گا) اور حضورِاکرم (ﷺ) نے ہمیں یہ بھی حکم دیا کہ پیالے کو صاف کرلو(پھر آخر میں آپ (ﷺ) نے اس کی وجہ بھی بتلائی کہ اوپر جتنے بھی احکام و آداب بتائے گئے وہ اس لیے ہیں کہ) کھانے کے کون سے حصے میں اللہ تعالیٰ نے برکت رکھی ہے یہ ہمیں معلوم نہیں ہے(تو اس برکت کو حاصل کرنے کے لیے ہمیں ان چیزوں کا اہتمام کرنا چاہیے)

''وُضُوءِ مِمَّامَسَّتِ النَّار''کامسئلہ:

حدیث ۷۵۴:-

وعن سعيد بنِ الحارث: أنّه سأل جابراً رضی اللہ عنہ عنِ الوُضُوءِ مِمَّامَسَّتِ النَّارُ، فَقَالَ: لا. قَدْ كُنَّا زَمَنَ النبيِّ (ﷺ) لانَجِدُ مِثْلَ ذٰلِكَ الطّعامِ إلاَّ قليلاً، فإذا نَحْنُ وجَدْنَاهُ، لَمْ يَكُنْ لنا مَنَادِيلُ إلاَّ أكُفَّنا، وسَوَاعِدَنَا، وأقْدامَنَا، ثُمَّ نُصَلِّي وَلاَنَتَوَضَّأُ. (رواه البخاری)

ترجمہ:- حضرت سعید بن حارث نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے جو چیز آگ پر پکائی گئی ہو اس کو کھانے کے بعد وضو کرنے کے متعلق پوچھا۔تو انہوں نے کہا: اب ایسا نہیں ہے ، نبیِّ کریم (ﷺ) کے زمانہ میں ایسا کھانا ہمیں بہت کم میسر ہوتا تھا(مطلب یہ ہے کہ اس زمانہ میں عام طور پر کھجوروں پر گزارہ ہوتا تھا، یا دودھ پی لیا اور کھجور استعمال کرلی۔پکا ہوا کھانا، گوشت یا روٹی وغیرہ چیزیں بہت کم میسر ہوتی تھی)اور جب کبھی ہمیں یہ ملتا تھا تو کھانے سے فارغ ہونے کے بعد ہاتھ پر اس کھانے کا جو اثر لگا ہوتا تھا اس کو صاف کرنے کے لیے بھی ہمارے پاس رومال نہیں ہوتے تھے،بس یہی ہماری ہتھیلیاں اور بازو اور پیر ہوتے

تھے، اسی پر ہم اپنے ہاتھ کی چکنائی کو صاف کر لیتے تھے (پہلے بتا چکا ہوں کہ کوئی ایسی چیز کھائی ہے کہ جس کی وجہ سے ہاتھ زیادہ ملوث نہیں ہوئے ہیں تو اس صورت میں کوئی آدمی ہاتھ نہ دھوئے، اور رومال سے، یا ہتھیلی پر، یا بازوؤں پر، یا پاؤں کے تلوؤں پر مَل لے، تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے) اور اسی حالت میں ہم نماز پڑھ لیتے تھے، نیا وضو نہیں کرتے تھے۔

افادات:- شروع اسلام میں یہ حکم تھا کہ آگ پر پکی ہوئی چیز کو اگر آدمی کھائے تو اس کے بعد اس کو وضو کرنا پڑتا تھا، گویا اس سے اس کا وضو ٹوٹ جایا کرتا تھا، اس لیے شریعت کا یہ حکم تھا کہ آدمی دوبارہ وضو کرے، پھر نماز پڑھے، لیکن بعد میں یہ حکم باقی نہیں رہا۔ اب اگر آگ پر پکی ہوئی چیز کوئی آدمی استعمال کرتا ہے تو اس کے بعد پانی وغیرہ سے اپنا منھ صاف کرلے، تاکہ کھانا کھانے کی وجہ سے منھ میں کھانے کی چکنائی اور جو اثرات ہیں وہ دور ہو جائیں، اور نماز کے دوران اس کھانے کا مزہ اور اثر باقی نہ رہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تكثير الأيدي علَى الطعام

کھانے میں جتنے کھانے والے زیادہ ہوں گے اتنی ہی اس کھانے میں برکت زیادہ ڈالی جائے گی۔

دو کا کھانا تین کو، تین کا چار، چار کا آٹھ کو کافی ہو جائے گا:

حدیث ۷۵۵:-

عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رسولُ الله (صلی اللہ علیہ وسلم) : طَعَامُ الاثنينِ كافِي الثلاثةِ، وطَعَامُ الثَّلاثَةِ كافي الأربعة. (متفق عليه)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: دو آدمیوں کا کھانا تین کو کافی ہو جاتا ہے، اور تین کا چار کو کافی ہو جاتا ہے۔

حدیث ۷۵۶:-

وعن جابر رضی اللہ عنہ قَالَ: سَمِعْتُ رسولَ الله (صلی اللہ علیہ وسلم) يقول: طَعَامُ الوَاحِدِ يَكْفِي الاثْنَيْنِ، وَطَعَامُ الاثْنَيْنِ يَكْفِي الأَرْبَعَةَ، وَطَعَامُ الأَرْبَعَةِ يَكْفِي الثَّمَانِيَةَ. (رواه مسلم)

ترجمہ:-حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم (ﷺ) کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: ایک کا کھانا دو کے لیے کافی ہے، اور دو کا چار کے لیے کافی ہے اور چار کا آٹھ کے لیے کافی ہے۔

افادات:-ایک خاص مقصد کو اس طرح تعبیر کیا گیا ہے۔ہوتا یہ ہے کہ مثلاً: ہم نے اپنے حساب سے کھانا تیار کیا، کھانے کے لیے بیٹھے ہوئے ہیں کہ دو چار مہمان آگئے،تو ایسے موقع پر صاحبِ خانہ اور مالکِ مکان یہ سوچنے لگتا ہے کہ یہ مہمان آگئے، اب کیا ہو گا؟اس کی وجہ سے اس کی طبیعت کے اندر آنے والوں کی طرف سے جھجھک سی پیدا ہوتی ہے ،اور وہ یوں سوچنے لگتا ہے کہ ان کو کھانے میں شریک کیا جائے یا نہیں۔

اب یہ جو سوچ آرہی ہے کہ کھانا تو کم لوگوں کے حساب کا بنایا ہے، یہ آدمی بڑھ گئے،تو اب کیا ہو گا؟تو نبی کریم (ﷺ) ہمیں بتلاتے ہیں کہ بھائی! آپ کیو ں فکر کرتے ہو، تین کا کھانا چار کے لیے کافی ہو جائے گا،یعنی جتنا کھانا دو آدمی کے لیے پکایا تھا اور دونوں آدمی پیٹ بھر کر ڈکار لے کر کھا سکتے تھے،اسی کھانے میں تین آدمی اپنی ضرورت پوری کرلیں گے،بھلے ہی وہ دو آدمی ڈکاریں نہیں لے سکیں گے،لیکن تینوں کی بھوک تو اس سے مٹ جائے گی،اور کھانے کا تقاضہ باقی نہیں رہے گا ،اور اصل تو یہی ہے۔

دوسری روایت میں اورزیادہ وسعت کردی گئی۔کافی ہونے کا مطلب وہی ہے کہ جس کھانے کوایک آدمی پیٹ بھر کراور شکم سیر ہو کر کھاتا ہے،اگر دو آدمی کھائیں گے تودونوں کی ضرورت اس سے پوری ہو جائے گی۔اسی طرح دو کا چار کے لیے اور چار کا آٹھ کے لیے کافی ہے۔

ہم کسے مہمان سمجھتے ہیں ؟:

مہمان کے لیے بھی ہم نے اپنے ذہنوں میں ایک معیار بنایاہے کہ کوئی رشتہ دار ہو،یاکوئی ملنے والاہو،کوئی دوست ہو،یاہماری سطح کاہو،ہمارے اسٹیٹس کا آدمی ہو؛تواس کوتوہم مہمان سمجھتے ہیں۔اوراگرکوئی اجنبی ہے جس کے ساتھ کوئی جان پہچان نہیں ہے،رشتہ داری اوردوستی نہیں ہے،یاوہ ہماری سطح کانہیں ہے،ذراغریب آدمی ہے؛تواس کو ہم مہمان نہیں سمجھتے۔حالاں کہ شریعت کی نگاہوں میں مہمان عام ہے،جو آدمی بھی آپ کے گھر آیا ہو،چاہے وہ غریب ہو، وہ آپ کا مہما ن ہے اور قابلِ اکرام ہے،اس کی عزت کرناضروری ہے۔اب آنے والے کے کپڑے پھٹے پرانے ہیں توکیا ہوا،وہ بھیک مانگنے تونہیں آیاہے۔ہمارامزاج ایسا بن چکاہے کہ اگر ایسی ہیئت کاکوئی آدمی آگیاتواس کوبھکاری ہی سمجھتے ہیں ،ایسانہیں ہوناچاہیے،بلکہ وہ مہمان ہے،اس کی عزت کرو، کھانے کاوقت ہے تو اس کو بھی کھانے میں شریک کرلو۔ خیر!اچانک آنےوالے کی وجہ سے آدمی کے دل میں کوئی کدورت اورناراضگی نہیں ہونی چاہیے،اور کسی کو جھڑکناتوبالکل ہی نہیں چاہیے۔

نہایت عبرت آموز واقعہ:

کتابوں میں ایک قصہ لکھا ہے جو کسی زمانہ میں پیش آیا تھا "المستطرف فی کل فن مستظرف" میں موجود ہے اور حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مواعظ میں بھی ہے کہ ایک آدمی ایک مرتبہ اپنی بیوی کے ساتھ کھانا کھا رہا تھا، مرغی پکی ہوئی تھی، کوئی اجنبی آ گیا اور اس نے کہا: مَیں بھوکا ہوں، مجھے کچھ کھانا کھلاؤ۔ تو بجائے اس کے کہ اس کا اکرام کیا جاتا، اس کو کھانے میں بھی شریک کر لیا جاتا؛ وہ آدمی غصہ ہو گیا اور اس کو جھڑک کر وہاں سے بھگا دیا۔ اب جس نے یہ کیا تھا وہ صاحبِ حیثیت اور مالدار آدمی تھا، اتفاق کی بات کہ اس کے برے دن آئے، مال بھی ہاتھ سے نکل گیا، اور اتنی بھی حیثیت نہیں رہی کہ بیوی کا نفقہ ادا کر سکے اور اس کی ضرورتیں پوری کر سکے، مجبور ہو کر بیوی کو طلاق دینی پڑی۔ اس کے بعد اس عورت نے ایک اور آدمی سے نکاح کر لیا جو مالدار اور صاحبِ حیثیت تھا، ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ وہ عورت اپنے اس دوسرے شوہر کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھا رہی تھی، مرغی پکائی گئی تھی، باہر کوئی مانگنے والا آیا تو اس نے بیوی سے یوں کہا: یہ پورا تھال اُٹھا کر اس مانگنے والے کو دے دو۔ یہ عورت مانگنے والے کو دینے کے لیے باہر گئی اور دے کر جب واپس آئی تو رو رہی تھی، شوہر نے پوچھا: کیوں رو رہی ہو؟ اس نے بتلایا کہ یہ مانگنے والا میرا سابق شوہر تھا اور جس زمانہ میں مَیں اس کے نکاح میں تھی تو ایک مرتبہ ایسا قصہ پیش آیا تھا کہ ہم دونوں میاں بیوی کھانا کھا رہے تھے، اسی دوران ایک

آدمی آیا، اس نے اپنی ضرورت ظاہر کی کہ مَیں بھوکا ہوں ، لیکن اس نے اس سائل کو دھمکا کر اور جھڑک کر وہاں سے نکال دیا تھا، پھر اس کے حالات برے ہوگئے، تو وہ مجھے طلاق دینے پر مجبور ہوگیا، پھر میرا تمہارے ساتھ نکاح ہوگیا، اورآج وہ اس حالت میں آیا، اس کو دیکھ کر میرا دل بھر آیا۔ تو اس شوہر نے کہا: وہ آدمی جس کو جھڑک دیا تھا: میں ہی تھا۔

یہ بات تو دل میں بٹھا ہی لو:

بہر حال! میں پہلے بھی بار بار یہ عرض کرچکا ہوں کہ جس کے پاس جو کچھ بھی ہے وہ اپنی صلاحیتوں کی بنیاد پر نہیں ہے، اس لئے کوئی آدمی یہ نہ سوچے کہ میرے پاس علم ہے ، دولت ہے، صلاح وتقویٰ، نیکی اور دینداری ہے، جس کو جو بھی نعمت اللہ تعالیٰ نے دی ہے، وہ سب محض اس کا فضل ہے، ہماری کسی صلاحیت اور قابلیت کو اس میں بالکل دخل نہیں ہے۔ یہ چیز ہمیشہ ہمارے پیش نظر رہنی چاہیے۔ یہ بات تو دل میں بٹھا ہی لو کہ میرے پاس جو کچھ بھی ہے وہ میری صلاحیت اور قابلیت کی بنیاد پر نہیں ہے، سب کچھ اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہے، وہ جب چاہے لے لے، اس سے کوئی بعید نہیں ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر یہی ہے کہ ہمیں جو تعلیمات دی گئی ہیں ان کا اہتمام کیا جائے۔ حدیث میں آتا ہے: "لَا تُظْهِرِ الشَّمَاتَةَ لِأَخِيكَ فَيُعَافِيَهُ اللهُ وَ يَبْتَلِيَكَ" (المعجم الکبیر للطبرانی: ۱۷۵۹۳) اپنی کسی بھائی کی کسی بھی مصیبت کے اوپر خوشی کا اظہار مت کرو،

کہیں ایسا نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ اس کو تو اس مصیبت سے نجات دیدے اور تم کو اس میں مبتلا کر دے۔

خلاصۂ کلام:

تو حضورِ اکرم (ﷺ) کی یہ تعلیم ہے کہ دو کا کھانا تین کے لیے کافی ہو جائے گا، یا تین کا کھانا چار کے لیے کافی ہو جائے گا؛ وہ دراصل ایسے مواقع کے لیے ہی ہے۔ ایسے مواقع پر عام طور پر لوگ اگر نبیٔ کریم (ﷺ) کی اس تعلیم کو مدِ نظر رکھیں تو کبھی کوئی دشواری پیش نہیں آسکتی، دل بڑا کرتے ہوئے کہے: بھائی سب آجاؤ، اللہ تعالیٰ اس کھانے میں برکت دیدیں گے۔ آدمی دل میں جھجک محسوس نہ کرے کہ کیا ہوگا۔ اگر کھانا ختم ہو جائے تو کہہ دو کہ بھائی! جو کھانا تھا وہ پیش کر دیا گیا، اب کھانا ختم ہو گیا ہے۔ اس میں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

باب أدب الشرب

پینے کے آداب

واستحباب التنفس ثلاثاً خارج الإناء

وكراهة التَّنَفُّس فى الإناء واستحباب إدارة الإناء عَلَى الأيمن فالأيمن بعد المبتدء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پینے کے آداب:

اس عنوان میں کئی چیزیں بتاتے ہیں :-

ایک تو یہ ہے کہ پینے کی کوئی بھی چیز ہو،پانی،دودھ یااور کوئی مشروب ہو؛ اس کو ایک سانس میں نہ پیے،بلکہ تین سانس سے پیے۔

دوسری بات یہ ہے کہ جب سانس لینے کاوقت آئے توبرتن کے اندر سانس نہ لے،بلکہ برتن سے منھ ہٹاکرسانس لے۔برتن کے اندر سانس لینامکروہ ہے۔

اورتیسری بات یہ ہے کہ پینے کی چیز پی کربچاہواکسی دوسرے کودیناہے تواس کاطریقہ یہ ہے کہ دائیں طرف سے ابتداء کی جائے۔

حدیث۷۵۷:-

عن أنس رضی اللہ عنہ **أنَّ رسول الله** (ﷺ) **كَانَ يَتَنَفَّسُ فِى الشَّرَابِ ثَلَاثاً** (متفق عَلَيْهِ) **يعني:يتنفس خارجَ الإناءِ.**

ترجمہ:- حضرت أنس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیؐ کریم (ﷺ) پینے کے دوران (برتن کو منھ سے ہٹاکر) تین مرتبہ سانس لیتے تھے۔

حدیث ۷۵۸:-

وعن ابن عباس رضی اللہ عنہما قَالَ قال رسول اللہ (ﷺ): لَاتَشْرَبُوا وَاحِداً كَشُرْبِ الْبَعِيرِ، وَلَكِنِ اشْرَبُوا مَثْنَى وَثُلَاثَ، وَسَمُّوا إِذَا أَنْتُمْ شَرِبْتُمْ، وَاحْمَدُوا إِذَا أَنْتُمْ رَفَعْتُمْ. (رواہ الترمذی)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: ایک سانس میں اونٹ کی طرح نہ پیو(اونٹ کی عادت ہوتی ہے کہ جب وہ پانی پینے کے لیے منھ ڈالتا ہے توپورا پینے کے بعد ہی منھ اونچا کرتا ہے)بلکہ پینے کے دوران دویا تین مرتبہ سانس لو۔اور جب پیناشروع کرو توبسم اللہ پڑھو،اورجب پانی پی چکوتو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو، حمدبیان کرو (الحمدللہ کہو)

افادات:- اگر پی جانے والی چیز کی مقدار قلیل ہے ،مثلاًایک ہی گھونٹ ہے،تواس صورت میں ایک سانس میں پینے میں کوئی حرج کی بات نہیں ہے، لیکن پھر بھی کوئی آدمی سنت پر عمل کی حرص میں اس کو بھی تقسیم کرتاہے تو اللہ تعالیٰ اس جذبہ پر اس کو ثواب عطا فرمائیں گے۔ اورنبیٔ کریم (ﷺ) نےایک سانس میں پینے کی جو ممانعت فرمائی ہے وہ حرمت کے لیے نہیں ہے،بلکہ آداب کے قبیل سے ہے،اگر کوئی آدمی ایک ہی مرتبہ میں پی لیتاہے،توفقہاء نے لکھاہے کہ وہ بھی جائزہے لیکن خلافِ اولیٰ ہے، اور پینے کے دوران برتن کومنھ سے ہٹاکردویاتین سانس لینا مستحب اورآداب میں سے ہے

نہی ٔ ارشاد اور نہی ٔ تحریم:

دیکھو! نبی ٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شانیں مختلف ہیں، کبھی تو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے رسول ہونے کی حیثیت سے کسی چیز سے منع فرماتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اب اس چیز کا کرنا حرام اور ممنوع ہے، اگر کوئی آدمی اس کو کرے گا تو گنہگار ہو گا۔ اور نبی ٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ایک حیثیت شفیق باپ اور مہربان مربی کی ہے، اس لیے کبھی آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کسی چیز سے اسی حیثیت سے منع فرماتے ہیں اور اس ممانعت کا تعلق حلت و حرمت سے نہیں ہوتا؛ اسی کو فقہاء کی اصطلاح میں نہی ٔ ارشاد کہتے ہیں، کتابوں میں یہ جملہ آتا ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اس ممانعت کا تعلق از قبیلِ نہی ٔ ارشاد ہے، یعنی نبی ٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنی امت کو اچھے آداب سکھانے کی غرض سے کسی کام کو کرنے سے منع فرمایا۔ تو ایک سانس میں پینے سے جو ممانعت فرمائی ہے وہ بھی از قبیلِ نہی ٔ تحریم نہیں، بلکہ از قبیلِ نہی ٔ ارشاد ہے، یعنی ایک فائدہ کی چیز ہے جس کی نبی ٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنی امت کو تاکید فرمارہے ہیں، جیسے ایک شفیق باپ اور مہربان مربی اپنے ماتحتوں کی تربیت کرتے ہوئے ایسی چیزوں کی بھی تلقین کرتا ہے جو ان کے لیے مفید اور کارآمد ہوتی ہیں، یعنی وہ کام کوئی واجب اور ضروری نہیں ہوتے، پھر بھی وہ کہتا ہے کہ ایسا کرو اور ایسا مت کرو۔ تو یہ ”ایسا مت کرو“ جو کہا گیا وہ اس لیے نہیں کہ وہ کام حرام اور گناہ ہے، بلکہ اس لحاظ سے کہا گیا ہے کہ اچھا نہیں ہے، نامناسب ہے،

خلافِ اولیٰ ہے، بہتر نہیں ہے۔ اسی لیے فقہاء نے لکھا ہے کہ ایک سانس میں پینا جائز تو ہے، لیکن بہتر نہیں ہے۔

میٹھے پانی کا عجیب و غریب قدرتی نظام:

اور پینا شروع کرو تو بسم اللہ پڑھو یعنی اللہ کا نام لو، جس طرح کھانا شروع کرو تب بھی اللہ کا نام لینے کا حکم فرمایا تھا۔ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو استعمال کرتے وقت جو اللہ کا نام لینے کا کہا گیا ہے وہ دراصل اس بات کو یاد دلایا جارہا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمت ہے، لہٰذا جس ذات نے یہ نعمت ہمیں دی ہے اس کا نام لو اور اس کی قدر کرتے ہوئے اس کو استعمال کرو۔

اور ہمیں سوچنا چاہیے کہ یہ پانی اللہ تعالیٰ کی کتنی بڑی نعمت ہے! اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کے لیے پانی کا ذخیرہ سمندروں کے اندر رکھا ہے، لیکن وہ پانی تو کڑوا اور کھارا ہے، اس میں اللہ تعالیٰ نے نمکیات رکھے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر وہ میٹھا ہوتا تو وہ خراب ہوجاتا اور بگڑ جاتا، اس لیے کہ اس میں جانور مرتے رہتے ہیں اور میٹھے پانی میں جانور مریں تو وہ پانی بہت جلدی سڑ جاتا اور اس میں بدبو پیدا ہوجاتی ہے، اللہ تعالیٰ نے اس میں ایسے نمکیات رکھے کہ ساری دنیا کی گندگیاں وہاں جاتی ہیں اور مختلف قسم کے جانور اس میں مرجاتے ہیں، اس کے باوجود وہ پانی انہیں نمکیات کی وجہ سے خراب نہیں ہوتا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ایسا نہیں فرمایا کہ اپنی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے سمندروں سے پانی لے آؤ، اس لیے کہ سمندر کا پانی تو کڑوا ہے، اس سے براہِ راست اس

کی ضرورت پوری نہیں ہوسکتی۔ تو پانی کا ذخیرہ تو سمندر میں کیا، پھر اللہ کی مخلوق جہاں جہاں بسی ہے وہاں اس کے پہنچانے کا یہ انتظام کیا کہ سمندر کے اندر مانسون کے ذریعہ بادل تیار ہوتے ہیں، بادل سمندر کے اندر ہی سے اُٹھتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ نے ایسا قدرتی نظام بنادیا اور ایسی مشین بنادی ہے کہ مانسون کے ذریعہ بادل میں جب پانی بھرتا ہے تو ساری نمکیات سمندر ہی میں رہ جاتے ہیں اور خالص میٹھا پانی اس میں جمع ہوتا ہے، اور پھر وہ بادل اللہ تعالیٰ دنیا کی مختلف جگہوں پر- جہاں اللہ کی مخلوق بسی ہوئی ہے- پہونچاتے ہیں اور وہ وہاں پانی برساتے ہیں، اب بارش کا تو مخصوص زمانہ اور موسم ہوتا ہے، اگر یہ حکم ہوتا کہ سال بھر کی اپنی ضرورت کا پانی اسی موسم میں بھرلو، تو اتنی بڑی ٹنکی کہاں سے لاتے؟ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے بھی نظام بنایا کہ پہاڑوں پر جہاں بارش برستی ہے وہاں اس پانی کو برف کی شکل میں جمادیا، گویا وہ فریج میں محفوظ ہے، جب گرمیوں کا زمانہ آتا ہے تو وہ پگھلتا ہے اور ندیوں، دریاؤں کے ذریعہ بستیوں میں پہنچتا ہے۔ اور دوسری شکل یہ بھی بنائی کہ بارش کا برسا ہوا پانی زمین کے اندر جذب کرادیا، زمین کے اندر پانی کے ذخیرے موجود ہیں، گویا زمین کے اندر نالیاں سی بنادیں اور ٹیوب لگادئے ہیں، جب ہم زمین کو کھودیں گے تو اندر سے ہمیں پانی ملے گا۔ اس لیے آدمی سوچے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو میٹھا پانی پہنچانے کے لیے کیسا عجیب و غریب نظام بنایا ہے؟ اس لیے کہا گیا کہ سوچو کہ یہ نعمت کس کی دی ہوئی ہے، پھر اسی کا نام لے کر اس کو استعمال کرو، اور اس کا شکر ادا کرو۔

شکر گزار بندہ کی دعائیں:

جب پانی پی کر فارغ ہو تو الحمد للہ کہو۔"أَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ أَرْوَانَا"، تمام تعریف اس ذات کے لیے ہے جس نے ہمیں سیراب کیا۔ حضرت نوح علیٰ نبینا وعلیہ السلام کے متعلق قرآنِ پاک میں ہے:"إِنَّهٗ كَانَ عَبْدًا شَكُوْرًا" وہ اللہ تعالیٰ کے شکر گزار بندے تھے۔ان کے متعلق لکھا ہے کہ جب بھی وہ کوئی نعمت استعمال کرتے تھے تو وہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے تھے۔ جیسے: کھانا کھاتے تو کہتے:"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ أَطْعَمَنِیْ، وَلَوْ شَاءَ أَجَاعَنِیْ"، اللہ تعالیٰ کا شکر ہے جس نے مجھے کھلایا، اگر وہ چاہتا تو بھوکا رکھتا۔ جب پانی پیتے تو کہتے:"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ سَقَانِیْ، وَلَوْ شَاءَ أَظْمَأَنِیْ"، اللہ کا شکر ہے جس نے مجھے پانی پلایا، اگر وہ چاہتا تو پیاسا رکھتا۔ جب لباس پہنتے تو کہتے :"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ كَسَانِیْ، وَلَوْ شَاءَ أَعْرَانِیْ" اللہ کا شکر ہے جس نے مجھے لباس پہنایا، اگر وہ چاہتا تو بغیر لباس کے ننگا رکھتا۔ جوتا پہنتے تو کہتے: "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ حَذَّانِیْ، وَلَوْ شَاءَ أَحْفَانِیْ" اللہ کا شکر ہے کہ جس نے مجھے جوتا پہنایا، اگر وہ چاہتا تو ننگے پیر رکھتا۔ اور قضائے حاجت کے بعد کہتے: "أَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ أَخْرَجَ عَنِّیْ أَذَاهُ، وَلَوْ شَاءَ حَبَسَهٗ"، اللہ کا شکر ہے جس نے تکلیف دہ چیز کو مجھ سے نکال دیا، اگر وہ چاہتا تو اس کو اندر ہی روک دیتا (جامع البیان في تفسیر القرآن للطبري: سورۃ بنی اسرائیل) تو واقعہ یہ ہے کہ آدمی سوچے کہ اس میں میری کون سی محنت اور صلاحیت کو دخل ہے، اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ اس نے یہ سب نعمتیں دی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی کسی بھی نعمت کو آدمی جب استعمال کرے تو اس موقع پر جو جو دعائیں بتلائی گئی ہیں ان کا اہتمام کرے، اور وہ

دعائیں اسی لیے بتلائی ہیں کہ شروع میں اللہ کا نام لیا جائے گا تو اس نعمت کے دینے والے کی طرف دھیان جائے گا، پھر استعمال کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے تا کہ اس نعمت کا حق ادا ہو، اس کی ناقدری نہ ہو۔

برتن میں سانس نہ لے:

حدیث ۷۵۹:-

وعن أَبي قَتَادَةَ رضی اللہ عنہ: أَنَّ النبيَّ (ﷺ) نَهَى أَنْ يُتَنَفَّسَ فِى الإِنَاءِ. (متفق عَلَيْهِ)

يعني: يتنفس فى نفس الإناءِ.

ترجمہ:- حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم (ﷺ) نے برتن کے اندر سانس لینے سے منع فرمایا۔

افادات:- بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ پانی پینے کے دوران گلاس منہ سے ہٹاتے ہی نہیں، اسی میں سانس لیتے ہیں؛ حالاں کہ اس سے منع کیا گیا ہے۔ برتن سے منہ ہٹا کر سانس لینا چاہیے، اس لیے کہ پانی بہت نازک اور صاف شفاف چیز ہے، آدمی جب اندر سانس لے گا تو سانس کے اثرات اندر آجائیں گے۔ بیڑی سگریٹ پینے والا اگر اندر ہی سانس لے گا تو اس کی بدبو کا اثر اندر آجائے گا، پھر اس بچے ہوئے پانی کو اگر کوئی دوسرا استعمال کرنا چاہے گا تو فوراً اس کی

طبیعت گھن کرے گی،اس لیے اندر سانس لینے سے منع کیا گیا ہے کہ پانی کے اندر سانس لے کر اس کو آلودہ مت کیجئے،برتن کو منھ سے ہٹا کر سانس لیجئے۔

اَلْأَیْمَن فَالْأَیْمَن:

حدیث ۷۶۰:-

وعن أنس رضی اللہ عنہ أنَّ رسولَ الله (صلی اللہ علیہ وسلم) أُتِيَ بِلَبَنٍ قَدْ شِيبَ بماءٍ، وَعَنْ يَمِينِهِ أعْرَابِيٌّ، وَعَنْ يَسَارِهِ أَبُو بَكْر رضی اللہ عنہ، فَشَرِبَ، ثُمَّ أعْطَى الأعْرابيَّ، وقال: ((الأيْمَنَ فالأيْمَنَ)) (متفق عَلَيْهِ)

قَوْله: ((شِيب)) أيْ: خُلِطَ.

ترجمہ:- حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس دودھ لایا گیا جس میں پانی کی ملاوٹ تھی، آپ کے دائیں طرف ایک دیہاتی بیٹھا ہوا تھا اور بائیں طرف حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ بیٹھے ہوئے تھے۔ جب آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) دودھ پی کر فارغ ہوئے تو آپ نے بچا ہوا اس دیہاتی کو عطا فرمایا اور ارشاد فرمایا: "اَلْأَیْمَنَ فَالْأَیْمَنَ"

حدیث ۷۶۱:-

وعن سهلِ بن سعدٍ رضی اللہ عنہ أنَّ رسول الله (صلی اللہ علیہ وسلم) أُتِيَ بِشرابٍ، فَشَرِبَ مِنْهُ وَعَنْ يَمِينِهِ غُلامٌ، وَعَنْ يَسَارِهِ أشْيَاخٌ، فَقَالَ للغلامِ: أتَأْذَنُ لِي أنْ أُعْطِيَ هؤُلاَءِ؟ فَقَالَ الغُلامُ: لا واللهِ، لا أُوْثِرُ بنَصيبي مِنْكَ أحداً. فَتَلَّهُ رسول الله (صلی اللہ علیہ وسلم) في يَدِهِ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

قَوْلہ: ((تَلَّهُ)) أَيْ وَضَعَهُ. وهذا الغلامُ هُوَ ابنُ عباس رضی اللہ عنہما.

ترجمہ مع تشریح:- حضرت سہل بن سعد ساعدی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم (ﷺ) کے پاس پینے کی کوئی چیز لائی گئی، جب آپ پی چکے تو آپ کی دائیں طرف ایک بچہ بیٹھا ہوا تھا اور بائیں طرف بڑی عمر کے بزرگ لوگ تھے، نبی کریم (ﷺ) نے اس بچہ سے کہا: کیا تم اس بات کی اجازت دیتے ہو کہ مَیں اپنا بچا ہوا ان بڑے لوگوں کو دوں؟ انہوں نے کہا: اے اللہ کے رسول! یہ آپ کا بچا ہوا ہے جس میں میرا حصہ ہے، اور مَیں وہ کسی دوسرے کو دینا نہیں چاہتا، چناں چہ نبی کریم (ﷺ) نے ان کے ہاتھ میں زور سے تھما دیا۔

افادات:- عرب میں یہ رواج تھا کہ جب دودھ دوھتے تھے تو اس میں تھوڑا سا پانی میں بھی ملا دیتے تھے، اس کی وجہ سے دودھ میں ٹھنڈک بھی آجاتی تھی اور پینے کے لیے مرغوب بھی ہوجاتا تھا۔ لیکن یہ بات بھی یاد رہے کہ پینے کے لیے تو دودھ پانی کی ملاوٹ کی اجازت ہے، بیچنے کے لیے پانی کی ملاوٹ کی اجازت نہیں ہے، اگر اس میں پانی ملایا گیا ہے تو گاہک سے کہہ دیا جائے کہ اندر پانی ملایا گیا ہے۔

اس باب میں ایک ادب یہ بھی بتلایا ہے کہ کسی نے کوئی چیز پی، اور وہی برتن کسی دوسرے کو پینے کے لیے دینا چاہتا ہے تو دائیں طرف والے کو دے۔ اس روایت میں دیکھو کہ دائیں طرف حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ بیٹھے ہوئے تھے جن کا مقام و مرتبہ حضرات انبیاء کے بعد انسانوں میں سب سے افضل ہیں، اس کے باوجود چوں کہ وہ بائیں طرف تھے، اور آداب

میں سے یہ ہے کہ جو دائیں طرف ہو اس کو دیا جائے، تو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس ادب کی رعایت فرمائی۔

دوسری روایت میں جو آیا تو وہ بچے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما تھے، نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی وفات کے وقت ان کی عمر دس سال تھی، تو ظاہر ہے اس وقت چھوٹے لڑکے تھے۔ چوں کہ "الایمن فالایمن" والا اصول بتلایا گیا ہے۔ حالاں کہ پینے کی جو چیز لائی گئی تھی اس کے مالک خود حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) تھے، آپ اپنی مرضی سے جس کو چاہتے دے سکتے تھے، لیکن اسلام نے ہمیں یہ تعلیم دی کہ دینے کی شروعات داہنی طرف سے کرو، اس لیے خود حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بھی اس کا اہتمام فرمایا کہ بائیں طرف بڑے لوگ بیٹھے ہوئے تھے اور دائیں طرف ایک لڑکا بیٹھا ہوا تھا، اور اصول کا تقاضہ یہ ہے کہ اس لڑکے ہی کو دیا جائے، ادھر بڑے لوگ تھے جس کی وجہ سے خیال یہ ہوا کہ ان کا اکرام کیا جائے۔ جب نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان سے اجازت مانگی تو ان کو چاہیے تھا کہ اجازت دیدیتے، لیکن چوں کہ وہ بھی حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بچے ہوئے کے حریص تھے تو انہوں نے سوچا کہ اگر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنی مرضی واختیار سے دینا چاہتے تو دے سکتے تھے، لیکن جب حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) اجازت ہی مانگ رہے ہیں تو مَیں ہی فائدہ کیوں نہ اُٹھاؤں؛ اس لیے انہوں نے کہا: مَیں تو اپنا حصہ کسی کو نہیں دوں گا۔

ایک مسئلہ:

اور یہ ادب اس وقت ہے جبکہ وہ چیز ہمیں پینے کے لیے مالک بناکر دی گئی ہو، لیکن اگر پینے کی جو چیز ہمیں دی وہ کسی اور کی ہے، تو پھر اس صورت میں پی کر بچا ہوا اسی کو دے دیا جائے جو لایا ہے، پھر وہ جس کو چاہے دے، اگرچہ اس کو چاہیے کہ دائیں طرف والے کو دے، لیکن ہم تو پی کر اسی کو دیں۔

ان دونوں روایتوں میں یہی ادب سکھایا گیا ہے کہ کسی نے کوئی چیز پی، اور بچا ہوا آگے دینا چاہتا ہے؛ تو اس کا دَور داہنی طرف سے چلانا چاہیے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

كراهة الشرب من فم القربة ونحوها وبيان أنه كراهة تنزيه لا تحريم

مشکیزہ اور بڑے برتن سے منہ لگا کر پینے کی ممانعت اور اس کی وجہ:

مشکیزہ یا اس جیسی کوئی بڑی چیز، یا کوئی بڑا برتن جس میں پانی رکھا ہوا ہو، جیسے: آج کل پلاسٹک کے گوٹ، یا کیر بے ہوتے ہیں، تو اس سے براہِ راست منہ لگا کر پینا کیسا ہے؟ باب کا عنوان لا کر بتلانا چاہتے ہیں کہ ایسے بڑے برتن سے منہ لگا کر پینا منع ہے، نبی کریم (ﷺ) نے اس کو پسند نہیں کیا ہے۔ ورنہ جو چھوٹے برتن ہوتے ہیں، جیسے: گلاس، پیالہ وغیرہ؛ وہ تو پینے کے واسطے ہی ہوتے ہیں، اس کی ممانعت نہیں ہے۔ اور یہ ممانعت بھی آداب کے قبیل سے ہے۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بڑے برتن میں جو پانی ہے اس میں کوئی مضر چیز ہے، جیسے پانی خراب ہو گیا ہے، یا اندر کوئی سپولیا ہے، یا کوئی چھوٹا سا جانور گھس گیا ہے، اب اگر آپ منہ لگا کر پئیں گے تو ہو سکتا ہے کہ وہ پیٹ کے اندر آجائے اور نقصان ہو جائے جیسا کہ روایتوں میں آتا ہے کہ ایک صحابی نے مشکیزہ سے براہِ راست پیا، تو اندر ایک چھوٹا سا سپولیا تھا وہ ان کے پیٹ میں چلا

گیا۔ تو اگر اس برتن میں سے کسی چھوٹے برتن گلاس وغیرہ میں نکالیں گے تو ہمیں نظر آجائے گا کہ اندر کیا ہے، اس لیے یہ ادب بتلایا ہے۔ اور یہ ممانعت بھی از قبیلِ تحریم نہیں، بلکہ اس طرح پینا خلافِ اولیٰ ہے۔

حدیث ۷۶۲:-

عن أبي سعيدٍ الخُدْرِيِّ رضی اللہ عنہ **قَالَ: نَهَى رسول الله** (ﷺ) **عن اخْتِنَاثِ الأَسْقِيَةِ. يعني: أن تُكْسَرَ أفواهُها، ويُشْرَبَ مِنْهَا.** (متفق عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم (ﷺ) نے اس بات سے منع فرمایا کہ مشکیزہ کا منھ توڑ کر اس سے پیا جائے، یا اس کو موڑ کر پیا جائے۔

حدیث ۷۶۳:-

وعن أبي هريرة رضی اللہ عنہ **قَالَ: نَهَى رسول الله** (ﷺ) **أن يُشْرَبَ مِنْ فِيِّ السِّقَاءِ أَوْ القِرْبَةِ.** (متفق عَلَيْه)

ترجم:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم (ﷺ) نے بڑے برتن یا مشکیزہ سے منھ لگا کر پینے سے منع فرمایا۔

افادات:- دو شکلیں ہیں، ایک تو یہ ہے کہ چمڑے کا بڑا مشکیزہ ہوتا ہے اس میں پانی زیادہ ہوتا ہے، تو اس سے براہِ راست پینے میں آگے کا جو منھ ہوتا ہے، اس کو موڑ دیتے ہیں، اس لیے کہ اس کے منھ پر ہاتھ لگنے کی وجہ سے میل کچیل لگا ہوا ہوتا ہے، جب آدمی اسی سے منھ

لگا کر پینا چاہتا ہے تو اس کی طبیعت چاہتی ہے کہ صاف جگہ سے پیوں ،اس لیے بعض لوگ ایسا کرتے تھے کہ اس مشکیزہ کے سرے کو اس طرح موڑتے ہیں کہ اندر کا حصہ باہر آجاتا ہے، اورچوں کہ اندر کا حصہ بالکل صاف شفاف ہوتا ہے تو اس کو منھ لگا کر پیتے ہیں۔اب اگر سب ہی اس طرح اس کا منھ موڑ کر پیئیں گے تو چند مرتبہ کے بعد مشکیزہ کا منھ کٹ جائے گا اور پھر وہ مشکیزہ استعمال کے قابل نہیں رہے گا،اس لیے نبی کریم (ﷺ) نے مشکیزہ کے منھ کو اس طرح موڑ کر پینے سے منع فرمایا

اس سے ایک اصول معلوم ہوتا ہے کہ کسی چیز کو استعمال کرنے کے لیے ایسا طریقہ اپنانا، جس کے نتیجہ میں آئندہ چل کر وہ چیز بے کار ہو جائے؛شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی۔

اس میں دوسرا نقصان یہ بھی ہے کہ بڑا برتن ہونے کی وجہ سے اس میں پانی زیادہ ہوتا ہے، تو کبھی ایسا ہوتا ہے کہ پانی زیادہ مقدار میں حلق کے اندر چلا جاتا ہے، اور یہ چیز آدمی کے لیے مضر ہوتی ہے۔

حضور (ﷺ) نے مشکیزہ سے منھ لگا کر پیا:

حدیث ۷۶۴:-

وعن أم ثابتٍ كَبْشَةَ بنتِ ثابتٍ أُختِ حَسّانَ بن ثابتٍ رضی اللہ عنہا. قالت : دخل عَلَيَّ رسولُ الله (ﷺ) فَشَرِبَ مِنْ فِيِّ قِرْبَةٍ مُعَلَّقَةٍ قائِماً ،فَقُمْتُ إِلَى فِيهَا فَقَطَعْتُهُ.(رواہ الترمذی،وقال:حدیث حسن صحیح)

وإنّما قطعتها: لِتَحفظ مَوضِع فَمِ رسولِ الله (ﷺ) وَتَتَبَرّكَ بِهِ، وتَصُونَهُ عَن الابتِذَال. وهذا الحديث محمولٌ عَلَى بيان الجواز، والحديثان السابقان لبيان الأفضل والأكمل. والله أعلم.

ترجمہ:- حضرت اُم ثابت کبشہ بنت ثابت رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبیٔ کریم (ﷺ) ان کے یہاں تشریف لائے، ایک مشکیزہ لٹکا ہوا تھا اس کو منھ لگا کر کھڑے کھڑے پانی پیا (وہ فرماتی ہیں کہ جس جگہ نبیٔ کریم (ﷺ) نے منھ لگا کر پانی پیا تھا) اس جگہ کو مَیں نے کاٹ کر اپنے پاس رکھ لیا۔

افادات:- اس حصہ کو برکت کے واسطے کاٹ ڈالا کہ نبیٔ کریم (ﷺ) کا منھ جہاں لگا ہے وہ چیز اپنے پاس برکت کے لیے رہے گی۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کے نیک بندوں کی استعمال کی ہوئی چیز کو آدمی برکت کے واسطے اپنے پاس رکھنا چاہے؛ تو اس کی اجازت ہے۔

برکت کے معاملہ میں بھی لوگوں میں افراط و تفریط ہے، بعض لوگ برکت کے معاملہ میں اتنے آگے بڑھے ہوئے ہیں کہ اسی کو کافی سمجھتے ہیں، دوسرے کسی عمل کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتے؛ یہ صحیح نہیں ہے۔ اور بعض لوگ اس کو بالکل بدعت سمجھتے ہیں؛ یہ بھی صحیح نہیں ہے۔

روایتوں میں تطبیق:

اب دیکھئے! اوپر تو ممانعت آئی تھی اور یہاں آپ (ﷺ) نے خود اس طرح پیا؟ تو پہلے بتلا چکا ہوں کہ وہ ممانعت حرمت کے لیے نہیں ہے کہ اس طرح پینا حرام ہے، بلکہ اس طرح پینے کے مقابلہ میں کسی برتن میں نکال کر پینے میں فائدہ زیادہ ہے۔ اسی لیے ایک موقع پر خود نبیٔ کریم (ﷺ) نے منھ لگا کر پی کر بتا دیا کہ اگرچہ اچھا نہیں ہے، لیکن جائز ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

باب کراھۃ النفخ فی الشرب

پینے کی چیز میں پھونک نہ مارے:

پینے کے آداب میں ایک ادب یہ بھی ہے کہ جو چیز پی جارہی ہے تو پینے کے دوران اس میں پھونک نہ مارے۔ایک تو ہے اندر سانس لینا اور ایک ہے پھونک مارنا، تو پینے کی چیز میں پھونک مارنے سے منع فرمایا ہے۔

حدیث ۷۶۵:-

عن أَبِی سعید الخدری رضی اللہ عنہ أَنَّ النَّبِیَّ (صلی اللہ علیہ وسلم) نَهَى عَنِ النَّفْخِ فِی الشَّرَابِ، فَقَالَ رَجُلٌ: القَذَاةُ أراها فی الإناءِ فَقَالَ: أهرقها. قَالَ: إِنِّی لا أَرْوَى مِنْ نَفَسٍ وَاحِدٍ؟ قَالَ: فَأَبِنِ القَدَحَ إِذًا عَنْ فِيكَ. (رواہ الترمذی، وقال: حدیث حسن صحیح)

ترجمہ:–حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے پینے کی چیز میں پھونک مارنے سے منع فرمایا۔اس پر ایک آدمی نے سوال کیا: اگر اس میں کوئی تنکا نظر آجائے؛ تو کیا کیا جائے؟ اس کو کیسے نکالے؟ حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: اتنا پانی بہادو (کہ اس کے ساتھ وہ چیز گر جائے، پھونک مارے بغیر بھی یہ مقصد حاصل ہوجائے گا) پھر اس آدمی نے کہا: مَیں ایک سانس میں شکم سیر ہو کر

پانی نہیں پی سکتا؟ (یعنی تھوڑا سا پانی میرے لیے کافی نہیں ہوتا، مجھے زیادہ پانی پینا پڑتا ہے اور جب زیادہ پانی پیوں گا تو پینے میں دیر لگے گی اور اس دوران سانس لینے کی ضرورت پیش آئے گی، اور برتن میں پھونک مارنے سے اور ہوا چھوڑنے سے منع کیا گیا ہے؛ تو اب کیا کروں؟) حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: جس برتن میں پی رہے ہو (گلاس، برتن یا پیالی وغیرہ) اس کو منہ سے الگ کردو (پھر سانس لے لو، گویا اس گلاس یا پیالہ کو منہ سے لگا ہوا رکھنے کی حالت میں سانس نہ لو، تاکہ سانس کا اثر اندر جانے نہ پائے)

افادات:- کبھی تو وہ چیز گرم ہوتی ہے اس کو ٹھنڈا کرنے کے لیے بعض لوگ اس میں پھونک مارتے ہیں۔ اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ تنکا وغیرہ کوئی چیز اس میں گری ہوئی ہوتی ہے، اس کو دور کرنے کے لیے پھونک ماری جاتی ہے؛ تو چاہے پینے کی چیز پانی ہو، چائے ہو، یا اور کوئی چیز ہو؛ اس میں پھونک مارنے سے نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے منع فرمایا ہے۔ پہلے بھی بتایا گیا تھا کہ یہ کراہت تنزیہی ہے، یعنی ادب کے خلاف ہے۔ ایسا نہیں کہ کوئی ایسا کام کرے گا تو اس نے حرام کام کرلیا اور گناہ کا ارتکاب ہوگیا۔ بلکہ کسی چیز کو پینے کا جو پسندیدہ انداز ہے اور ہمیں پینے کی جو تہذیب بتائی گئی ہے اس کے خلاف سمجھا جائے گا۔

حدیث ٧٦٦:-

وعن ابن عباس رضی اللہ عنہما. أَنَّ النبيَّ (صلی اللہ علیہ وسلم) نهى أن يُتَنَفَّسَ فى الإناءِ أَوْ يُنْفَخَ فِيهِ. (رواه الترمذی، وقال: حدیث حسن صحیح)

ترجمہ:- حضرت عبدا للہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جس برتن میں پانی یا کوئی اور چیز پی جارہی ہے اس میں سانس لینے اور پھونک مارنے سے نبی ٔکریم (ﷺ) نے منع فرمایا۔

افادات:-ویسے بھی پانی بڑی نازک چیز ہے، آدمی کے سانس لینے اور پھونک مارنے کی وجہ سے آدمی کے منھ کا اثر پانی میں آجاتاہے۔اگر بدبو ہے تو بدبو کا اثر آجاتاہے، خاص کرکے اگر آدمی بیڑی سگریٹ پینے والا ہو تو اس کے اثرات پانی میں آجائیں گے،اور اگرپانی بچ گیاتو دوسروں کے پینے کے قابل نہیں رہے گا، آدمی کی طبیعت اس سے کراہت اور گھِن کرے گی۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

باب بیان جواز الشرب قائماً

وبیان أنَّ الأکمل والأفضل الشرب قاعداً

کھڑے ہو کر پینے کی تفصیل:

ایک اور ادب بتلارہے ہیں کہ پانی یا جو بھی پینے کی چیز ہو وہ اگرچہ کھڑے ہو کر پینا جائز تو ہے، لیکن اچھا اور بہتر یہ ہے کہ بیٹھ کر پیئے، اس سلسلہ میں ایک روایت حضرت کبشہ بنت ثابت رضی اللہ عنہا کی پچھلے باب میں گزر چکی کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) ان کے مکان پر تشریف لے گئے اور جو مشکیزہ لٹک رہا تھا اس کا منہ کھول کر آپ نے کھڑے کھڑے اس مشکیزہ سے منہ لگا کر پانی نوش فرمایا، اس سے کھڑے کھڑے پانی پینے کا جواز معلوم ہوتا ہے۔ یہاں ایک اور روایت لا رہے ہیں۔

حدیث ۷۶۷:-

وعن ابن عباس رضی اللہ عنہما قَالَ: سَقَيْتُ النَّبِيَّ (صلی اللہ علیہ وسلم) مِنْ زَمْزَمَ، فَشَرِبَ وَهُوَ قَائِمٌ. (متفق عَلَيْهِ)

ترجمہ:–حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ مَیں نے حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو زمزم پلایا، تو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کھڑے ہو کر نوش فرمایا۔

حدیث ۷۶۸:-

وعن النَّزَّالِ بن سَبْرَةَ رضی اللہ عنہ **قَالَ: أَتَى عَلِيٌّ** رضی اللہ عنہ **بَابَ الرَّحْبَةِ، فَشَرِبَ قائِماً، وقال: إِنِّي رَأَيْتُ رسولَ الله** (صلی اللہ علیہ وسلم) **فَعَلَ كما رَأَيْتُمُوني فَعَلْتُ.** (رواہ البخاری)

ترجمہ:–حضرت نزّال بن سبرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کوفہ کے چوک کے پاس تشریف لائے اور وہاں کھڑے ہو کر پانی پیا۔ اور فرمایا: مَیں نے نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ایسا کرتے ہوئے دیکھا جیسا کہ تم لوگوں نے مجھے کرتے ہوئے دیکھا۔

افادات:–اس باب میں کھڑے ہو کر پینے کے سلسلہ میں دونوں قسم کی روایتیں لا رہے ہیں۔ بعض روایتیں وہ ہیں جن میں نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کھڑے ہو کر پینے سے منع فرمایا، جیسے حضرت اَنس رضی اللہ عنہ کی روایت پیش کریں گے: "أَنَّهُ نَهَى أَنْ يَّشْرَبَ الرَّجُلُ قَائِماً" آدمی کھڑے ہو کر پیے اس سے نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے منع فرمایا۔ بلکہ مسلم کی ایک روایت حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے پیش کی ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: "لاَ يَشْرَبَنَّ أَحَدٌ مِنْكُمْ قَائِماً، فَمَنْ نَسِيَ فَلْيَسْتَقِيءْ" کوئی آدمی کھڑے ہو کر ہرگز نہ پیے، اگر بھول سے کھڑے ہو کر پی لیا ہو تو قے کر دے۔ بہر حال! ان روایتوں سے کھڑے ہو کر پانی پینے کی ممانعت معلوم ہوتی ہے۔

اور کچھ روایتیں وہ پیش کریں گے جس میں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے پانی کھڑے ہوکر نوش فرمایا، جس سے کھڑے ہوکر پینے کی اجازت معلوم ہوتی ہے، جیساکہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما. کی یہی روایت اور حضرت علی والی روایت پیش کی ہے۔ تو اب دونوں طرح کی روایتوں کے پیشِ نظر اہلِ علم نے ان میں جوڑ پیدا کرنے کے لیے مختلف باتیں کہی ہیں۔

بعض حضرات کھڑے ہوکر پینے والی روایت -جس سے اجازت معلوم ہوتی ہے- اسی کو ترجیح دیتے ہیں کہ وہ زیادہ قوی ہیں اور عمل اسی پر ہے۔ اور ممانعت والی روایتوں کو اس درجہ کی قوی نہیں مانتے۔

بعضوں نے یہ کہا : پہلے کھڑے ہوکر پینے کی اجازت تھی، پھر ممانعت ہوگئی، یعنی وہ حضرات ممانعت والی روایتوں کو ناسخ مانتے ہیں۔

بعضوں نے کہا: پہلے ممانعت تھی، پھر اجازت والا حکم آگیا۔

چکی کا پاٹ:

لیکن محققین اس طرف گئے ہیں کہ کھڑے ہو کر پینے کی جو روایتیں ہیں وہ بیانِ جواز کے لیے ہیں کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) اس کا جائز ہونا بتارہے ہیں۔ اور ممانعت والی روایت سے اس کا ناپسندیدہ ہونا معلوم ہوتا ہے ،یعنی ادب کے خلاف ہے کہ آدمی کھڑے ہوکر پیئے۔

دورِ حاضر کے ہمارے بعض اکابر فرماتے ہیں : اگر بیٹھنے کے لیے مناسب جگہ موجود ہے تو پھر کھڑے ہو کر پینا مکروہ ہے۔اور اگر بیٹھنے کے لیے مناسب جگہ نہیں ہے، جیسے: اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر کھڑے ہوئے ہیں، یا کوئی ایسی جگہ پر ہیں کہ بیٹھنا چاہیں تب بھی نہیں بیٹھ سکتے؛ تو پھر وہاں کھڑے ہو کر پانی پینے میں کوئی کراہت بھی نہیں ، ایسی جگہوں پر کھڑے ہو کر پینا بلاکراہت درست ہے۔

اور بعضوں نے کہا ہے کہ کھڑے ہو کر پینا مضر ہے،اس وجہ سے شفقتاً منع فرمایا ہے، اس لیے کہ جب آدمی کھڑے ہو کر پیتا ہے تو سانس کی رگیں پوری طرح کھلی ہوئی ہوتی ہیں،اور پانی سیدھا معدہ میں پہنچتا ہے جس کی وجہ نقصان ہو سکتا ہے،بیٹھ کر پینے میں اس نقصان سے حفاظت ہو جاتی ہے۔

البتہ دو پانی ایسے ہیں جن کو کھڑے ہو کر پینے کی اجازت ہے۔ایک تو زمزم، اور دوسرا وضو کا بچا ہوا پانی۔نبیٔ کریم (ﷺ) نے زمزم کھڑے ہو کر پیا، جیسا کہ ابن عباسؓ کی روایت پیش فرمائی کہ مَیں نے آپ (ﷺ) کو زمزم پلایا تو آپ نے کھڑے ہو کر نوش فرمایا۔

زمزم کو کھڑے ہو کر پینے کی تفصیل:

آب زمزم جو کھڑے ہو کر پیا جاتا ہے؛ تو واقعۃً زمزم کھڑے ہو کر پینا مستحب ہے؟ اس کے آداب میں سے ہے؟ یا صرف جائز ہے؟ تو بعض حضرات علماء اس طرف گئے ہیں کہ زمزم کو کھڑے ہو کر پینا مستحب ہے، چناں چہ احناف میں سے صاحبِ دُرِّ مختار علامہ علاء الدین حصکفی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہی لکھا ہے کہ مستحب ہے۔ لیکن اس کی شرح جو علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے کی ہے، انہوں نے اسی موقع پر تفصیلی بحث کرتے ہوئے یہ ثابت کیا ہے کہ زمزم کا پانی کھڑے ہو کر پینا صرف جائز ہے، مستحب نہیں۔ اور لکھا ہے کہ کم سے کم کراہت ہی ختم ہو جائے، وہی بڑی بات ہے، چہ جائیکہ علامہ حصکفی رحمۃ اللہ علیہ استحباب کو ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ اور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے زمزم جو کھڑے ہو کر نوش فرمایا اس کی وجہ بتلائی ہے کہ حج کے موقع پر جب آپ طواف سے فارغ ہوئے اور زمزم پینے کے لیے تشریف لے گئے تو چوں کہ پانی پلانے کی ذمہ داری حضرت عباس رضی اللہ عنہما -جو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے چچا تھے، ان کی۔ اور ان کے خاندان کی تھی، وہی یہ خدمت انجام دیا کرتے تھے۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اس موقع پر جب مَیں نے حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو زمزم پلایا، تو آپ نے کھڑے ہو کر پیا۔ اس کی وجہ بھی لکھی جاتی ہے کہ وہاں بیٹھنے کے لیے کوئی جگہ ہی نہیں تھی، کنویں سے پانی نکالا جاتا تھا اور پوری

جگہ پانی سے تر رہتی تھی، لوگوں کا مجمع بھی زیادہ تھا،اس وجہ سے بیٹھنے کا موقع نہیں تھا،تو نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کھڑے ہو کر زمزم نوش فرمایا۔

بہر حال! علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ جن کی اسی کتاب سے عام طور پر ہمارے مفتیانِ کرام فتویٰ دیا کرتے ہیں ،اور ہم بھی اسی کتاب کا حوالہ بار بار دیتے ہیں، انہوں نے تو یہی لکھا ہے کہ زمزم کا پانی کھڑے ہو کر پینا صرف جائز ہے،وہ مستحب کے قائل نہیں۔اور مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو ہمارے اکابر میں ہیں ،دارالعلوم دیوبند کے صدر مفتی بھی رہے ہیں، بعد میں پاکستان میں بھی مفتیٔ اعظم رہے،ان کا بھی رجحان یہی تھا کہ زمزم کا پانی کھڑے ہو کر پینا صرف جائز ہے، مستحب نہیں۔اس لیے جو لوگ زمزم کو کھڑے ہو کر پینے کا اہتمام کرتے ہیں کہ بیٹھے ہوئے ہوتے ہیں اور جب زمزم آتا ہے تو کھڑے ہو جاتے ہیں ،اس کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر کھڑے ہیں اور مل گیا تو کھڑے کھڑے پی لیجیے،لیکن بیٹھے ہیں تو خاص کھڑے ہونے کا اہتمام کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

ہاں !جو لوگ اس کو مستحب کہتے ہیں ان کے اعتبار سے کوئی آدمی کھڑے ہو کر پیئے؛ تو گنجائش ہے ۔لیکن اگر کوئی آدمی کھڑے ہو کر نہیں پیتا،تو ہمارے یہاں اس کا اتنا زیادہ رواج ہو گیا ہے کہ سارے لوگ اُسے گھورتے ہیں، جیسے اس نے کوئی بڑا جرم کر دیا ہو؛ یہ طریقہ صحیح

نہیں ہے۔ مَیں نے یہ پوری وضاحت اس لیے کردی تا کہ مسئلہ کی نوعیت معلوم ہوجائے، اور مسئلہ صاف ہوکر سامنے آجائے۔

اور زمزم کو کھڑے ہوکر پینے کی دوسری وجہ یہ بھی بتائی ہے کہ زمزم جتنا زیادہ پیا جائے گا؛ اتنا ہی پسندیدہ ہے، اوراس کی ترغیب بھی دی گئی ہے،اور کم پینا منافق کی علامت بتلایا گیا ہے،اس لیے کھڑے ہوکر پئیں گے تو زیادہ پیا جائے گا۔ بہرحال!زمزم کو کھڑے ہوکر پینے کی اجازت کے اندر کوئی کلام نہیں،

وضو کا بقیہ بھی کھڑے ہوکر پی سکتے ہیں:

اور دوسرا وضو کا بچا ہوا پانی ہے۔ جیسا کہ روایت پیش کی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ کوفہ کے چوک میں وضو کیا۔ پھر فرمایا: مَیں نے نبیؑ کریم ﷺ کو اسی طرح کرتے ہوئے دیکھا جیسا کہ تم نے مجھے کرتے ہوئے دیکھا۔

تو علماء لکھتے ہیں کہ وضو کے بچے ہوئے پانی میں اللہ تعالیٰ نے شفاء رکھی ہے۔ شیخ عبدالغنی نابلوسی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: مَیں جب کبھی بیمار ہوا اور مَیں نے اس کا اہتمام کیا کہ وضو کے بچے ہوئے پانی کو کھڑے ہوکر اس نیت سے پیا کہ اللہ تعالیٰ مجھے شفاء دے؛ تو مجھے شفاء ہو گئی۔

تو یہ دو پانی ہیں: زمزم اور وضو کا بچا ہوا؛ جن کو کھڑے ہو کر پی سکتے ہیں۔

کھڑے ہو کر کھانا پینا؟:

حدیث ۷۶۹:-

وعن ابن عمر رضی اللہ عنھما. قَالَ: کُنَّا عَلَی عھدِ رسول اللہ (ﷺ) نَأْکُلُ وَنَحْنُ نمشِي، وَنَشْرَبُ ونَحْنُ قِیامٌ.

(رواہ الترمذی، وقال: حدیث حسن صحیح)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبیُ کریم (ﷺ) کے زمانہ میں ہم چلتے ہوئے کھالیا کرتے تھے، اور کھڑے ہوئے پی لیا کرتے تھے۔

افادات:- کھڑے ہو کر پینے کے سلسلہ میں تو پوری وضاحت کے ساتھ بتلادیا کہ یہ جائز ہے، لیکن خلافِ اولیٰ ہے۔ اور اگر بیٹھنے کی کوئی مناسب جگہ نہیں ہے تو اس صورت میں اس کو خلافِ اولیٰ بھی نہیں کہیں گے۔

اور دوسری بات اس روایت میں بتلائی کہ چلتے ہوئے کھالیا کرتے تھے تو حضرت اَنس رضی اللہ عنہ کی روایت آگے آنے والی ہے کہ ان سے کھڑے ہو کر کھانے کے متعلق پوچھا گیا تھا تو انہوں نے اس کو برا عمل بتلایا ہے۔

علماء نے لکھا ہے کہ عام طور پر جو کھانا اہتمام کے ساتھ کھایا جاتا ہے کہ اس کے لیے دسترخوان وغیرہ بچھاتے ہیں اور مقررہ اوقات کے کھانے ہوتے ہیں؛ تو وہ تو کھڑے ہو کر کھانے کی اجازت نہیں ہے۔ لیکن کوئی ایسی چیز جس کو کھڑے ہو کر کھانا عیب نہیں سمجھا جاتا،

جیسے چاکلیٹ، دانے چنے، پان وغیرہ؛ کہ آدمی چلتے چلتے کھالیا کرتا ہے؛تو اس کی اجازت ہے۔باقی اپنے مقررہ اوقات کا کھانا، جس کو ہم لنچ اورڈنر، ”غَدَآء“اور”عَشَآء“کہتے ہیں تو وہ چلتے چلتے کھانے کی بالکل اجازت نہیں ہے۔

آج کل ایک نیا سسٹم اور طریقہ بوفے والا چلاہے، شادیوں کے موقع پر ٹیبلوں کے اوپر سب کھانے رکھ دیئے جاتے ہیں ،اورلوگ اپنی پلیٹ میں لے کر کھڑے اورچلتے پھرتے کھالیتے ہیں ؛یہ طریقہ درست نہیں ہے۔

حدیث ۷۷۰:-

وعن عمرو بن شعیب، عن أبیه، عن جَدِّهِ رضی اللہ عنہ قَالَ: رأیتُ رسول الله (ﷺ) یَشْرَبُ قَآئِماً وقَاعِداً. (رواہ الترمذی، وقال: حدیث حسن صحیح)

ترجمہ :- حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا یعنی حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ مَیں نے نبیٔ کریم (ﷺ) کو کھڑے کھڑے بھی اور بیٹھ کر بھی پیتے ہوئے دیکھا۔

حدیث ۷۷۱:-

وعن أنس رضی اللہ عنہ عن النبیِّ (ﷺ) : أنه نَهی أن یَشْرَبَ الرَّجُلُ قَآئِماً قَالَ قتادة: فَقُلْنَا لأَنَسٍ: فالأَکْلُ؟ قَالَ: ذَٰلِكَ أَشَرُّ-أَوْ أَخْبَثُ- (رواہ مسلم)

وفی روایةٍ لَهُ:- أَنَّ النبِیَّ (ﷺ) زَجَرَ عَنِ الشُّرْبِ قائِماً.

ترجمہ:–حضرت اَنس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (ﷺ) نے کھڑے کھڑے پانی پینے سے منع فرمایا۔ اس روایت کو حضرت اَنس رضی اللہ عنہ سے نقل کرنے والے حضرت قتادہؒ جو تابعی ہیں وہ فرماتے ہیں کہ ہم نے حضرت اَنس رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ کھڑے کھڑے کھانے کے متعلق کیافرماتے ہیں ؟توانہوں نے فرمایا: یہ تواورزیادہ براہے(یعنی کھڑے ہوکر تو بالکل کھانا نہیں ہوناچاہیے)

اوردوسری روایت میں ہے کہ آپ (ﷺ) نے کھڑے ہوکرپانی پینے پر تنبیہ فرمائی، اور اس سے منع فرمایا۔

حدیث ۷۷۲:-

وعن أَبِي هريرة رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رسول الله (ﷺ) : لاَ يَشْرَبَنَّ أحَدٌ مِنْكُمْ قَائِماً ، فَمَنْ نَسِيَ فَلْيَسْتَقِئ۔

(رواہ مسلم)

ترجمہ:–حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا:کوئی آدمی کھڑے کھڑے پانی نہ پیئے،اوراگرکسی نے بھول سے کھڑے ہوکرپی لیا تو اس کو قے کردے۔

افادات:–مسئلہ کی تفصیلی وضاحت کرچکاہوں کہ کھڑے کھڑے پینا خلافِ اولیٰ ہے،جس کو مکروہِ تنزیہی کہتے ہیں یعنی ادب کے خلاف ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

استحباب کون ساقی القوم آخرھم شرباً

پلانے والا خود اخیر میں پیئے:

ایک اور ادب بتلارہے ہیں کہ اگر کوئی آدمی پانی یا اور کوئی مشروب دوسروں کو پلارہا ہو، تو ادب یہ ہے کہ خود اخیر میں پیئے۔ آج کل تو لوگ اپنا پہلے ہی نکال لیتے ہیں حالاں کہ ایسا نہیں کرنا چاہیے ، ادب یہ ہے کہ پہلے سب کو پلادو، اخیر میں خود پیو۔

حدیث ۷۷۳:-

عن أَبِي قتادة رضی اللہ عنہ عن النبِيّ (ﷺ) قَالَ: ساقی القوم آخِرُهُمْ شُرْباً . (رواہ الترمذی، وقال: حدیث حسن صحیح)

ترجمہ:- حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ نبی کریم (ﷺ) سے نقل فرماتے ہیں کہ لوگوں کو پلانے والا اخیر میں ہوتا ہے (یعنی اخیر میں پیا کرتا ہے۔)

ایک واقعہ :

افادات:- پہلے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت گزر چکی ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم (ﷺ) نے ان کو راستہ میں پڑا ہوا دیکھا، انہوں نے کئی وقت سے کھانا نہیں کھایا تھا جس کی وجہ سے ایک دم نڈھال تھے حضرت عمر رضی اللہ عنہ وہاں سے گزرے تو انہوں نے ان سے کوئی آیت پوچھی۔ مقصد یہ تھا کہ سوال کے نتیجہ میں میرے حال کا ان کو کچھ پتہ چل جائے گا اور جواب دیتے ہوئے اپنے ساتھ لے جائیں گے اور کچھ کھلا بھی دیں گے، لیکن وہ تو جواب دے کر آگے بڑھ گئے۔ پھر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ گزرے تو ان کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوا۔ پھر نبی کریم (ﷺ) تشریف لائے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: مجھے دیکھ کر سمجھ گئے اور مسکراتے ہوئے فرمایا: ابوہریرہ! میں نے کہا: جی ہاں ۔ فرمایا: چلو۔ اپنے ساتھ لے چلے، آپ (ﷺ) گھر کے اندر تشریف لے گئے تو یہ بھی اجازت لے کر داخل ہوئے۔ گھر والوں سے پوچھا: کچھ ہے؟ بتلایا گیا کہ فلاں جگہ سے ہدیہ میں دودھ آیا ہے۔ آپ (ﷺ) کا معمول تھا کہ کوئی چیز اگر صدقہ کے طور پر آتی تو اس کو اصحابِ صفہ کے پاس بھیج دیا کرتے، اور اگر ہدیہ کے طور پر کچھ آتا تو ان کو بلا لیا کرتے اور خود بھی شریک ہو جاتے۔ جب گھر والوں نے دودھ کا پیالہ دیا تو حضور (ﷺ) نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا: اصحابِ صفہ کو بلا لاؤ۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں اپنے دل میں سوچنے لگا کہ پیالہ میں دودھ ہی کتنا ہے! یہ تو میرے لیے ہی کافی نہیں ہے، اور ان کو

بلانے کے لیے بھیج رہے ہیں، پھر جب میں بلا کر لاؤں گا تو مجھے ہی کہیں گے کہ تقسیم کرو، پھر تو میرے حصے میں کیا بچے گا؟ لیکن جب حضورِ اکرم (ﷺ) کا ارشاد تھا تو اس پر عمل کیے بغیر چارۂ کار بھی نہیں تھا، اس لیے گئے اور بلا کر لائے۔ جب اصحابِ صفہ آکر بیٹھے تو جیسا سوچا تھا اسی کے مطابق حضور (ﷺ) نے فرمایا: ابوہریرہ! سب کو پلاؤ۔ اب وہ باری باری سب کو دے رہے ہیں اور وہ پی کر واپس کررہے ہیں۔ جب سب کو پلا چکے تو آخیر میں انہوں نے وہ پیالہ نبیٔ کریم (ﷺ) کے دستِ مبارک میں دیا، آپ (ﷺ) نے وہ پیالہ اپنے دستِ مبارک میں رکھ کر فرمایا: ابوہریرہ! اب تو میرے اور تمہارے علاوہ کوئی باقی نہیں رہ گیا؟ حضرت ابوہریرہ نے کہا: جی ہاں! اے اللہ کے رسول۔ تو پھر مجھ سے فرمایا: اچھا لو! اور اب تم پیو۔ مَیں نے خوب سیر ہو کر پیا۔ پھر فرمایا: اور پیو۔ میں نے پیا۔ پھر فرمایا: اور پیو۔ میں اور پیا۔ فرمایا: اور پیو، یہاں تک کہ مَیں نے کہا: اے اللہ کے رسول! اب تو اندر جانے کا راستہ نہیں، پھر اخیر میں نبیٔ کریم (ﷺ) نے نوش فرمایا۔ تو یہ بھی آداب میں سے ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

باب جواز الشرب من جميع الأواني الطاهرة غير الذهب والفضة وجواز الكرع -وَهُوَ الشرب بالفم من النهر وغيره بغير إناء ولا يد- وتحريم استعمال إناء الذهب والفضة في الشرب والأكل والطهارة وسائر وجوه الاستعمال

ترجمۃ الباب :

ہر قسم کے پاک برتن میں پینے کا جائز ہونا سوائے سونے اور چاندی کے۔ کوئی بھی برتن ؛ چاہے لکڑی، مٹی، چینی، تانبے، پیتل یا لوہے کا بنا ہوا ہو؛ اس کا استعمال جائز ہے۔ ہاں ! سونے اور چاندی کے برتن میں کوئی چیز کھانے یا پینے کی اجازت نہیں ہے، اس کے علاوہ کوئی برتن اگر پاک ہے تو اس کے اندر کھانے اور پینے کی اجازت ہے۔ ایک بات تو یہ ہوئی۔

دوسری بات یہ بتلاتے ہیں کہ کوئی آدمی پانی میں منھ ڈال کر براہِ راست پیئے۔ ایک طریقہ تو ہے کہ پانی کسی برتن میں لے کر پینا۔ دوسرا طریقہ ہے کہ پانی ہاتھ اور چلُّو میں لے کر پینا۔ اور تیسری شکل یہ ہے کہ پانی کسی نہر یا تالاب اور حوض میں ہے اور اس میں سیدھا منھ ڈال کر

پینا، جیسے: جانور منھ ڈال دیتا ہے، جس کو عربی میں ''کَرْع'' کہتے ہیں ؛یہ بھی جائز ہے، اس طرح بھی پی سکتے ہیں ، نبی کریم (ﷺ) سے اس طرح پینا ثابت ہے۔

اور تیسری بات یہ بتلاتے ہیں کہ کھانے پینے اور طہارت حاصل کرنے اور دوسرے تمام استعمالات میں سونے چاندی کے برتنوں کا حرام ہونا۔یعنی سونے چاندی کے برتن نہ تو کھانے پینے کے لیے ، اور نہ کسی دوسرے مقصد کے لیے استعمال کرسکتے ہیں ، جیسے: استنجاء کا لوٹا بنا کر اس میں پانی بھر کر استعمال کرنا، یا کسی اور کام میں استعمال کرنا، جیسے: سونا چاندی کی سرمہ دانی، قلم وغیرہ؛ تو یہ سب بھی جائز نہیں۔

یہ غلط فہمی نہ رہے:

سونے اور چاندی کے زیور کا استعمال عورت کے لیے جائز ہے ، مرد کے لیے نہیں۔چاندی کی انگوٹھی اگر ساڑھے تین ماشہ سے کم کی ہے؛ تو مرد کے لیے اس کے پہننے کی اجازت ہے، لیکن سونے کی بالکل جائز نہیں۔سونے چاندی کے زیورات کے علاوہ اور کوئی بھی چیز جیسے برتن وغیرہ ہو؛ تو اس کی نہ تو مردوں کے لیے استعمال کی اجازت ہے،نہ عورتوں کے لیے۔عورتوں کو بھی جو اجازت ملی ہے وہ فقط زیورات کی ملی ہے۔اس لیے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ عورتوں کو سونے چاندی کے زیورات کی اجازت ہے تو ان کے لیے دوسری چیزیں برتن وغیرہ کی بھی اجازت ہوگی،عورتیں بھی زیورات کے علاوہ کسی اور استعمال میں نہیں لا سکتیں۔

پتھر کے برتن کا استعمال:

حدیث ۷۷۴:-

وعن أنس رضی اللہ عنہ قَالَ: حَضَرَتِ الصَّلاَةُ، فقامَ مَن كَانَ قَرِيبَ الدَّارِ إِلَى أَهْلِهِ، وبَقِيَ قَوْمٌ، فأُتِيَ رسول الله (صلى الله عليه وسلم) بِمِخْضَبٍ مِنْ حِجَارَةٍ، فَصَغُرَ المخْضَبُ أَنْ يَبْسُطَ فِيهِ كَفَّهُ، فَتَوَضَّأَ القَوْمُ كُلُّهُمْ. قالوا: كَمْ كُنْتُمْ؟ قَالَ: ثَمَانِينَ وزيادة. متفق عَلَيهِ، هذه رواية البخاری.

وفی رواية لَهُ ولمسلم:- أَنَّ النَّبِيَّ (صلى الله عليه وسلم) دَعَا بإِنَاءٍ مِنْ ماءٍ، فَأُتِيَ بقَدَحٍ رَحْرَاحٍ فِيهِ شَيْءٌ مِنْ ماءٍ، فَوَضَعَ أصابعَهُ فِيهِ. قَالَ أنسٌ: فَجعلْتُ أَنْظُرُ إِلَى الماءِ يَنْبُعُ مِنْ بَيْنِ أَصَابِعِهِ، فَحَزَرْتُ مَنْ تَوضَّأَ مَا بَيْنَ السَّبْعِينَ إِلَى الثَّمَانِينَ.

ترجمہ:- حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نماز کا وقت آیا، جن کے مکانات قریب تھے وہ تو اپنے گھروں پر وضو وغیرہ کی ضرورت پوری کرنے کے لیے پہنچ گئے، کچھ لوگ رہ گئے جن کے مکانات قریب نہیں تھے۔ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس پتھر کا ایک برتن لایا گیا جس میں بہت کم پانی تھا، اور وہ برتن اتنا بڑا بھی نہیں تھا کہ کوئی آدمی اس میں سے چلّو بھر سکے۔ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس میں ہاتھ ڈال دیا اور سب لوگوں نے اس پانی سے وضو کیا۔ پوچھا: کتنے آدمی تھے؟ تو بتلایا: اسّی (۸۰) سے کچھ زیادہ آدمی تھے۔

دوسری روایت مسلم شریف میں ہے جس میں یہ ہے کہ: نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے برتن میں پانی منگوایا، تو ایک پیالہ لایا گیا جو زیادہ گہرا نہ تھا (جو برتن گہرا نہ ہو اس کو ”رَحْرَاح“ کہتے ہیں) اس

میں تھوڑاساپانی تھا، نبی ٔکریم (ﷺ) نے اپنی انگلیاں مبارک اس میں رکھ دیں ،توانگلیوں کے اندر سے پانی پھوٹنے لگا،اورستر (۷۰)سے اسّی (۸۰) کے درمیان لوگوں نے اس پانی سے وضوکیا۔

افادات:- گویااس چھوٹے سے برتن میں جوپانی تھانبی ٔکریم (ﷺ) کا یہ معجزہ ہواکہ آپ کی برکت سے اس میں اتنی زیادتی ہوگئی کہ سب نے اس سے وضو کرلیا یہاں توصرف یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ: دیکھو!وہ برتن پتھر کا تھا۔معلوم ہواکہ پتھر کے بنے ہوئے برتن کو بھی استعمال کرسکتے ہیں، بشرطیکہ وہ پاک ہو۔

پیتل کے برتن کااستعمال:

حدیث ۷۷۵:-

وعن عبدالله بن زيد رضی اللہ عنہ قَالَ: أَتَانَا النبيُّ (ﷺ) فَأَخْرَجْنَا لَهُ مَاءً فِي تَوْرٍ مِنْ صُفْرٍ فَتَوَضَّأَ. (رواه البخاري)

ترجمہ :- حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی ٔکریم (ﷺ) ہمارے یہاں تشریف لائے،ہم نے پیتل کے ایک پیالہ میں آپ کے لیے پانی نکالا،تو آپ (ﷺ) نے اس سے وضوفرمایا۔

افادات:- معلوم ہواکہ پیتل کابرتن بھی استعمال کرسکتے ہیں۔البتہ فقہاء فرماتےہیں کہ پیتل یاتانبے کابرتن ہو،خاص کرتانبے کاہو؛تواس کو قلعی کرالینازیادہ مناسب ہے، تاکہ غیروں کی مشابہت لازم نہ آئے۔

نہر میں منھ ڈال کر پینا:

حدیث ۷۷۶:-

وعن جابر رضی اللہ عنہ أنَّ رسول اللہ (ﷺ) دَخَلَ عَلَى رَجُلٍ مِن الأنْصَارِ، وَمَعَهُ صَاحِبٌ لَهُ، فَقَالَ رسول اللہ (ﷺ): إنْ كَانَ عِنْدَكَ مَاءٌ بَاتَ هذِهِ اللَّيْلَةَ فِي شَنَّةٍ وَإلاَّ كَرَعْنَا. (رواہ البخاری)

ترجمہ:- حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم (ﷺ) ایک انصاری صحابی کے یہاں تشریف لے گئے، آپ کے ساتھ آپ کے ایک صحابی بھی تھے۔ آپ نے ان سے پوچھا: اگر تمہارے پاس رات بھر مشکیزہ میں رکھا ہوا پانی ہو تو لاؤ؛ ورنہ تو ہم تمہاری اس چھوٹی سی بہتی ہوئی نہر میں منھ ڈال کر پی لیتے ہیں۔

افادات:- یہ قصہ بخاری شریف اور شمائل میں کچھ تفصیل کے ساتھ موجود ہے، یہاں انہوں نے مختصر کر دیا ہے۔ ایک مرتبہ حضورِ اکرم (ﷺ) کے اوپر بھوک کا تقاضہ تھا، کچھ وقت سے فاقہ تھا، حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا بھی یہی حال تھا، وہ باہر آئے تاکہ نبی کریم (ﷺ) کی زیارت کر کے کچھ تسلی حاصل کریں، حضور (ﷺ) بھی باہر تشریف لائے، حضور (ﷺ) نے فرمایا: چلو! فلاں صحابی کے پاس جائیں۔ ایک انصاری حضرت ابو الہیثم رضی اللہ عنہ کا کھجوروں کا باغ تھا، وہاں پہنچے، ان کی گھر والی سے پوچھا: وہ کہاں ہیں؟ اس نے بتایا: وہ تو پانی لینے کے لیے گئے ہیں، اتنے میں وہ بھی پہنچ گئے، نبی کریم (ﷺ) کو تشریف لایا ہوا دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور بار بار عرض کرنے لگے: اے اللہ کے رسول! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، آپ تشریف لے آئے۔

آپ کو بٹھایا اور جلدی سے بکری کا دودھ دوہا اور پیش کیا۔ کھانے کے لیے بکری ذبح کرنا چاہتے تھے تو نبیٔ کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: جو دودھ دیتی بکری ہو وہ مت کاٹنا۔ اس کے بعد انہوں نے کھجوریں لاکر رکھیں۔ اسی موقع کا یہ قصہ ہے کہ آپ (ﷺ) نے ان سے پوچھا: اگر تمہارے پاس رات بھر مشکیزہ میں رکھا ہوا پانی ہو تو لاؤ۔ اس لیے کہ رات بھر مشکیزہ میں رہا ہوا پانی ٹھنڈا ہوتا ہے۔ ورنہ تو ہم تمہاری اس چھوٹی سی بہتی ہوئی نہر میں منھ ڈال کر پی لیتے ہیں۔ حالاں کہ اس کی نوبت نہیں آئی، لیکن اس سے یہ معلوم ہوا کہ منھ ڈال کر پینا بھی جائز ہے۔ یہاں آپ نے یہ ”کَرَعْنَا“ جو فرمایا کہ ”منھ ڈال کر پی لیتے ہیں“ اسی مناسبت سے اس روایت کو اس باب میں پیش کیا ہے۔

یہ ان کے لیے دنیا میں؛ تمہارے لیے آخرت میں:

حدیث ۷۷۷:-

وعن حذیفة رضی اللہ عنہ **قَالَ: إِنَّ النبیَّ (ﷺ) نَهَانَا عَنِ الحَرِيرِ وَالدِّيباجِ، والشُّربِ في آنِيَةِ الذَّهَبِ والفِضَّةِ، وقال: هِيَ لَهُمْ في الدُّنْيَا، وهِيَ لَكُمْ في الآخِرَةِ.** (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ مع تشریح:- حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ (ایک موقع پر انہوں نے پانی پینے کے لیے منگوایا، تو آپ کا جو خادم اور غلام مجوسی تھا، وہ چاندی کے برتن میں پانی لے کر آیا، تو حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے لے کر اس کے اوپر مارا، لوگوں کو تعجب بھی ہوا، تو حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں

پہلے بھی اس کو منع کرچکاہوں اس کے باوجود اس میں لایا،اس لیے میں نے اس کو مارا،پھر فرمایا:) نبیٔ کریم (ﷺ) نے ہم کو ریشم اوردیباج کے پہننے سے منع فرمایا ہے (دیباج؛موٹے قسم کا ریشم ہوتاہے) اور سونے چاندی کے برتن میں پانی پینے سے بھی منع فرمایا۔اورفرمایا:یہ ان کے لیے (یعنی غیر مسلموں اور کفار کے لیے) دنیامیں ہے (اللہ تعالیٰ نے یہ چیزیں دنیامیں ان کو دی ہیں ،اس لیےوہ استعمال کرلیں) اور تمہارے لیے آخرت میں ہیں۔

جہنم کی آگ اُنڈیل رہاہے:

حدیث ۷۷۸:-

وعن أُمِّ سلمة رضی اللہ عنہا: أنَّ رسول الله (ﷺ) قَالَ : الَّذِی يَشْرَبُ فی آنِيَةِ الفِضَّةِ ،إنَّمَا يُجَرْجِرُ فی بَطْنِهِ نَارَ جَهَنَّمَ. (متفقٌ عَلَيهِ)

وفی رواية لمسلم : إنَّ الَّذِی يَأكُلُ أَوْ يَشْرَبُ فی آنِيَةِ الفِضَّةِ وَالذَّهَبِ.

وفی رواية لَهُ: مَنْ شَرِبَ فی إنَاءٍ مِنْ ذَهَبٍ أَوْ فِضَّةٍ ،فَإنَّمَا يُجَرْجِرُ فی بَطْنِهِ نَارًا مِنْ جَهَنَّمَ.

ترجمہ:–حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبیٔ کریم (ﷺ) نے ارشادفرمایا:جو آدمی چاندی کے برتن میں پانی پیۓ؛گویاوہ اپنے پیٹ میں جہنم کی آگ اُنڈیل رہاہے۔

دوسری روایت میں ہے:جو آدمی چاندی اورسونے کے برتن میں کھاۓ یاپیے۔

ایک اورروایت میں ہے:جو آدمی سونے اورچاندی کے برتن میں پیے، گویا وہ اپنے پیٹ میں جہنم کی آگ اُنڈیل رہاہے۔

افادات:- نبی کریم (ﷺ) نے اتنی سخت وعید ارشاد فرمائی ہے۔اس سے معلوم ہواکہ سونے چاندی کے برتن میں کھانا پینا جائز نہیں ہے،اس کے استعمال سے آدمی اپنے آپ کو بچائے

تمت بالخیر